عہد مغلیہ کی رنگین داستان اور یادگار محبت کی روداد تعمیر

تاج محل

تاج محل

عہد مغلیہ کی سچی داستان اور یادگار محبوب کی روداد تعمیر

امجد جاوید

انتساب!

محمد علی رضا کے نام

جو میرا چھوٹے بھائیوں جیسا دوست ہے

اک شہنشاہ نے بنوا کے حسین تاج محل

ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے

بساط بچھی ہوئی تھی اور مہرے اس انتظار میں تھے کہ چال چلی جائے۔ وہ دونوں کھلاڑی آمنے سامنے جم کر بیٹھے ہوئے تھے۔ان کی نگاہیں بچھی ہوئی بساط پر ایستادہ مہروں پر تھیں۔ وہ دونوں ہی نوعمر تھے۔نوعمری کی من پسندی دلچسپیوں میں بلا کی شدت ہوا کرتی ہے،سو چال چلنے کے ساتھ ہی گھمسان کا رن پڑنے والا تھا۔ یہ دنیا بھی تو ایک بساط کی مانند ہے اور یہاں پر بسنے والے کسی انسان کی حیثیت مہرے جیسی ہوتی ہے۔کوئی کھلاڑی ہوتا ہے اور کوئی محض تماشائی۔ مات اور کامیابی کی اس کشمکش میں بعض اوقات مہرے بھی علم نہیں رکھتے کہ وہ کس کی چال کی زد میں ہیں۔ کتاب قسمت میں کس کے لیے کیا لکھا ہے کسی کو پتہ نہیں ہوتا لیکن ہر کوئی کامیابی کی نوید کے لیے اس جہان کارزار میں اپنی پوری صلاحیتوں سے جوہر دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔اب اسے کامیابی ملتی ہے یا ناکامی، یہ بھی اس کا نصیب ہے......وہ دونوں نوعمر کھلاڑی بھی اپنی اپنی قسمت میں زمین و آسمان جیسا فرق رکھتے تھے،ایک منظور نظر شہزادہ اور دوسرا خدمت گار خاص۔

صبح کا پہلا پہر ڈھل چکا تھا۔ وہ دونوں آگرہ میں شہزادے کے محل میں موجود کمرہ خاص میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دریائے جمنا کی طرف سے آنے والی ہوا میں خوشگواریت گھلی ہوئی تھی۔نرم ہوا کے جھونکے،حریری پردوں سے اٹکھلیاں کرتے ہوئے لطافت کا بھرپور احساس دے رہے تھے۔ بیش قیمت ایرانی قالین، مرصع نشستیں،عود و عنبر کی سحر انگیز مہک، منقش ساز و سامان،شیشہ گری و فن نقش و نگاری کی نفاست سے مزین در و دیوار،طلائی ظروف کے علاوہ شاہی وقار و جلال اور ہندوستان پر حکومت کرنے کا زعم اس ماحول میں رچا بسا ہوا تھا۔ رضا نامی وہ خدمت گار خاص،محض اس لیے شہزادے کا قرب رکھتا تھا کہ وہ بچپن ہی سے اس کا ہم نشین تھا۔ایک ایسا زندہ کھلونا جو شہزادے کو عنایت کر دیا گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شعوری تقاضوں کی وجہ سے دلچسپیوں کی نوعیت بدل گئی تھی۔ رضا ہی اس کا شریک راز اور جاں نثار قرار پایا تھا۔

اور وہ شہزادہ! شہزادہ خرم کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔لیکن اب وہ شہزادہ ولی عہد سلطنت جیسی حیثیت اختیار کر کے شہنشاہ ہندوستان ابوالمظفر نورالدین جہانگیر کی سلطنت کا وارث ہونے کا اہل قرار پایا تھا۔جبکہ اس وقت اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔

مرصع ومنعقش مسند پر بیٹھے ہوئے شہزادہ خرم اور خدمت گار رضا، دونوں ہی خاموش تھے۔درمیان میں بچھی ہوئی بساط پر دھرے مہرے چال کے لیے منتظر تھے مگر دونوں میں سے کسی نے بھی ان مہروں کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔کتنا سارا وقت یونہی گذر گیا۔تبھی رضا نے بے چینی سے شہزادہ خرم کے چہرے کی طرف دیکھا، جہاں الجھنوں کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ چند لمحوں تک مضطرب رہا اور پھر انتہائی ادب سے بولا۔

''شہزادہ معظم! کھیل کی شروعات کیجئے، چال چلیئے۔''

اس پر شہزادہ خرم نے یوں سر اٹھایا کہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونک گیا ہو۔اس نے رضا کی طرف اچٹتی نگاہ سے دیکھا اور پھر لمحوں میں خود پر قابو پالیا۔اس کے چہرے پر سے گہری سنجیدگی کا غلاف اتر گیا اور وہاں پر نرم اور دھیمی مسکراہٹ در آئی تھی۔وہ قدرے پیچھے کی طرف ہٹا اور اکتاہٹ سے بولا۔

''آج کھیل میں دل نہیں لگے گا۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا اور پھر بولا، ''آؤ باتیں کرتے ہیں۔''

''شہزادہ معظم! کوئی پریشانی ہے کیا؟'' رضا نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''نہیں۔!'' وہ سختی سے تردید کرتے ہوئے بولا ''بس یونہی آوارہ سوچوں نے میری توجہ کو منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔''

''بتایئے تو سہی کہ وہ کیسی آوارہ سوچیں ہیں، جنہوں نے آپ جیسے مضبوط اعصاب شہزادے کی توجہ میں اضطراب پیدا کر دیا ہے۔'' رضا نے کسی غیر متوقع خطرے کا احساس کرتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

شہزادہ یوں خاموش رہا جیسے وہ اپنے خیالوں میں آباد دنیا میں پہنچ گیا ہو۔رضا گہری نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔سوال کے جواب میں خاموشی پا کر وہ پھر بولا۔ ''کیا سلطنت کے امور ہیں؟''

''نہیں۔'' شہزادے نے چونکتے ہوئے تیزی سے کہا۔پھر رضا کی طرف نرم انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آج رات شاہی مینا بازار منعقد ہوگا اور مجھے وہاں آنے کی دعوت خاص دی گئی ہے۔'' خرم نے بکھرے ہوئے لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔رضا مسکرا دیا اور لطافت بھرے لہجے میں بولا۔

''شہزادہ معظم! اس میں ایسی پریشانی کی بات کیا ہے جس نے آپ کی توجہ منتشر کر کے رکھ دی ہے۔ کیا آپ پہلے شاہی مینا بازار میں نہیں گئے۔؟''

''میری حیثیت اور میرا مرتبہ بڑھ گیا ہے۔ اس بار مجھے ایک شہزادے کے طور پر نہیں، متوقع ولی عہد سلطنت کی حیثیت سے مدعو کیا گیا ہے۔ مجھے بھی اپنے باپ شہنشاہ ہند کی طرح شاہی وقار کے ساتھ خلعت فاخرہ پہن کر جانا ہوگا۔ شاہی مینا بازار میں بے شمار نگاہیں مجھے اپنے حصار میں لینے کے لیے منتظر ہوں گی۔ ان میں پہلی نگاہ تو میرے باپ کی ہوگی جو مملکت ہندوستان کا بادشاہ ہے۔ پھر وہ عمائدین سلطنت جن کے سامنے میں ایک مثال کی مانند ہوں۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے مجھے میرے تینوں بھائیوں میں سے اس عظیم الشان سلطنت کا وارث ہونے کا اہل قرار دیا ہے۔ مجھے اس قابل سمجھا گیا ہے کہ میں حاکمیت اور طاقت کا عصائے شاہی تھام سکتا ہوں۔''

''یہ تو حقیقت ہے کہ شہزادہ معظم کہ شہزادہ خسرو کی بغاوت کے باعث شہنشاہ ہند نے آپ کو مجلس نیابت کا سربراہ مقرر کر کے آپ کی صلاحیتوں پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ ایسا اعتماد عالی شان شہزادوں پر ہی کیا جاتا ہے۔ مگر میں اب تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ اس سے آپ کی توجہ کیوں منتشر ہو رہی ہے؟'' رضا ہنوز متجسس تھا۔ اس کے لہجے میں سے پریشانی ہویدا تھی۔ اس پر خرم ذرا سا مسکرایا اور دھیرے سے بولا۔

''میں شاہی مینا بازار میں جاتا تو رہا ہوں لیکن کبھی بھی وہاں سے حقیقی لطف نہیں اٹھا سکا۔''

''وہ کیسے؟'' رضا نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

خرم کچھ بتانے میں قدرے متامل ہوا۔ شہزادے کو پوری طرح یقین تھا کہ اس میں بے پناہ حسن پرستی موجود ہے۔ وہ کسی بھی شے کے حسین پہلو سے متاثر ہوئے بناء نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے یہ اعتراف تھا کہ یہ شاہی مینا بازار اپنے اندر حسن، رنگینیاں اور ایسا انبساط رکھتا ہے کہ جس سے سرشاری کی انتہائی کیفیت اسے بے چین کر دیتی ہے۔ اسے یہ حسرت بھی تھی کہ باوجود شدید خواہش کے، وہ وہاں سے کوئی شے خرید نہیں سکا تھا۔ اسے خریداری کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ عام بازاروں سے خریداری شاہی وقار کے شایان شان نہیں تھی۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کی ضرورت کے لیے ان کے اپنے کارخانے موجود تھے۔ وزراء، عمائدین سلطنت اور امراء نے بھی طریقۂ بادشاہ کو اپنایا ہوا تھا۔ انہیں بھی دوکانداری اور خریداری کے طور طریقوں کا علم نہیں تھا۔ یوں شہزادہ خرم وہاں جا کر فقط حسین چہرے دیکھ کر ہی لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔

شاہی مینا بازار کی شروعات مغلیہ سلطنت کے عظیم فرماں رواں، جنت آشیانی بادشاہ ہمایوں نے کی تھی۔ یہ ایک خوشگوار خیال تھا کہ قلعے اور شاہی محل میں مصنوعی بازار لگایا جائے۔ اس میں امراء اور ان کے حرم کی خواتین بے نقاب آئیں۔ وہ ہی دوکانیں سجائیں اور وہ ہی خریدار بنیں۔ اس کے علاوہ سلطنت کے چنیدہ مرد حضرات وہاں خریداری کے لیے آئیں۔ اس پر شاہی فرمان جاری ہو گیا۔ حرم کی الجھی ہوئی زندگی سے بیزار خواتین ایک رات کے لیے بے حجابانہ نکل آتی تھیں۔ امیر زادیاں، ان عارضی دوکانوں پر اپنی پسند کا سامان فروخت کے لیے رکھ کر دوکاندار بن جاتیں۔ جو ایسا نہ کرتیں وہ گاہک بن جاتیں۔ بھاؤ تاؤ ہوتا، اشیاء کے دام لگتے، گاہک اور دوکاندار میں جھگڑا بھی ہو جاتا۔ یوں ایک حسین رات گذر جاتی۔ خوب رو لڑکیوں کی مائیں اس کوشش میں ہوتیں کہ شہنشاہ یا کسی شہزادے کی نگاہ میں ان کی بیٹی آ جائے۔ ان میں راہ و رسم پیدا ہو اور پھر یہی تعلق رشتے میں تبدیل ہو جائے۔ اس بازار میں انتہائی کشش کا پہلو یہ بھی تھا کہ حرم میں چھپی خواتین بے حجاب ہوتیں تو امرائے سلطنت بھی انہیں دیکھ پاتے۔ یوں دلچسپیوں، لطافتوں اور خوشگواریت کی مسرتوں سے لبریز رات بیت جاتی اور اس کی بازگشت سالوں تک سنائی دیتی رہتی۔ شاہی مینا بازار کا انتظار سارا سال کیا جاتا تھا۔

''حضور! کس سوچ میں کھو گئے ہیں آپ؟'' رضا نے ملائمیت ملے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا تو شہزادہ بھی چونک گیا۔ وہ آنکھوں سمیت مسکرا دیا اور پھر خوشگوار لہجے میں بولا۔

''خریداری میں ناتجربہ کاری میرے لیے اتنی حسرت انگیز نہیں ہے بلکہ اصل میں جو بات میری توجہ کے لیے انتشار کا باعث بنی ہوئی ہے وہ اور ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے مسند پر پہلو بدلا اور سوچنے والے انداز میں چند لمحے خاموش رہا۔ اس دوران اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک در آئی تھی۔ تب وہ خوش اندازی سے لب کشا ہوا۔

''چند دن سے ایک عجیب سا خیال میری سوچوں سے الجھ رہا ہے۔ میرے خیال اور سوچوں کی اس کشمکش سے میری نگاہیں ایسی خواب ناک صورت حال بنا دیتے ہیں کہ میں الجھ سا جاتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں ایک وسیع ریگ زار میں کھڑا ہوں، جہاں تاحد نگاہ کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ سورج اپنی پوری تابناکی سے حدت برسا رہا ہے اور میں شدتِ پیاس سے بے حال، کسی نخلستان کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ اچانک میں کافی فاصلے پر ایک نخلستان دیکھتا ہوں۔ میں اس جانب دیوانہ وار بڑھتا ہوں، تو میری راہ میں خارزار جھاڑیاں آ جاتی ہیں۔ پھر ایک طوفان نما بگولا سارے منظر پر چھا جاتا ہے۔ مگر میں آگے ہی آگے بڑھتا رہتا ہوں۔ یہاں تک کہ جھاڑیوں اور طوفان کے حصار سے نکل کر اس نخلستان تک

پہنچ جاتا ہوں۔ وہاں پہنچ کر نخلستان کی خوشگوار ٹھنڈک کے ساتھ عجیب بے سکون حدت بھی موجود ہوتی ہے۔ تبھی اچانک فرحت بخش ہوائیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ میں اطمینان سے آنکھیں بند کرتا ہوں تو نخلستان غائب ہو جاتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ چند لمحے رکا اور انتہائی لاپرواہی سے الجھتے ہوئے بولا۔ ''پتہ نہیں ایسا کیوں ہے؟''

''اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے۔ خیال بھی تو خوابوں کی مانند ہوتے ہیں۔ آپ شاہی جوتشی کو بلوائیں اور اس سے دریافت کریں۔'' رضا نے بے تابانہ کہا تو شہزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ کوئی خواب تھوڑی ہے کہ جس کی تعبیر کے لیے شاہی جوتشی کو بلوایا جائے۔''

''مگر۔! خواب جیسا تو ہے نا...... یا پھر کم از کم وہ اس حوالے سے کوئی پیشین گوئی ہی کر دے گا جس سے اس خواب ناک کیفیت کو سمجھنے سے متعلق کوئی نہ کوئی اشارہ مل جائے گا۔'' رضا نے اپنے لہجے کو پرسکون رکھتے ہوئے زور دے کر کہا تو خرم بھی سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحے اس انداز میں گذر گئے۔ تب اس نے کافی فاصلے پر کھڑے مودب خادم کو اشارے سے بلوایا۔ وہ انتہائی ادب سے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تو شہزادے نے حکم دیا۔

''شاہی جوتشی کو حاضر کیا جائے۔''

حکم پر سر جھکاتے ہوئے وہ خادم تیزی سے مڑا اور چلا گیا۔ تبھی شہزادے نے بساط کی طرف توجہ کی اور ایک مہرے کو اٹھا کر چال چل دی۔

———✱———

وہ اس قدر اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اسے اپنے گھر میں ہونے والی غیر معمولی سرگرمیوں کا احساس ہی نہیں تھا۔ دن کا پہلا پہر گذر چکا تھا اور وہ ہنوز ابھی تک اپنے کمرے میں تھی۔ اگر چہ ان کے گھر میں معمولات کا آغاز صبح صادق ہی سے ہو جاتا تھا۔ پھر آدھے دن تک خواتین نہانے دھونے اور اپنی زیب و زینت میں گذار دیتی تھیں۔

مگر وہ دن اس کے لیے غیر معمولی تھا۔

اس کے لیے صبح کا آغاز معمول کے مطابق نہیں ہوا تھا۔ اس نے ایک بھیانک آواز سنی تھی جس کے خوف سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ بہت بدحواس تھی۔ چند لمحوں تک اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دیا تھا۔ وہ ساکت آنکھوں سے کھڑکی کے باہر ملجگا اندھیرا دیکھتی رہی۔ اسے احساس تو تھا کہ وہ اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی ہے لیکن کہاں ہے، کیوں ہے اور کیسے ہے اس کا یقین نہیں آرہا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں اسے عالم حواس میں لاتی چلی گئیں۔ چڑیوں کا شور اور کوؤں کی کائیں کائیں اسے شعور میں لے آئیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، وہ بالکل صاف تھا۔ اندھیرا ختم ہو رہا تھا اور نیلگوں آسمان اپنا رنگ نکھار رہا تھا۔ دور افق میں سورج طلوع ہونے کے آثار روشن تھے۔ وہ اٹھ کر کھڑکی میں آگئی جہاں نسیم صبح نے اسے خمار آلود کر دیا تھا۔ مدہم سی روشنی میں آم، پیپل اور نیم کے درخت واضح دکھائی دے رہے تھے۔ تب اسے یقین ہو گیا کہ وہ خواب دیکھ رہی تھی اور وہ بھیانک آواز اس نے عالم خواب ہی میں سنی تھی۔

اس نے اپنے خواب کو پوری تفصیل کے ساتھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر ٹوٹے ہوئے چند مناظر کے علاوہ اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ خواب کے دہرانے سے جو چند ٹوٹے ہوئے منظر اس کے ہاتھ لگے تھے وہی اس کے لیے خوش گمانیوں کے تحفے رکھتے تھے۔ وہ ان پر جس قدر سوچ رہی تھی اس قدر اس کے من میں پر جوش کیفیات امنڈتی چلی آرہی تھیں۔ اس کی سانسیں اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

وہ خواب اس کے لیے حیرت انگیز تھا۔اس نے وہی خواب پھر سے دہرانے کی کوشش کی لیکن پھر وہی ٹوٹے ہوئے منظر ہی پھٹی ہوئی تصویر کی طرح اس کے سامنے تھے۔اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ ایک حسین باغ میں تنہا بیٹھی ہوئی ہے۔ باغ اتنا سرسبز تھا کہ ہر شے سے تازگی پھوٹ رہی تھی۔تبھی آسمان سے اتری ہوئی طلائی رنگ کی روشنی نے پورے باغ کو روشن کر کے رکھ دیا۔ایک جگہ بہت زیادہ روشنی تھی۔اس نے غور سے دیکھا وہ طلائی میز تھا۔اتنے میں مدہر موسیقی پھیلتی چلی گئی۔کتنی ساری پریاں اس میز کے پاس آئیں اورانہوں نے وہاں پر کچھ رکھ دیا۔وہ کیا شے تھی؟ وہ پہچان نہیں پائی۔کیونکہ اس میں سے ہلکے قرمزی رنگ کی تیز شعاعیں پھوٹ رہی تھیں جس سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔وہ ابھی متجسس تھی کہ وہ کیا ہے؟ اتنے میں ایک بھیانک آواز ابھری اوراس کی آنکھ کھل گئی۔بھیانک آواز اور وہ شے جس سے تیز روشنی پھوٹ رہی تھی۔کیاان کا کوئی آپس میں تعلق ہے؟ کیااس خواب میں اس کے لیے کوئی پیغام چھپا ہوا ہے؟اس سپنے کی تعبیر کیا ہوسکتی ہے؟

دولت......! خوشی......! یا محبت؟

اس خیال کے ساتھ ہی خواب پس منظر میں چلا گیا اوراس سے یہ تجسس لپٹ گیا کہ خواب میں دکھائی دینے والی وہ کیا شے تھی؟ اس کی تعبیر کیا ہوسکتی ہے؟ وہ خود کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی بس ایک خوشگوار کیفیت ان کے من میں در آئی تھی جس سے وہ یہی گمان کرسکتی تھی کہ یہ سپنا اس کے لیے اچھا ہی ہوگا۔اصل تعبیر کے لیے تو کسی ماہر خواب ہی سے رجوع کیا جا سکتا تھا۔وہی صحیح رہنمائی کرسکتا تھا مگر ایسا فوری طور پر ہو جانا ممکن نہیں تھا۔اسے انتظار کرنا تھا اور انتظار کے معاملے میں وہ بڑی سخت جاں واقع ہوئی تھی۔اسے اپنی صلاحیت پر اعتماد تھا کہ وہ برداشت کرسکتی ہے۔وہ سپنا اس کے لیے خوشگواریت لایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس خواب کی خود سے نئی نئی تعبیریں تراشنے میں لطف لے سکتی تھی۔

وہ ابھی خواب کے حصار میں ہی تھی اور شاید نئی نئی تعبیریں اس کے ذہن میں آ بھی جاتیں مگر گلیوں میں پھرنے والے سوداگر کی ہانک نے اس کی توجہ منتشر کر دی۔تبھی ایک بیل گاڑی کے پہیوں کی چڑ چڑاہٹ گلی کی نکڑ سے ابھری وہ اسے دیکھتی رہی،اسی اثناء میں ایک بچے کی مدھر آواز ابھری وہ کوئی گیت گا رہا تھا۔اس کی آواز صاف اور میٹھی تھی۔وہ انہیں دیکھ رہی تھی کہ قدرے فاصلے پر سے قلعہ آگرہ میں شہنشاہ جہانگیر کے محل میں موجود جھروکہ درشن سے شاہی نقارہ بجنے کی آواز ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی اس کے پاس آن پہنچی۔

’’دن کا آغاز ہوگیا‘‘

وہ یہی سوچتی ہوئی واپس پلٹ کر اپنے بستر پر آ لیٹی۔

ایسا روزانہ ہی ہوتا تھا طلوع صبح سے ایک گھڑی پہلے شاہی محل میں شاہی نقارہ بج اٹھتا۔ اور پھر کتنی ہی دیر تک بجتا رہتا۔ یہ اس امر کا اعلان ہوتا کہ شہنشاہ جھروکہ درشن میں جلوہ افروز ہونے کو ہیں۔ جب تک شہنشاہ، وہاں نہ آ جاتا، شاہی نقارہ بجتا رہتا۔ وہ لال قلعہ سے عوام اور خواص کو اپنا درشن دیا کرتا تھا۔ اس درشن کا صرف یہی مقصد تھا کہ شہنشاہ ہند زندہ و سلامت ہیں اور ان کی سلطنت محفوظ ہے۔ یہ ایک رسم تھی جو ماقبل مغل شہنشاہوں نے شروع کی تھی۔ لیکن اس رسم کی سیاسی اہمیت کے علاوہ عوام وخواص میں ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو گیا تھا جنہیں ''درشنی'' کہا جاتا تھا۔ وہ اپنے معمولات زندگی کا آغاز شہنشاہ کا درشن کر کے ہی کیا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ اپنے وجود کو اپنی حاکمیت کی تجدید ثابت کرنے کے لیے پیش کیا کرتا تھا۔ شاہی نقارہ بند ہوتے ہی اس نے اپنے تصور میں دیکھا۔ شہنشاہ بڑے کروفر سے اپنے نقرئی تخت پر بیٹھا ہے اور اس کی نگاہ اپنی پوری سلطنت کو حصار میں لیے ہوئے ہے۔ وہ جانتی تھی کہ شہنشاہ ہند کتنی بڑی مملکت کا مالک ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا تھا کہ مشرقی سرحد سے اگر کوئی اونٹوں کا قافلہ چلتا تو مغربی سرحد تک رسائی کرنے کے لیے اسے ساٹھ ستر دن درکار ہوا کرتے تھے۔ یہ مملکت ایران اور بنگال کے درمیان تھی جبکہ شمال میں کوہ ہمالیہ اور جنوب میں دکن کے مضافات تک تھی۔ اس عظیم سلطنت کا دل آگرہ شہر تھا جو اس کا پایہ تخت اور دارالحکومت تھا۔ اس لیے آگرہ کو مرکز کی سی حیثیت حاصل تھی۔

شاہی نقارہ بجنے سے اکثر گھرانوں میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ دن کے امور کا وقت آغاز ہے۔ عوام میں عموماً مگر خواص کے گھریلو امور کے آغاز کا وقت تو وہی ہوتا تھا۔ ان کے گھر میں بھی ہمیشہ ایک ہی طرز پر بجنے والی مانوس آواز سے ہی گھریلو کام کاج کا آغاز ہوتا تھا۔ اک شور سا اٹھتا تھا اور پھر گھر کے افراد کی آوازیں ماحول میں زندگی بھر دیتی تھیں۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں ایسے ہی ہوتے سنا اور دیکھا تھا۔ باورچی خانے میں غلام آگ جلا کر مصروف ہو جاتے، جھاڑ و پھیرنے کی آواز ابھرتی۔ اس کے کمرے سے نچلی منزل پر مرد ملازمین کی پہلے دبی دبی اور پھر پر جوش آوازیں آتیں۔ اس دن بھی وہ سب سنتی رہی اور پھر اسے اونگھ آ گئی۔

دن کے پہلے پہر وہ پھر سے اپنے خوشگوار خواب کے ٹوٹے ہوئے منظروں کو جوڑ کر نئی سے نئی تعبیر تراش رہی تھی۔ اسے خیال تک نہیں تھا کہ گھر میں معمول کے مطابق سرگرمی نہیں بلکہ اس میں پر جوش ہیجان پایا جا رہا ہے۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اس کے کمرے میں خادمہ آ گئی۔

''حضور۔! آپ کو بڑی بیگم صاحبہ یاد کر رہی ہیں؟''

وہ خاموش رہی لیکن نگاہوں سے بات سننے کا عندیہ دے دیا۔ خادمہ ہلکا سا جھکی اور واپس مڑ گئی۔

وہ جب بڑے کمرے میں پہنچی تو وہاں کا سماں ہی کچھ اور تھا۔ اس کی ماں دیوان جی بیگم ایک مسند پر، جبکہ دوسری طرف اس کی پھوپھی مہر النساء اور دادی عصمت بیگم بیٹھی ہوئیں تھیں۔ ماحول میں خاصی بدحواسی اور تیزی موجود تھی۔ وہ مختلف غلاموں نوکروں اور کنیزوں کو حکم دے رہی تھیں۔ ان کے احکام میں جوش بھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ماں کے پاس مسند پر بیٹھتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کی پھوپھی مہر النساء کچھ زیادہ ہی سرگرم ہے۔ اس طرح حرم کی دیگر خواتین اور بیگمات بھی مصروف اور پر جوش تھیں۔ ملازمین، غلام اور کنیزیں چیزیں اٹھا کر لے جا رہے تھے اور لا بھی رہے تھے۔ ان میں سلک کے تھان، سونے چاندی کے زیورات، قیمتی پتھر، ہیرے اور جواہرات والے ہاتھی دانت کے صندوقچے تھے۔ تبھی اسے یاد آیا کہ آنے والی رات میں شاہی مینا بازار منعقد ہونے والا ہے۔ بہار کے آخر میں شاہی خواتین، امراء اور عمائدین سلطنت کی بیگمات اور عزیز داروں میں یہی ایک پر لطف، یادگار اور زبردست تفریح ہوا کرتی تھی۔ یہ ساری تیاریاں اسی مینا بازار کے لیے تھیں۔

''ارجمند۔! کیا تم تیار نہیں ہوئی ہو؟'' اس کی ماں دیوان جی بیگم نے اس پر ممتا بھری نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیا میں نے بھی جانا ہے؟'' اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔ وہ پہلے کبھی شاہی مینا بازار میں نہیں گئی تھی۔ اس لیے اس کی پھوپھی مہر النساء نے اس کے بدن کا گہرائی سے جائزہ لیا پھر قدرے مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیوں نہیں۔ اب تو تم کافی بڑی ہو چکی ہو۔ تم اس قابل ہو چکی ہو کہ کسی کی بھی توجہ کا مرکز بن سکتی ہو۔ کوئی بھی تمہیں شادی کے لیے منتخب کر سکتا ہے۔''

۱۰۱۵ ہجری میں ارجمند کی عمر چودہ سال تھی۔ عنفوان شباب میں یہی عمر شادی کے لیے موزوں ترین عمر تسلیم کی جاتی تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ارجمند مزاجاً گوشہ نشین اور اپنے ہی خیالوں میں کھوئے رہنے والی لڑکی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت مطالعہ میں گذرتا۔ اس کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ قرآن پاک کا ترجمہ و تفسیر، تاریخ و موسیقی اور تصویر سازی کی مروجہ اعلیٰ تعلیم سے اسے نوازا گیا۔ یہ تعلیم اس قدر تھی کہ ایک معزز گھرانے کی عزت مآب خاتون کے لیے بہترین سمجھی جاتی تھی۔ وہ ایک اعلیٰ خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ اس کا پردادا خواجہ محمد شریف ایران کے صوبے خراسان کے حکمران

بیگلار بیگ کا وزیر تھا۔ اس کا دادا اعتماد الدولہ مرزا غیاث بیگ عہد اکبری میں ''دیوان بیوتات'' اور عہد جہانگیری میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے والا تھا۔ اس کا باپ آصف خاں مرزا ابوالحسن، بھی جہانگیر کی سلطنت میں کلیدی عہدے پر فائز تھا۔ اس کی ماں دیوان جی بیگم خواجہ غیاث الدین علی قزوینی کی بیٹی تھی۔ خواجہ غیاث الدین علی اکبر کے عہد میں بخشی گری کے باوقار عہدے پر فائز تھا اور اکبر کے قریبی لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی دادی عصمت بیگم کمال درجہ کی ہنرمند اور باشعور خاتون تھی۔ اس کے دو چچا اعتقاد خاں اور ابراہیم خاں سلطنت مغلیہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو غیر معمولی طور پر ذہین تھا۔ اگرچہ وہ شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھی لیکن اس کا رشتہ کسی معیاری دولت منداور اعلیٰ خاندان ہی میں طے ہونا تھا۔ ارجمند اپنے خاندان میں اپنے حسن، ذہانت اور باشعور ہونے کی وجہ سے خوشبو کی طرح محسوس کی جاتی تھی۔ تاہم وہ ایک عام سی لڑکی کی طرح تھی اور اس کے رومانوی خواب بھی عام سی لڑکیوں کی طرح تھے۔

''کیا میں وہاں پر ویسے ہی جاؤں گی یا کچھ فروخت بھی کروں گی؟'' ارجمند نے اپنی پھوپھی مہرالنساء کا تبصرہ نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''اگر تم چاہو تو وہاں پر دوکان دار بھی بن سکتی ہو؟'' اس کی ماں نے جواب دیا۔

''میں کیا بیچوں گی؟'' اس نے سوال کرنے سے زیادہ پرخیال انداز میں سوچا۔ لہجے میں قدرے مایوسی تھی۔

''تم جو چاہو وہاں پر بیچنے کے لیے رکھ سکتی ہو۔ مثلاً پھل، مصالحہ جات، منقش چیزیں......مگر یہ اتنی اہم نہیں ہیں۔'' مہرالنساء نے ایک بار پھر سے کچھ ایسے عجیب لہجے میں کہا جیسے اس کی بات میں کچھ اور طرح کے معنی پوشیدہ ہوں۔ یہ ایک ایسا لہجہ تھا جس میں مکاری چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ پھر اچانک اس نے اپنا انداز بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی دوکان پر رکھنے کے لیے ایسی اشیاء کا انتخاب کر سکتی ہو جس سے معزز شرفاء، شہزادے اور یہاں تک کہ خود شہنشاہ بھی متوجہ ہو سکیں۔''

''پھوپھی جی۔! آپ وہاں پر کیا فروخت کر رہی ہیں؟'' ارجمند نے اپنا رخ اس کی طرف موڑتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔

''میں......!'' اس نے بھنویں اچکاتے ہوئے پرخیال انداز میں کہا جیسے وہ ابھی کسی بھی فیصلے سے مطمئن نہ ہوئی ہو۔ پھر لمحہ بھر ٹھہر کر بولی۔ ''میں سونے کے زیورات اور ریشم کے وہ کڑھائی والے پارچے وہاں فروخت کے لیے رکھوں گی جن پر کڑھائی کے نمونے خود میری اپنی ذہنی اختراع ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سامنے دھرے ہوئے ایک ہاتھی دانت

کے صندوقچے میں ہاتھ ڈالا اور اس سے جڑاؤ کنگن اور زمرد، ہیرے، نیلم اور یاقوت جڑی انگوٹھیاں نکالیں۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے انہیں لاپرواہی سے واپس صندوقچے میں پھینک دیا۔اس نے قدرے بے چینی سے اس خزانے کو دیکھا تھا۔

''آپ کے خیال میں اتنا سا زیور کافی ہوگا؟......کیا یہ بہترین ہیں؟''ارجمند نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جہاں پریشانی کے سائے لہرا رہے تھے۔

تب مہرالنساء نے کوئی جواب نہیں دیا بس الجھے ہوئے انداز میں کاندھے اچکا دیئے۔ پھر بڑی بھرپور نگاہ سے اس کی جانب دیکھا۔اس کی آنکھوں میں سے فکر جھلک رہی تھی مگر اس کا انداز بڑا ہی رازدارانہ تھا۔

''چلو ارجمند۔!تم تیار ہو جاؤ۔محل کی طرف کوچ کرنے کے لیے ہمارے پاس تھوڑا سا وقت ہی ہے''اس کی ماں نے کہا تو وہ بادنخواستہ اٹھ گئی۔اس کے ذہن میں مہرالنساء کا عجیب سا رویہ ٹھوکریں مار رہا تھا۔

مہرالنساء بہت زیادہ حسین ہونے کے باوجود ایک ناقابل برداشت عورت تھی۔وہ ذہنی طور پر حاکمیت پسند تھی۔وہ لوگ جو اس کی خواہشات کے سامنے جھکتے نہیں تھے مہرالنساء ان پر ہر طرح کا حربہ استعمال کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھی۔اسے بس اپنا مقصد چاہیے ہوتا تھا۔اس معاملے میں اس کا خاوند شیر افگن بھی نہیں بچا ہوا تھا۔حالانکہ وہ میدان جنگ کا شہسوار تھا۔اس کی بہادری شک وشبے سے بالاتر تھی۔مگر جب مہرالنساء ہوتی تو وہ خاموش رہا کرتا تھا۔وہ ہر کسی کو اپنے سحر میں جکڑ لینے کی خواہش مند رہتی تھی۔اگر اس میں یہ صلاحیت ہوتی کہ وہ آسمان سے چانداور ستارے توڑ کر لاسکتی ہوتی تو وہ انہیں وہاں سے لاکر اپنے قیمتی دھاتوں،قیمتی پتھروں اور ریشم کی نرم چادروں والے خزانے میں لا رکھتی۔وہ مہم جو،مشکل پسند اور دوسروں کو اپنا مطیع رکھنے کی فطرت رکھتی تھی۔

''ارجمند۔! یہ ذہن میں رکھنا کہ وہاں لوگ محض خریداری کے لیے نہیں آئیں گے، بلکہ ہمارے حسن کا نظارہ بھی کریں گے۔اس لیے تیار ہوتے وقت ذرا اہتمام کر لینا۔''مہرالنساء نے اس وقت کہا جب وہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھا چکی تھی۔وہ اس کی بات سن کر رک گئی اور دبے دبے اشتعال سے کہا۔

''پھوپھو۔!کیا یہ اس اجازت کا خراج ہے کہ ہم سارا سال حجاب میں رہتی ہیں اور فقط ایک شام بے حجاب ہو جائیں تو اس کے عوض لوگوں کو اپنے حسن سے سیراب کرائیں۔کیا یہ عمل عام بازاری عورتوں جیسا نہیں ہے؟''

''تم ابھی اس بارے نہیں سمجھ سکتی ہو۔'' مہرالنساء نے اسے اسی عجیب لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا'' مرد ہمارے لیے صرف اسی طرح متجسس رہ سکتے ہیں کہ ہم انہیں دکھائی نہ دیں۔لیکن ہم ان کے خوابوں میں کیسے بس سکتی ہیں؟ وہ ہماری چاہ کیسے کر پائیں گے؟اس کے لیےانہیں ایک جھلک دکھانا ضروری ہوتا ہے۔''

''کیا یہی عمل عورت کے لیے مجبوری ہوتا ہے؟''اس نے دھیرے سے کہتے ہوئے پوچھا۔''شہنشاہ کے علاوہ وہاں پراور کون لوگ مدعو ہوتے ہیں؟''

''شہزادے،عمائدین سلطنت اور امراءِمملکت۔''اس نے ارجمند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔پھر سازشی انداز میں بولی۔''کون جانتا ہے کہ آج کی رات کیا ہو جائے۔کوئی حیران کن واقعہ بھی ہوسکتا ہےاور نجانے کس کے دل میں کس کے لیے کیسے جذبات ابھر آئیں؟۔''اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

ارجمند نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اگر چہ اس کے گھر کی ساری خواتین ہی مینا بازار کے لیے پرجوش تھیں لیکن مہرالنساء یوں دکھائی دے رہی تھی کہ جیسے وہ سحر زدہ سی ہے۔اس شام تو وہ یہ بھی بھول چکی تھی کہ وہ شادی شدہ ہےاور اس کی ایک جوان بیٹی بھی ہے۔وہ خود کو یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ بھی ایک لڑکی ہی ہواور ابھی تک رومانوی خوابوں کے زیر اثر کھوئی ہوئی ہو یا پھر کسی انجانے محبوب کی یاد میں شاعری کرتی رہی ہو۔ایسی لڑکی جس کے خواب ابھی کچے ہوتے ہیں اور یہ کچے خواب اس کے پورے وجود پر جادوئی عمل کر دیتے ہیں۔اس کی سانسیں مہک جاتی ہیں اور خیال رنگین ہو جاتے ہیں۔جب ہر لمحے یونہی لگتا ہے کہ کوئی دل چھین کر لے جا رہا ہے۔ارجمند حیران تھی کہ مہرالنساء کے دماغ میں کیا ہے؟ آخر ایسا کیا ہونے والا تھا جس کے لیے وہ اتنی آزردہ تھی۔ایسی آزردگی جس میں قرب کی تمنا اور انتظار کی لذت ہوتی ہے۔

اس کی طرح،مہرالنساء کی بھی ایک ہی بیٹی تھی۔''لاڈلی۔!''ایک شرمیلی سی،خاموش طبع اور دبوسی لڑکی،جس نے کبھی بھی کسی معاملے میں جرأت مندی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ارجمند اور لاڈلی دونوں ہم سن اور گہری سہیلیاں تھیں۔لاڈلی اپنے زیادہ تر مسائل ارجمند ہی کو بتایا کرتی تھی۔اسے اپنا زیادہ وقت ارجمند کے پاس گذارنا اچھا لگتا تھا۔مہرالنساء کے پاس تو اپنی دوکان پر رکھنے کے لیے بیش بہا خزانہ تھا۔لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے دوکان سجائی تو کس شے سے؟ وہ ابھی چھوٹی عمر کی کنواری لڑکی تھی۔اس کے پاس اتنا خزانہ نہیں ہوسکتا تھا۔اس کے پاس تو سونے کی ایک بھاری زنجیر،چند چوڑیاں اور دو

انگوٹھیاں تھیں۔اس کا زیادہ تر زیور چاندی کا تھا۔وہ اس جگہ تک گئی جہاں اس کے زیورات کا صندوقچہ رکھا ہوا تھا۔اس نے وہ اٹھایا اور لا کر بستر پر ڈھیر کر دیا۔اس نے غور سے دیکھا، کانوں کے جھمکے، گلے کا ہار، چوڑیاں، پازیبیں اور انگوٹھیاں تھیں۔چاندی کا یہ زیور اتنا قیمتی نہیں تھا۔ان کی قیمت بہت تھوڑی تھی۔ وہ ڈانواں ڈول سی ہوگئی کہ وہ دوکان سجائے یا نہیں۔!

انہی لمحوں میں اسے اپنا وہ خواب یاد آیا جس سے اس کے اندر خوش گمانیاں اتر آئیں تھیں۔اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی ٹوٹے ہوئے خواب کے منظر اسے یاد آتے چلے گئے۔کیا اس خواب اور شاہی مینا بازار میں کوئی مطابقت ہے؟ یہ خیال آتے ہی وہ پورے وجود سے ہل گئی۔اس کا وجود دھیرے دھیرے کانپنے لگا۔شاید۔! ہوسکتا ہے؟ کیونکہ ایک ہی دن میں دو اہم واقعات اس کی معمول بھری زندگی میں ارتعاش پیدا کر چکے تھے۔اسے یہ احساس ہوا کہ یہ دونوں واقعات اس کے لیے غیر معمولی ثابت ہوسکتے ہیں۔سرسبز باغ، طلائی روشنی، مدھر موسیقی اور تیز قرمزی شعاعیں والے ماحول میں دیکھے گئے خواب میں پراسرار ٹوکری اور بھیانک آواز......! وہ اسی ادھیڑ بن میں بہت دور تک نکل گئی تھی خیالوں میں وہ کسی نئی تعبیر کو تراشنے لگی تھی۔

''آقازادی۔! لگتا ہے بہت ہی گہرے خیالوں میں کھوئی ہوئی ہیں آپ؟'' عیسیٰ نے آکر ارجمند کو خیالوں کی دنیا سے نکل آنے پر مجبور کر دیا۔'' آپ دوسری بیگمات کی طرح پرجوش نظر نہیں آرہی ہیں۔''

عیسیٰ وہ ملازم لڑکا تھا جسے ارجمند کے دادا غیاث بیگ نے بردہ فروشوں سے بازیاب کروایا تھا۔تین سال پہلے وہ اس کے دادا کو ملا تھا۔اس نے آزاد کروایا تو پھر وہ ان کے ہی گھر ملازم ہوگیا۔وہ تیرہ چودہ سال کا دبلا پتلا سا لڑکا تھا۔اس نے بتایا تھا کہ اس کا گاؤں شمالی علاقے گول کنڈا میں ہے۔جہاں سے اسے ایک مداری نے اغوا کر لیا تھا۔تب وہ بہت ہی چھوٹا تھا۔مداری نے اسے کئی سال اپنے ساتھ رکھا۔وہ ایک شہر سے دوسرے شہر پھرتا ہوا محوسفر رہا تھا۔وہ اس کے پاس سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن جب بھی اس نے کوشش کی پکڑا گیا اور پھر بہت زیادہ مار کھائی۔اس کے دادا نے اسے آزادی دلوائی اور پھر اپنی پناہ میں لے لیا۔اس کا دعویٰ تھا کہ وہ خواجہ سرا ہے۔اس پر مہرالنساء کے خواجہ سرا منیر نے تصدیق کی تو اسے حرم میں آنے کی اجازت دے دی گئی۔وہ دوسری بیگمات کی نسبت ارجمند کی خدمت زیادہ وفاداری سے سرانجام دیا کرتا تھا۔ارجمند نے عیسیٰ کی طرف دیکھا اور کہا۔

''عیسیٰ۔!وہ کپڑا اٹھاؤ اور اس زیور کو باندھو۔''

اس نے جھک کر اسے تعظیم دی اور ایک طرف میز پر دھرے ہوئے گہرے سبز رنگ کا بڑا سا رومال اٹھایا جو چاندی کے تاروں سے کڑھا ہوا تھا۔اس نے وہ سارا زیور اٹھایا اور اس کپڑے میں باندھ دیا۔

''اسے تم اٹھائے رکھو گے۔'' ارجمند نے اسے حکم دیا پھر ایک لمحہ کو ٹھہر کر بولی'' کیا دوسری بیگمات تیار ہیں؟''

''جی ہاں آقازادی۔!بس کچھ دیر بعد کوچ ہو جائے گا۔''

اس نے سنا اور سر ہلا دیا۔عیسیٰ قدرے جھکا اور واپس مڑ گیا۔

شاہی مینا بازار کا انعقاد لال قلعہ میں موجود شاہی محل کے باغ میں ہونے والا تھا۔اس باغ میں سوائے چند خاص لوگوں کے کسی بھی شخص کے داخلے پر پابندی تھی۔لال قلعہ، پر جلال انداز میں دریائے جمنا کے کنارے کھڑا تھا۔یہ قلعہ شہنشاہ اکبر نے بنوایا تھا۔جو اس کی یادگار عمارتوں میں سے ایک عمارت تھی۔

شہنشاہ اکبر نے ہی ارجمند کے دادا غیاث بیگ کو ملازمت دی تھی۔وہ انتہائی کسمپرسی کی حالت میں ہندوستان آئے تھے۔اگرچہ غیاث بیگ کا والد خواجہ محمد طہرانی حاکم خراسان کا وزیر تھا۔وہ بہت اچھی زندگی بسر کر رہے تھے کہ چند پہ در پہ حادثات نے ان کی مالی حالت بہت کمزور کر دی۔یہاں تک کہ ان کی گذر بسر تنگ دستی میں ہونے لگی۔تب اس نے ایران سے کوچ کر جانے کا سوچا اور ایک ہندوستانی قافلے کے ساتھ چل پڑے۔غیاث بیگ کے ساتھ اس کا بیٹا ابوالحسن اور بیٹیاں تھیں۔ایران سے ہندوستان کے سفر کے دوران ان پر ڈاکوؤں کی افتاد پڑی جس سے ان کی حالت مزید خراب ہوگئی۔ان پانچ لوگوں کے پاس صرف دو اونٹ سواری کے لیے بچ گئے۔غیاث بیگ کی بیوی حاملہ تھی۔یہ قافلہ جب قندھار کے نزدیک پہنچا تو وہاں مہرالنساء پیدا ہوئی۔اس وقت تنگدستی کی انتہا تھی۔بھوک کی وجہ سے دودھ بھی نہ اترا اور نومولود اپنا پیٹ بھی نہ بھر سکی۔قافلہ سالار ملک مسعود کو ان کی حالت زار کا پتہ چلا تو اس نے مدد کی۔پھر اسی ملک مسعود کی وجہ سے وہ اکبر کے دربار میں باریاب ہوئے۔

''اے ایرانی سوداگر۔!اس بار تم ہمارے شایان شان کوئی تحفہ کیوں نہیں لا سکے؟'' اکبر نے پوری تمکنت سے ملک مسعود کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔

''حضور۔!عالم پناہ۔!میں کیا اور میری بساط کیا۔میں کون ہوتا ہو کہ آپ کے شایان شان کوئی تحفہ رکھ سکوں، یہ تو

آپ کا حسن نظر ہوتا ہے کہ میری اشیاء کو قبولیت کا درجہ دیتے ہیں۔''

''تو کیا اس بار تم خالی ہاتھ ہمارے حضور آئے ہو؟''

''نہیں عالم پناہ۔! دوران سفر میرے ہاتھ جاندار ہیرے لگے ہیں۔ایسے تحائف شاید پہلے کبھی پیش نہیں کیے گئے۔ اگر عالم پناہ کی اجازت ہوتو انہیں پیش کروں۔''

شہنشاہ نے اجازت دی تو اس نے غیاث بیگ کے ساتھ ابوالحسن کو پیش کر دیا۔اکبر نے انہیں ملازمت دے دی۔ وہ غربت اور بدقسمتی سے نکل آئے۔انہوں نے اپنی ذہانت سے خاصی اقبال مندی حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ غیاث بیگ ''دیوان بیوتات'' کے عہدے تک رسائی حاصل کر گیا۔ارجمند کے دادا کی ترقی بہت شاندار تھی۔ تاہم ہندوستانی روایات میں رشوت خوری کے اثرات کی وجہ سے غیاث بیگ بھی اس جرم میں ملوث ہو گیا۔وہ تحفے تحائف کے عوض لوگوں کی طرف داری کرنے لگا۔اس نے اکبر کی عنایات کا غلط فائدہ اٹھایا اور رشوت لینے لگا۔شہنشاہ تک اس کی خبر ہوئی تو اس نے غیاث بیگ کو معزول کر دیا۔

اکبر کی وفات کے بعد وہ جہانگیر کی ملازمت میں آنے کے لیے کوششیں کرنے لگا۔اسے کئی وجوہات کی بنا پر اندازہ تھا کہ وہ دوبارہ شاہی ملازمت میں آ جائے گا۔ان وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جہانگیر ان کے گھرانے پر حد سے زیادہ مہربان تھا۔ان کا گھرانہ شاہی مینا بازار میں جانے کے لیے اس لیے بھی بہت زیادہ پر جوش تھا کہ انہیں نہایت عزت و وقار سے اس بازار میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی۔اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا رہا تھا کہ بادشاہ ان پر مہربان ہے اور وہ بہت جلد پھر سے شاہی ملازمت میں شامل کئے جانے والے تھے۔

ان کے گھر سے لال قلعے کا فاصلہ چند کوس کے فاصلے پر تھا۔اس کے لیے انہیں گلیوں اور بازاروں میں سے ہو کر جانا تھا۔ان کا خاندان پالکیوں میں قافلہ کی صورت چل پڑا۔خواجہ سرا اور ملازمین اسی قافلے کے آگے اور پیچھے تھے جو اس قافلے کے لیے راستہ بناتے جا رہے تھے۔ارجمند کے ساتھ پالکی میں مہر النساء بیٹھی ہوئی تھی۔عیسیٰ ان کے پیچھے اڑتی ہوئی دھول میں چلتا جا رہا تھا۔گرمی کے باعث پالکی میں حبس تھا۔لیکن ارجمند نے اس بڑے شہر کے مناظر دیکھنے کے لیے اس حبس کو نظر انداز کر دیا تھا۔وہ پہلی بار اس راستے سے جا رہی تھی۔ان نے آگرہ کے بازاروں کے بارے میں سنا ضرور تھا لیکن دیکھے نہیں تھے۔وہ اپنی سنی ہوئی باتوں کی تصدیق کے لیے پالکی سے باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی۔اس نے آگرہ شہر کے کئی

روپ دیکھے۔ اسے یہاں ہر طرح کے لوگ دکھائی دیئے۔ ایسی عورتیں اور مرد جو ایران، یونان، بنگال، ازبکستان، چین اور مشرقِ بعید سے آئے ہوئے تھے۔ افغانستان اور ہندوستان کے مختلف صوبوں سے آئے ہوئے لوگ۔ ان بازاروں میں دنیا کے مختلف خطوں سے لائی مہنگی اور سستی چیزیں فروخت ہونے کے لیے پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سونے اور چاندی کے زیورات، ریشم کے تھان، چینی کے برتن، ہیرے جواہرات، مصحالے، غلام، گھوڑے، گدھے، ہاتھی، سب کچھ جو بیچا اور خریدا جا سکے۔ ان کے قافلے کے پیچھے فقیروں اور بھکاریوں کا ایک غول امنڈ آیا تھا۔ عیسیٰ انہیں ایک دام یا آنہ دے کر قافلے سے پرے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غربت کا نصیب بہت بڑی بدقسمتی ہوتی ہے اور یہ بڑی عجیب بات رہی ہے کہ ہمیشہ غریب ہی ایک دوسرے کے لیے سخت رویہ رکھتے ہیں۔

غیاث بیگ کے خاندان کا قافلہ امر سنگھ دروازے سے قلعے کے اندر داخل ہوا۔ دہلی دروازہ اور ہاتھی پال دروازہ مغل فوج کے لیے مخصوص تھا۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے مغل فوج نے قلعے پر قبضہ کر لیا ہو۔ ہر طرف سپاہی نظر آ رہے تھے۔ جنہوں نے گہرے سرخ رنگ کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ چمکتے ہوئے فوجی اعزاز، تلوار اور ڈھالیں پکڑے ہوئے اسلحہ سے لیس تھے۔ قلعے کی زندگی بلاشبہ ایک دوسرا جہاں تھا۔ دریائے جمنا کے رخ، موڑ کے ساتھ ساتھ قلعے کی دیوار بھی مڑی ہوئی تھی۔ جس کی اونچائی لگ بھگ ستر فٹ اور چوڑائی دس فٹ تھی۔ دیوار کے اوپر کا کنارہ دندانے دار تھا اور ایک خاص فاصلے پر برجی بنی ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ دو کوس تک چلا گیا تھا۔ قلعہ کی دیوار پہ شاہی محافظ تعینات تھے۔ امر سنگھ دروازے سے داخل ہونے والے مہمان قافلے کو احاطے میں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ وہاں ایک چبوترے پر امیر محافظ بیٹھا ہوا تھا وہ اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ آنے والے قافلے کو مدعو کیا گیا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی تلاشی لے رہے تھے کہ اسلحہ یا کوئی مضر رساں چیز اندر نہ چلی جائے۔ وہاں سے اجازت ملنے کے ساتھ قافلہ اس راستے پر ہو جاتا جو ڈھلوان کی صورت اوپر کی جانب اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ راستہ بڑی بڑی دیواروں کے درمیان تھا۔ جونہی وہ ڈھلوانی راستہ ختم ہوا اس کے آگے ایک ہموار میدان تھا۔ جس سے آگے کچھ فاصلے پر دیوان عام تھا۔ دیوان عام پر لکڑی کی چھت تھی جس میں چاندی بھی بھری ہوئی تھی۔ باغ، شاہی محل کے عقب میں تھا۔ قلعے کی مشرقی دیوار کے ساتھ جہاں سے دریائے جمنا کا نظارہ بڑا دلکش دکھائی دیتا تھا۔ سرخ پتھر سے تعمیر کیا گیا محل بڑی نفاست سے بنایا گیا تھا۔ پہلی نگاہ میں اس کی مضبوطی کا اندازہ نہیں ہوتا تھا بلکہ دیواریں اور ستون پر بنے ہوئے نقش نگار اپنی جسامت کے باعث بے حد نازک اور نفیس دکھائی دے رہے تھے۔

مغل شہنشاہ محلوں کو رہائش کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے خیموں میں رہتے تھے، شہنشاہ جہانگیر کا خیمہ بھی باغ میں نصب تھا جسے ''بارگاہ'' کا نام دیا گیا تھا۔ وہی اس کی خواب گاہ بھی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا، انتہائی محنت اور کوشش سے بنایا ہوا خیمہ تھا۔ جس میں خوبصورت ایرانی قالین، کشمیری ریشم کے پردے، دیواروں پر فن مصوری کے نادر نمونے سجے ہوئے کئی کمرے تھے۔ پہلے منگول فاتح تیمور لنگ نے اپنی نسل میں سے ہونے والے حکمرانوں کے لیے یہی نصیحت چھوڑی تھی کہ وہ عمارت کی چھت تلے نہیں سوئیں گے۔ اس لیے ہر مغل شہنشاہ اس کی اطاعت کرتا تھا۔ باغ کا بقیہ حصہ شاہی بازار کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں پر انتظامیہ کے دفاتر اور کارندوں کے لیے جگہیں بنائی گئیں تھیں۔

غیاث بیگ کے خاندان کو قلعہ چھوڑے ہوئے تقریباً تین سال ہو گئے تھے۔ اس دوران بہت کم تبدیلیاں رونما ہوئیں تھیں مگر وہ خاندان اس قلعے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے بالکل پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ محل، فوارے، درباری سجے سجائے خدام، موسیقار، شعبدہ باز، ہاتھی اور گھوڑے۔ انہیں قلعے کے اندر ہوائیں بھی گنگناتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہاں پر طاقت کا بھرپور اظہار کیا گیا تھا اور ایسے مواقعوں میں تو نمود و نمائش کی ضرورت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اس وقت شہنشاہ جہانگیر پوری سلطنت میں دل کی دھڑکن کی مانند تھا اور غیاث بیگ کا خاندان جہانگیر کے دل کے قریب تھا۔ افراتفری، ہجوم اور گرمی کے باعث ارجمند کا دماغ چکرا رہا تھا۔ شہزادے اور شرفاء کے حرم سے آئے بے شمار پالکیوں والے قافلے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ساری پالکیاں محل کی دہلیز پر خالی ہو رہی تھیں۔ شہنشاہ کا حرم اسی محل میں تھا۔ جس میں کوئی آسانی کے ساتھ داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ عورتیں بھی مغل اعظم کے ان گنت خزانے کا حصہ تھیں۔

ارجمند اور اس کا خاندان پہلے شاہی محافظوں کے گھیرے میں سے گذر گیا۔ وہ محافظ اسلحہ سے لیس تھے۔ انہوں نے خواتین کی تلاشی تو نہیں لی لیکن ان کے ساتھ جو خواجہ سرا تھے ان کی تلاشی انتہائی سختی سے لی گئی۔ اس سے اگلا گھیرا محل کی غلام گردشوں میں تھا جہاں ازبک غلام عورتیں، جنہیں قلماقنی کہا جاتا تھا تعینات تھیں۔ وہ کسی طور پر بھی شاہی محافظوں سے کم نہیں تھیں وہ انہی کی طرح سفاک اور اسلحہ سے لیس تھیں۔ ان کے کاندھے چھوڑے، بازو مضبوط اور رویہ انتہائی سخت تھا۔ وہ بلا تکلف ہر عورت کی تلاشی لے رہی تھیں۔ تلاشی کے دوران ان کا رویہ سخت نہیں تھا بلکہ وہ جسم پر یوں ہاتھ پھیر رہی تھیں جیسے دوستانہ انداز ہو۔

ارجمند نے کبھی اتنی ساری عورتیں ایک ہی جگہ اور ایک ہی دن میں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ ساری کی ساری پرجوش

تھی۔ یہ بہت بڑا ہجوم تھا جنہیں وہ گن نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اسے اندازہ تھا کہ یہ کتنی ہوسکتی ہیں۔ ایسا ممکن تھا کیونکہ مغلیہ شہنشاہوں کے حرم ہی اتنے بڑے تھے۔ ان کی زیادہ تر شادیاں سیاسی اتحاد بنانے کے لیے ہوتی تھیں۔ جن خواتین کے ساتھ وہ باقاعدہ نکاح کرتے تھے ان کی زندگی محل میں گذرتی۔ انہیں خصوصی مراعات سے نوازا جاتا، بڑی بڑی جاگیریں عنایت کی جاتیں۔ پھر وہ اپنی سوجھ بوجھ اور عقل مندی کی بدولت اپنی دولت میں اضافہ کرتی رہتیں۔ ان میں ایسی خواتین بھی تھیں جنہیں خاص دورانیے کے لیے بیوی بنایا جاتا اور پھر انہیں سونے چاندی سے لاد کر ان کے گھر واپس بھجوا دیا جاتا۔ مغلیہ شہنشاہوں کے حرم میں ہر قوم کی خاتون تھی، جن میں راجپوت، کشمیری، ایرانی، بنگالی، تاتاری، منگول، تبتــــی اور روسی تھیں۔

محل کی دنیا بھی ایک نئی طرح کی دنیا تھی۔ اس میں اس قدر کمرے تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہو۔ ان میں کئی طرح کے کمرے تھے۔ اپنی الگ انفرادیت کے باعث ان کی نوعیت ہی مختلف لگتی تھی۔ ہر کمرہ اس کے مکیں کے ذوق کے مطابق آراستہ تھا۔ وہاں کا پورا ماحول بھاری اور خوشگوار مہک سے رچا بسا تھا۔ جگہ جگہ کھڑی قلماقنی، حرم کی خواتین، عمائدین سلطنت کے خاندان اور معزز شرفا کی بیویاں اور بیٹیاں۔ اک ہجوم تھا جو دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ وہ بھی یوں چل رہی تھی جیسے تیر رہی ہو۔ ان کی رفتار کچھ زیادہ دھیمی تھی۔ ایک تو وہاں رش ہی اتنا تھا، دوسرا مہر النساء کی جان پہچان والی انہیں روک کر کھڑی ہو جاتیں۔ اس سے باتیں کرنے لگتیں۔ پھر یہی روکنے والی خواتین دوسری عورتوں کے ساتھ سرگوشیاں کرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ بہت ساری خواتین نے انہیں انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ عورتیں اگر مہر النساء کے ساتھ منافقانہ رویے کے ساتھ مل رہی تھی تو وہ بھی ان کے ساتھ پرخلوص نہیں تھی۔ اس سارے ہجوم میں اسی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانا تھا جو سب سے زیادہ شہنشاہ کے نزدیک تھا۔ وہاں موجود عورتوں کے رویے سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ ارجمند ان منافقانہ رویے والی عورتوں سے الگ تھلگ ہی رہی تھی۔ اس لیے اسے نظر انداز کیا جاتا رہا تھا۔ وہ وہاں پر موجود خواتین کے انداز، گفتگو اور ملنے کی اداؤں سے سمجھ رہی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں لیکن کہہ نہیں پا رہی تھیں۔ ان کی حیرت میں یہی بات پوشیدہ تھی کہ انہیں یہاں کیسے دعوت دی گئی، کیا غیاث بیگ کو معافی دے دی گئی؟ اس احساس کے ساتھ ہی ارجمند کو وہاں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں پر ہوا کی کمی نہیں تھی۔ دریائے جمنا کی جانب سے بڑی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا آ رہی تھی۔ ارجمند نے جو وہاں گھٹن محسوس کی تھی وہ وہاں کے ماحول میں بسی ہوئی منافقت اور جھوٹ کی وجہ سے تھا۔

وہ سب کی نگاہ بچا کر بالکونی میں جا کھڑی ہوئی جہاں سے شاہی باغ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بہت ہی خوبصورت باغ تھا۔ یہ مغلیہ فرمان رواؤں کی ہمیشہ سے آرزو رہی تھی کہ وہ سرسبز و خوشگوار باغوں کی تعمیر کریں۔ مغلوں کے آباء واجداد چونکہ خانہ بدوش تھے۔ اس لیے وہ کھلے ماحول کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے۔ یہ باغ ان کی فطری خواہشوں کا اظہار کر رہا تھا۔ جیسے ان کے آبا اجداد چشموں، درختوں اور پھولوں بھرے فطری ماحول میں رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ باغ خوشگوار پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ہر طرح کے پھول اور سرسبز و شاداب درخت تھے۔ باغ کے عین درمیان میں پانی کا فوراً عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ اس خوبصورت منظر کے ساتھ اس نے دیکھا کہ باغ میں عارضی دوکانیں بنادی گئی تھیں جہاں ان خواتین نے اپنا اپنا سامان سجانا تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں دوکانیں دیکھ کر ارجمند ایک لمحہ کے لیے تو مایوس ہوگئی۔ اسے اپنا چاندی کا مختصر سا زیور ضائع ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے لگا جیسے اس کے زیور کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ دوکانوں کے درمیان بنی راہداریوں پر قالین بچھا کر زمین کو ڈھانپ دیا گیا تھا۔

''ارجمند۔! تم یہاں کھڑی ہو، میں تمہیں ادھر ادھر تلاش کر رہی ہوں۔''

مہرالنساء نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے ساتھ چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ایک خاتون کے پاس لے گئی۔ وہ پتلی سی، شرمیلی سی اور نرم مزاج رکھنے والی ادھیڑ عمر خاتون تھی۔ اس نے نہایت قیمتی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

''ملکہ معظم۔! یہ میری بھتیجی ارجمند بانو ہے۔''

وہ شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ جودھی بائی تھی۔ وہ اس کے سامنے تعظیم سے جھکی۔ وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی لیکن اسے فوراً سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ملکہ سے کیا باتیں کرے۔ ملکہ بھی شاید اسی انتظار میں تھی کہ وہ بات کرے۔ ارجمند نے ملکہ کی طرف دیکھا۔ اسے وہ بے سکون اور ناخوش سی خاتون دکھائی دی۔ جیسے اس عورت کو یہ سارا ماحول اچھا نہ لگ رہا ہو محض مجبوری کی بنا پر وہ وہاں پر موجود ہو۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ مہرالنساء شاہی مینا بازار کے لیے کس قدر پرجوش تھی۔

جودھی بائی۔! جودھ پور کے راجہ اودھے سنگھ معروف بہ ''موٹا راجہ'' کی بیٹی تھی۔ یہ راج کماری مان متی اور جگت گسائیں کے ناموں سے بھی یاد کی جاتی تھی۔ جگت گسائیں کا خطاب شادی کے بعد شہنشاہ جہانگیر نے دیا تھا۔ راجہ اودھے سنگھ ایک مدت تک مغلیہ سلطنت سے نبرد آزما رہا تھا اکثر جنگوں میں راج کماری جودھی بائی نے بھی مغلوں کے مقابلہ میں اپنے باپ کے ساتھ بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ 1585ء میں جودھ پور جہانگیر کے ہاتھوں فتح ہوا۔ جہانگیر۔! راج

کماری جودھی بائی کے حسن و جمال اور بہادری سے بے حد متاثر تھا۔اس نے اسی سال اس سے شادی کر لی اوراس کے بطن سے شہزادہ خرم پیدا ہوا تھا۔ جودھی بائی فطرتاً آزاد خیال اور حریت پسند طبیعت کی مالک تھی اور ایسے لوگوں کو پابندیاں گوارا نہیں ہوتیں۔ اس کے باپ اودھے سنگھ نے اسے مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ وہ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر باغوں کی سیر کو نکل جایا کرتی تھی۔ مغلیہ سلطنت میں، ایک آزاد خیال، بہادر، حریت پسند اور نازک مزاج راج کماری کو محل کی پابندیاں راس نہیں آئیں۔ جہانگیر اس کی خوبصورتی سے ہی نہیں بلکہ اس کی بالغ نظری اور ذکی فہمی کی بے حد تعریف کیا کرتا تھا۔

جودھی بائی نے ارجمند کو پیار سے دیکھا اور مہر النساء کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ دونوں بڑے تپاک سے باتیں کرتی رہیں۔ ارجمند کو یہ توقع نہیں تھی کہ ان دونوں کے تعلقات اس قدر اچھے ہوں گے۔ مگر اسے ان دونوں کی باتوں سے بھی منافقت کی بو آ رہی تھی۔ اس کا اظہار تھوڑی دیر بعد دونوں ہی نے کر دیا۔ جودھی بائی اچانک ایک طرف چل دی جیسے کوئی جانور پریشانی میں ہانک دیا جائے۔ تبھی مہر النساء بڑبڑائی۔

"اُو۔! کس قدر جاہل، گنوار اور بے وقوف عورت ہے۔"

"آپ تو ان سے یوں مل رہی تھیں جیسے آپ دونوں میں بڑا دوستانہ تعلق ہے۔"

"تمہیں نہیں پتہ۔ یہ کس طرح کی عورت ہے۔ جہانگیر شراب تو پیتا ہی ہے لیکن اگر وہ اس عورت کے ساتھ زیادہ عرصہ رہا تو بہت جلد مر جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکی اور پھر جیسے ہوش میں آ گئی" تم چھوڑو ان باتوں کو، یہ باتیں تمہارے سمجھنے کی نہیں ہیں۔"

وہ بھی اچانک مڑی اور بھیڑ میں کھو گئی۔

ارجمند۔ اپنی پھوپھی کو نہیں سمجھ پائی تھی۔ وہ ایسی میں متلون مزاج عورت تھی کہ جس کے خوشگوار حسن کے نیچے، سرد ترین جذبات بہہ رہے تھے۔ اس کے بارے میں نہ تو کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی اور نہ ہی کوئی حتمی رائے قائم کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنے راز چھپا کر رکھتی تھی۔ اس کے ذہن میں کیا ہے، کوئی بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ اسے اپنے خیالات، جذبات اور تاثرات چھپا کر رکھنے میں زبردست مہارت تھی۔

شاہی مینا بازار سج چکا تھا۔ خواتین نے اپنے ساتھ لایا ہوا سامان سجا لیا تھا۔ شام ڈھلنے کے کافی دیر بعد جب رات کا پہلا پہر ڈھل جانے کو تھا۔ اچانک باغ کی فضا میں ہلچل مچ گئی۔ کافی فاصلے پر عورتیں زور زور سے نعرے لگا رہی تھیں۔

''زندہ باد بادشاہ......زندہ باد بادشاہ۔''

یہ شور دھیرے دھیرے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔شہنشاہ جہانگیر شاہی مینا بازار میں آ رہا تھا۔تبھی وہ ارجمند کو بھی دکھائی دیا۔عورتیں اس کے سامنے تعظیم سے جھک رہی تھیں۔وہ چہل قدمی کے انداز میں چلتا چلا آ رہا تھا۔اس کے قدم کمخواب کے اس قالین پر تھے جو اس کے لیے خصوصی طور پر بچھایا گیا تھا۔اس کے ساتھ اس کا دادا غیاث بیگ بھی تھا جس کے ساتھ وہ کوئی گہری گفتگو کر رہا تھا۔شہنشاہ نے گلناری رنگ کی ریشمی دستار باندھی ہوئی تھی۔اس میں سفید پر لگا ہوا تھا جو دھیرے دھیرے لہرا رہا تھا۔وہ پر جس بروچ میں اڑسا ہوا تھا اس کی جسامت اخروٹ جتنی تھی اور خالص سونے کا بنا ہوا تھا۔اس میں زمرد، یاقوت اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔اس نے سونے کا کمر بند باندھا ہوا تھا۔ان میں بھی ہیرے جواہرات اور نگینے جڑے ہوئے تھے۔اس کے داہنی طرف ہمایوں بادشاہ کی تلوار لٹک رہی تھی، جس کی میان اور دستے پر بھی ہیرے جواہرات جڑے تھے۔اس کے گلے میں سچے موتیوں کا تین لڑی ہار تھا۔دونوں بازوؤں کی کلائیوں سے کہنیوں تک ہیروں سے مزین بازو بند تھے۔اس کی انگلیوں میں قیمتی پتھروں سے جڑی انگوٹھیاں تھیں۔اس کے زیرِ پائی سونے کی تاروں سے کڑھے اور ان پر موتی ٹنکے ہوئے تھے۔اس کے عقب میں دو آدمی چلتے چلے آ رہے تھے۔ایک کے ہاتھ میں ترکش اور کمان تھی جبکہ دوسرے نے ایک کتاب پکڑی ہوئی تھی۔اس کے پیچھے ایک شخص قلم اور دوات تھامے ہوئے تھا۔بادشاہ آگے بڑھتا گیا۔

ارجمند کی دوکان چھوٹی سی تھی، داخلی دروازے کے ساتھ ہی نیم کے درخت کے نیچے۔جبکہ مہرالنساء کی دوکان چمکتے ہوئے فوارے کی روشنی میں تھی۔اس نے اپنے چاندی کی زیورات قدرے بے ترتیب انداز میں پھیلا کر رکھ دیئے۔وہ مایوس تھی کیونکہ ان زیورات میں کسی کو متوجہ کرنے کا کوئی ایسا پہلو نہیں تھا۔سستا سا چاندی کا زیور، سبز رنگ کے ریشمی کپڑے پر اداس پڑا ہوا تھا۔ارجمند نے اس زیور کی طرف دیکھ کر کہا۔

''عیسیٰ۔بھلا اس زیور کو کون خریدے گا؟''

''وہی جو بہت خوش قسمت ہو گا۔میں ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں آقا زادی۔'' عیسیٰ نے بلاشبہ اس کا دل رکھنے کے لیے ایسا کہا تھا۔تب وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''تو پھر وہ بہت ہی بے وقوف ہو گا۔اس مینا بازار میں اتنی بے شمار اور بہترین اشیاء کی موجودگی میں کون انہیں دیکھے گا۔؟''

شہنشاہ کے ساتھ بہت سارے معززین بھی تھے۔ داخلی دروازے سے گذرنے کے بعد وہ بھی اس بازار میں پھیل گئے۔ ارجمند خود کو انتہائی بے سکون محسوس کر رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اتنے لوگوں کے سامنے بے حجاب کھڑی ہونے کی وجہ سے ان کی نگاہیں اس کے چہرے کو میلا کر رہی ہیں۔ وہ وہاں سے چلے جانا چاہتی تھی لیکن اب وہ ایسا کر نہیں سکتی تھی۔ اس کی روح پھڑ پھڑا رہی تھی، اس پرندے کی مانند جسے قید میں ڈال دیا گیا ہو۔ وہ لاشعوری طور پر خود کو لوگوں کی نگاہوں سے بچائے اپنے ہی خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اس کی محویت کو اس کے دادا نے توڑا۔

''ارجمند۔! ارے تم تو بہت زیادہ چھپ کر بیٹھی ہوئی ہو؟''

''مجھے یہی دوکان ملی ہے اور پھر میں اکیلی ہوں۔ امی حضور تو لاڈلی کے ساتھ ہیں۔''

اس کے جواب پر وہ ہنسا ''کیا بھولپن ہے؟''

یہ غیاث بیگ کا مخصوص انداز تھا۔ ارجمند اس سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ اس کے لیے وہ بہت رحم دل تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے دادا کو خاموشی میں دیکھا تھا؟ گہرے اور متفکرانہ خیالات میں گھرے ہوئے۔ وہ لمبا اور پتلا سا تھا۔ درمیانہ سا قد، اس کی آنکھیں بھوری اور خوبصورت تھیں۔ بالکل ارجمند کی طرح۔

''دادا جی، کیا آپ میری دوکان سے کچھ خریدیں گے۔ ورنہ دوسرا تو کوئی خریدار نہیں آنے والا۔''

''ارے تم تو ابھی سے گھبرا گئی ہو ارجمند۔! ابھی تو شاہی مینا بازار شروع ہوا ہے۔ بہت سے مرد حضرات یہاں خریداری کے لیے آئیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ ذرا سا ہنسا اور پھر دھیرے سے بولا، ''اگر وہ بے وقوف ہوئے تب خریداری کریں گے۔''

اس پر ارجمند کا چہرہ بجھ گیا۔ تب وہ بولی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ خیر۔!''

''تم اتنی آزردہ نہ ہو۔ تم سمجھو تمہارا یہ سامان بک گیا۔ میں واپس آؤں گا۔ میرے آنے تک اگر یہ سامان نہ بکا تو میں اچھی قیمت دے کر اسے خریدلوں گا۔ اب خوش۔؟''

''ہاں۔!'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ پھر جلدی سے بولی

''میں دیکھو رہی تھی آپ شہنشاہ کے ساتھ آئے ہیں اور ان سے گہری گفتگو کر رہے تھے۔''

اس کے لہجے میں خوشی جھلک رہی تھی۔اس پر غیاث بیگ نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں۔!وہ بہت مہربان ہیں۔وہ کمال مہربانی سے شفقت فرما رہے ہیں۔''

''آپ ان سے کس قسم کی باتیں کر رہے تھے۔کیا آپ دوبارہ مصاحبت میں لے لیے جائیں گے؟''

''یہ باتیں یہاں کرنے کی نہیں ہیں۔'' اس نے رازدارانہ انداز میں کہا اور دھیرے سے اس کے سر پر چپت لگا دی۔پھر غیاث بیگ وہاں سے ہٹ گیا۔

مرد حضرات کی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔وہ خواتین کے بے حجاب چہروں کو مختلف انداز میں دیکھ رہے تھے۔کوئی بڑے حوصلے سے گھور رہے تھے۔کچھ شرماتے ہوئے کنکھیوں سے، کوئی گھبراتے ہوئے انداز میں، وہ سب انہیں دیکھتے، آپس میں سرگوشیاں کرتے اور قہقہے لگاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔مینا بازار کی دوکان دار خواتین انہیں مختلف حیلے بہانوں سے اپنی جانب متوجہ کر رہی تھیں۔ہر جانب، ہر کوئی توجہ حاصل کرنے کی دھن میں تھا۔ارجمند کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا حوصلہ ہی نہیں کر پا رہی تھی۔وہ حیرت زدہ سی خود اس تماشے میں کھو گئی جو اس کے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔اس کی نگاہ شہنشاہ جہانگیر پر پڑی جو مہر النساء کی دوکان پر کھڑا تھا۔وہ کچھ دیر تک وہیں رکا رہا۔اس نے کئی اشیاء خریدیں خوشگوار انداز میں باتیں کیں اور پھر ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔مہر النساء بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔وہ چند لمحوں تک جہانگیر کو دیکھتی رہی پھر اس کی توجہ ان معززین کی طرف ہو گئی جو اس کی دوکان پر گاہک کی حیثیت سے آئے تھے۔

اچانک ارجمند کو یوں لگا جیسے وہ کسی انجانی نگاہوں کے حصار میں ہے۔اس نے لاشعوری طور پر ادھر ادھر دیکھا لیکن ایسی کوئی نگاہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ایک عجیب سی کیفیت اس کے من میں سرائیت کر گئی تھی۔جس میں خوف، بے سکونی اور کسی شے کو دریافت کر لینے کی چاہ تھی۔اسی لمحۂ جاوداں میں اسے شہزادہ خرم دکھائی دیا۔وہ تھوڑے سے فاصلے پر اس کی جانب پوری محویت سے دیکھ رہا تھا۔ارجمند کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ بے وزن ہو گئی ہے۔ایک لمحہ کو اسے اپنے وجود کا احساس ہی نہیں رہا۔اک الوہی کشش نے اسے شہزادے کی طرف متوجہ ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔وہ عارضی دوکانوں کے درمیان بنے ہوئے ٹیڑھے میڑھے راستوں میں سے ایک راہ پر کھڑا تھا۔ساکت، منجمد اور محویت سے بھرا۔

ارجمند اس کی آنکھوں میں بڑے غور سے دیکھ سکتی تھی۔روشن قندیلیوں سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔جس میں سے

جھانکتی آنکھیں اس کے پورے وجود کوایک میٹھی کیفیت سے آشنا کررہی تھیں۔اس کی سیاہ بھنورا آنکھوں میں شوق نظارہ کی جلتی جوت نے اس کے من میں بھی ایک دیا روشن کردیا۔اس کے چہرے پر نرماہٹ تھی، حاکمیت کا کروفر نہیں تھا۔اس کے چہرے پر محبتوں سے دل فتح کرنے والے عاشق کا تاثر پھیلا ہوا تھا۔اسے دیکھ کر یہ احساس نہیں ابھرتا تھا کہ وہ جسم پر قبضہ کرنے والا کوئی طاقتور شخص ہے۔خوشگوار جذبات اورالوہی کیفیات کے رچاؤ میں بسا وہ نوجوان بے حد کشش رکھتا تھا جس کی اٹھتی ہوئی جوانی دوسروں کواپنی طرف کھینچ لیا کرتی ہے۔

''کہیں یہ میرے خواب کے کسی ٹکڑے کی تعبیر تونہیں؟'' اچانک اس کے ذہن میں جب یہ خیال آیا تو وہ چونک گئی۔اس نے پوری توجہ سے سوچا کہ یہ کس ٹکڑے کی تعبیر ہوسکتی ہے؟

چمکتی ہوئی روشنی اس کا استعارہ تھی؟

یا ہلکے قرمزی رنگ کی تیز شعاعوں کی تعبیر ہے۔وہ اٹھتی ہوئی جوانی والا نوعمر لڑکا اگرایسا کچھ بھی نہیں ہے تو وہ انجانی کشش میں جکڑا ہوا کیوں کھڑا ہے؟

اس پورے تماشے سے بے نیاز، آنکھوں کوخیرہ کردینے والے حسن سے سرگراں اورہجوم کی نگاہوں سے بے پروا۔ اورکیا وہ صرف اسی کے لیے ہی وہاں کھڑا ہے؟

''اورمیں..................'' اس نے سوچا تو دل دھک سے رہ گیا۔''میں کن خیالوں میں کھوچکی ہوں۔'' یہ سوچتے ہی ساری کیفیات، سارے جذبات، خواب کے منظراورالوہی تاثرات، انجانے خوف کے دھماکے سے ختم ہوکررہ گئے۔وہاں صرف میٹھی کسک کا دھواں رہ گیا تھا۔

وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا۔اس کے اندر امنڈتے ہوئے خوف نے سارے منظر ہی بدل کررکھ دیئے۔ارجمند نے اسے دوبارہ دیکھنے کے لیے بے چینی سے ادھرادھر دیکھا مگراس کی نگاہیں خالی ہاتھ لوٹ آئیں۔وہاں ہرطرف لوگ ہی لوگ تھے۔خواتین دوکاندار اورمعزز گاہک، مول تول، قہقہے، باتیں، سرگوشیاں، اسے یکدم کچھ بھی اچھا نہ لگا۔سارے منظر پھیکے ہوگئے تھے۔وہ تنہائی بھری کیفیت سے دوچار ہوگئی۔اتنے بڑے ہجوم میں تنہا۔اس نے اپنی بدلتی ہوئی حالت کے بارے میں سوچا، اپنے من میں جھانک کر دیکھا۔تبھی اس پر آگہی کے لمحے کا انکشاف ہوا۔اس کی خواہش تھی کہ وہ دوبارہ سامنے آجائے، وہی اس کے من کے راج سنگھاسن پر براجمان تھا۔وہ دھیرے سے مسکرادی اوراپنے ٹوٹے منظروں والے

سپنے کی نئ تعبیریں تراشنے لگی۔

......☆......

جاتی ہوئی بہار کی اس شام دریائے جمنا کی طرف سے آنے والی ہوائیں بھی سرمست تھیں۔شام کے سنگ لپٹی ہوئی ٹھنڈ بھی دھیرے دھیرے اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ گہرے نیلے آسمان پر ستارے بھی ٹمٹمانا شروع ہو گئے تھے۔ اترتے ہوئے اندھیرے کو محل میں روشن قندیلیوں نے شکست دے دی ہوئی تھی۔ اس شام محل کے در دو دیوار نے اتنا حسن، اتنی خوشبو اور اتنی رنگینی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور نہ ہی اس کے ماحول میں اتنا جوش وخروش پہلے کبھی بھرا تھا۔شاہی باغ میں عارضی دکانیں نصب کر دی گئیں تھیں جہاں معزز خواتین نے اپنا سامان فروخت کے لیے رکھنا تھا۔

شہزادہ خرم غسل سے فارغ ہو چکا تھا اور جب اسے خلعت فاخرہ پہنائی جا رہی تھی انہی لمحوں میں اسے شاہی جوتشی کی پیشین گوئی یاد آ گئی۔ سہ پہر کے وقت جوتشی اس کے پاس تھا۔ اس نے پوری توجہ سے شہزادے کی باتیں سنی تھیں۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا تو شاہی جوتشی مسکرا دیا۔ اس وقت وہ دونوں تنہا تھے۔ اس لیے جوتشی نے بلا جھجک کہا۔

''شہزادہ معظم۔! یہ ساری خوش گمانی اس انہونے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس کی تمنا ہر شخص کرتا ہے۔''

''کیا ہے وہ؟''

''یہی کہ آپ محبت کے سحر میں گرفتار ہو جائیں گے اور جس کی محبت میں آپ خوش رہیں گے، وہ بلاشبہ خوش قسمت ہو گا۔ ہوسکتا ہے بہت جلد آپ اپنی ملکہ سے مل لیں۔''

''اگر ایسا نہ ہوا تو......؟'' شہزادے نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر یہ کسی ایسے علاقے کی فتح کی نشان دہی کرتا ہے کہ جو بہت ہی پیچیدہ اور مشکل ترین مہم کے بعد آپ کے ہاتھوں فتح یاب ہو گا۔''

''ایک ہی خیال کی دو تعبیریں کیسے ممکن ہیں؟'' شہزادہ خرم کے سوال میں تجسس سے زیادہ استہزا چھپا ہوا تھا۔ اس پر شاہی جوتشی خاموش رہا تو شہزادے نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اسے پیشین گوئیوں پر کبھی یقین نہیں رہا تھا۔ لیکن ایک عجیب اضطراب اس کے اندر سرائیت کر گیا تھا کہ اگر ایسا ہو گیا تو......! یہ تعبیریں اتنی بری نہیں تھیں کہ اسے پریشانی میں مبتلا کر دیتیں۔

''شہزادہ معظم۔! آپ خاصے مضطرب دکھائی دے رہے ہیں؟'' خدمت گار رضا نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرادیا۔تب وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔

''رضا۔! مجھے بتاؤ، میں شاہی مینا بازار میں خریداری کیسے کروں؟''

''یہ اتنا مشکل تو نہیں ہے شہزادہ معظم ۔! جس طرح عام بازروں میں اور گلیوں میں اپنا مال فروخت کرنے والی عورتیں اوران کے گاہک مول تول کرتے ہیں یہ خواتین بھی ایسا ہی کریں گی۔''

''کچھ نہ کچھ فرق تو ہوگا؟''

''جی حضور! وہ لوگ تو اپنی روزٹی روزی کے لیے محنت ومشفقت کرتے ہیں لیکن شاہی مینا بازار میں خواتین اور معززین محض تفریح،لطف اورانبساط کے لیے آتے ہیں۔اصل میں یہاں وہی کامیاب تصور کیا جاتا ہے جو دوسرے کا دل جیت لے،اب چاہےتو دوکاندارا پنے گاہک کا دل جیت لے یا گاہک کسی دوکاندار کا۔یہاں اجنبیت شناسائی میں ڈھلے گی، یہی شناسائی کسی بھی تعلق کی بنیاد بنے گی جوآگے چل کرکسی بھی ناطے یا رشتے داری میں تبدیل ہوسکتی ہے۔معزز خواتین اس بات کا خاصا اہتمام کرتی ہیں کہ ان کی بیٹیاں،ان سے بھی کسی بڑے خاندان میں بیاہ کر چلی جائیں۔مائیں اپنی بیٹیوں کو وہ سارے ہنراور گرسکھاتی ہیں، نازفخر کے انداز بتاتی ہیں، ماہر مشاطائیں انہیں خصوصی اہتمام کے ساتھ تیار کرتی ہیں پھر وہ پورے تزک واحتشام کے ساتھ یہاں موجود ہوتی ہیں۔ان کی کوشش ہوتی ہے کہ یہاں پرآنے والے معززین کواپنی جانب متوجہ کرلیں۔اوراسی طرح یہ معززین بھی اپنے ذہن میں ایسے ہی ارادے رکھ کرآتے ہیں۔وہ پوراسال انتظار کرتے ہیں اوراس ایک شب میں حاصل کی گئی خوشگواریت،خواتین کی جانب سے کرم فرمائیاں، چھوٹی چھوٹی فتوحات،میٹھی باتوں کے ذائقے،حسین چہروں کی من میں گدگدی کرتے رہنے والی یادیں اوراپنی کامیابیوں کو پوراسال یادکرتے ہیں۔یہ رات انہیں لازوال یادیں فراہم کرتی ہے۔''

''رضا۔!تمھیں تو بہت ساری معلومات ہیں۔'' سدا سے آگہی کا شائق شہزادہ خرم بہت خوش ہوا۔لونڈیوں نے اس کے سر پر مساج ختم کیا تو رضا نے اس کی دستار اٹھا کراس کے سر پر رکھ دی۔شہزادے نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اورنشست گاہ کی جانب جانے کے لیےاٹھ کھڑا ہوا۔

وہ شاہی مینا بازار کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔لیکن اسے کوئی عملی تجربہ نہیں تھا۔خریداری کی خواہش تو اب

پس منظر میں چلی گئی تھی۔اسے تو کئی اور طرح کے خیالوں نے گھیر لیا تھا۔وہ عورت کے جسم سے آشنا تھا۔اس کی خدمت کے لیے کنیزیں تھیں۔تفریح طبع کے لیے حسین اور نازک اندام رقاص لڑکیاں تھیں۔حسین ترین جسم اس کی دسترس میں تھے مگر وہ اس کے لیے ذراسی بھی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ان سب میں اگر محبت کا کوئی پہلو تھا تو وہ صریحاً مصنوعی تھا۔احترام میں خوف، وفاداری میں جاہ وحشمت کی خواہش اور محبت میں لالچ چھپا ہوا تھا۔وہ بذات خود کسی ایسے انہونے تجربے سے گزرنا چاہتا تھا۔جس سے اسے اپنے بارے میں معلوم ہو جائے کہ اس کا مقام کیا ہے؟ وہ خواتین کے لیے کس قدر خوشگوار کشش رکھتا ہے؟ کیا اس کی شخصیت میں بھی کوئی جمالیاتی پہلو کا احساس کرتا ہے؟ اور وہ محبت جو خالص ہوتی ہے۔فطری احساس اور الوہی کیفیات رکھتی ہے جس کی خاطر لوگ اپنی جاں سے بھی گذر جاتے ہیں۔جس میں آبشاروں سی پاکیزگی، پھولوں کی نزاکت، دریاؤں کی طرح روانی، چاندنی جیسی سحر انگیزی اور ہواؤں کی مانند لطافت ہو۔وہ محبت جس کے احساس اگر کہہ دیئے جائیں تو وہ شاعری بن جائے۔جس کے ہونے سے من بھی عبادت گاہ بن جائے۔جس کے ہونے سے انسان فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔رت جگے منظروں میں ڈھلتے ہیں۔آگہی کے راز کھلتے ہیں۔من وتو کے تکلفات مٹ کر دھواں ہو جاتے ہیں۔وہ محبت اس کے لیے محض ایک خیال کی صورت تھی۔اسے اگر محبت کا عکس دکھائی بھی دیتا تھا تو محض صحرا میں سراب کی مانند تھا۔وہ تلاش محبت میں سرگرداں تھا؟ متلاشی تھا، پیاسا تھا؟

جب وہ نشست گاہ میں داخل ہوا تو اس کی نگاہ سعد اللہ خان پر پڑی۔جو اس کے چند دوستوں میں سے ایک تھا۔ اس کا تعلق طبقہ امراء سے تھا۔خرم کے شاہی مینا بازار میں جانے کے لیے اسے خصوصی طور پر بلوایا گیا تھا۔وہ اسے دیکھتے ہی تعظیم سے اٹھ گیا۔خرم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔وہ بھی شاندار لباس میں تھا۔

''تو آپ بھی سعد اللہ خاں خوب تیاریوں میں آئیں ہیں، کسی کو اپنا بنانا ہے یا کسی کا بن جانا ہے؟'' خرم نے معنی خیز انداز میں کہا تو وہ بھی مسکرادیا پھر نپے تلے انداز میں بولا

''یہ تو نصیب کی بات ہے، کس کی جھولی کس شے سے بھر جائے۔''

''بہت خوب۔'' شہزادہ خوش ہو گیا۔تب بالکونی کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے کہا'' آؤ دیکھیں تیاریاں کہاں تک پہنچی ہیں۔''

سعد اللہ خان اور خدمت گار رضا اس کے پیچھے بالکونی میں جا کھڑے ہوئے جہاں سے شاہی باغ دکھائی دے رہا

تھا۔ وہاں کا منظر دیدنی تھا۔ سال بھر ان لمحوں میں وہاں سناٹا ہی راج کیا کرتا تھا۔ بس صبح کے وقت اس جھروکہ سے باغ کا منظر نہ صرف اس کی روح تک کو تازگی دے دیتا تھا بلکہ معطر ہوا اس کو سرشار کر دیتی تھی۔ اس وقت وہاں ہجوم تھا۔ شاہی باغ روشن تھا۔ طاقوں میں قندیلیں روشن تھیں۔ ہر درخت اور وہاں پر بنائی گئی عارضی دوکانوں پر ہزاروں کی تعداد میں لالٹین جل رہی تھیں۔ ان سب کی جگمگاہٹ میں فوارا آبشار نور لگ رہا تھا۔ وہاں سے لوگوں کے چہرے تو دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر ہوا کے دوش پر آنے والے ہلکی آواز میں قہقہے ضرور سنائی دے رہے تھے۔

''سعد اللہ خاں۔! ہمیں شاہی مینا بازار میں کس وقت جانا چاہیے؟'' خرم نے اس منظر پر نگاہیں ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

''میرے خیال میں ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ بازار کی رونقیں ابھی مزید بڑھ جائیں، کچھ گرما گرمی بڑھے تو چلیں۔''

اس نے کہا تو شہزادہ واپس پلٹ آنے کے مڑا۔ تبھی باغ میں سے شاہی نقارہ بجنے کی آواز سنائی دی۔ جس کا واضح مطلب تھا کہ شہنشاہ شاہی مینا بازار میں پہنچ چکا ہے۔ تھوڑی دیر بعد شہنشاہ جہانگیر درباریوں، مصاحبوں اور معززین کے جلو میں دکھائی دیا۔ وہ انہیں دیکھتا رہا۔ کچھ دیر تک وہ قافلہ یونہی چلتا رہا۔ ایک لمحہ کے لیے خاموشی چھا گئی۔ وہ جس طرف سے بڑھ رہا تھا لوگ اس کی تعظیم کے لیے جھک رہے تھے۔ یہاں تک کہ شاہی نقارہ خاموش ہو گیا۔ وہ سبھی لوگ شاہی مینا بازار میں پھیل گئے۔

''سعد اللہ۔ آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے، ہمیں تھوڑی دیر انتظار کر لینا چاہیے تا کہ عالم پناہ وہاں سے چلے جائیں۔'' خرم نے ہیجان خیز انداز میں کہا اور واپس پلٹ کر مسند پر آ بیٹھا۔ وہ دونوں بھی اس کے سامنے پڑی نشستوں پر آ بیٹھے۔ وہ وہاں بیٹھے شکار اور دیگر مہمات کی باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ کافی وقت بیت گیا۔ تب وہ نیچے باغ کی طرف جانے کے لیے اٹھ گئے۔

شاہی مینا بازار سچ مچ کا بازار دکھائی دے رہا تھا۔ حسین اور خوبصورتی میں بسیں خواتین اپنی اپنی دکانیں سجائے بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے مختلف ممالک سے آئے کپڑے جیسے ڈھاکہ کی ململ، ایرانی ریشم، زیورات کے ڈبے، طلائی و نقرئی منعقش ساز و سامان، خوشبویات، ہاتھی دانت سے بنی منصوعات، قیمتی پتھر اور سامان آرائش پڑا ہوا تھا۔ فضا میں قہقہے، باتوں

کی مٹھاس اور موسیقی کی تانیں گھلی ہوئیں تھیں۔اس کے ساتھ سعد اللہ خان تھا پیچھے خدمت گار خاص رضا چلا آ رہا تھا۔وہ باغ میں داخل ہوئے تو کتنی ساری خواتین کی نگاہیں ان کی جانب اٹھ گئیں۔ایک خاتون نے تو بڑے دلار سے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔اس کی اس دعوت سے لگتا تھا کہ جیسے وہ اس کی ساری چیزیں خرید لیں گے۔انہوں نے ایک لمحہ کو اس کی طرف دیکھا اور باوقار انداز سے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔اسی دوران سعد اللہ خاں کسی اور طرف نکل گیا اور وہ تنہا رہ گیا۔خدمت گار رضا اس سے قدرے ہٹ کر چل رہا تھا۔وہ جس طرف بھی جاتا تھا خواتین اسے دیکھ کر پر جوش ہو جاتی تھیں۔یہاں تک کہ آوازیں بھی لگا رہی تھیں۔

''یہ دیکھیں کس قدر بڑھیا مال ہے۔بہت ہی سستا ہے، زیادہ مہنگا نہیں۔خصوصی طور پر شہزادہ خرم کے لیے، یہ ایرانی ریشم دیکھیں، یہ بنگال سے آیا ہوا ململ...... یہ چینی گل دان دیکھیں......''

وہ اپنا سامان بیچنے کے لیے اس قدر سرگرم تھیں کہ جیسے اس میں ہی ان کی روزی روٹی ہے اور وہ یہاں پر محض تجارت کرنے کے لیے آئی ہیں۔خرم کے لیے ان چیزوں میں کوئی کشش نہیں تھی۔اس کے پاس اس سے بھی اعلیٰ درجے کی اشیاء تھیں۔یہاں آتے ہی اس کا جمالیاتی ذوق اور حسن پرستی عود کر آئی تھی۔اس کی نگاہ میں چہرے تھے جو بہت کم اس کی نظر میں جچے تھے۔ان میں زیادہ تر جوان عورتیں اور قدرے نوعمر لڑکیاں تھیں۔بازار میں گرما گرمی کے باعث بہت شور مچا ہوا تھا۔ وہاں موجود خواتین یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے پرندوں کو قفس سے آزاد کر دیا گیا ہو اور وہ اپنی مرضی سے باغ میں چہچہاتے پھر رہے ہوں۔مختلف آوازیں، مختلف بولیاں، جاندار قہقہے، رسیلی باتیں، خوشگوار، حسن، معطر فضا پر جوش جذبے، رنگین سماں، وہ کھو گیا تھا۔

اسی لمحۂ جاوداں میں وہ ساکت ہو کر رہ گیا۔روشنی تھی یا رنگ و نور کا سیلاب، جس نے اس کے حواس مختل کر کے رکھ دیئے تھے۔معصومیت کی چادر میں لپٹا ہوا الوہی حسن، جس نے اس کی پوری توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔ساری آوازیں کہیں تحلیل ہو گئیں تھیں اور اسے لگا جیسے اس روئے زمین پر صرف وہی ہے اور اس کے سامنے وہ دلربا حسن۔اس کی تمام تر کیفیات ہی بدل گئیں۔لمحے اس سے سرگوشیاں کرنے لگے۔خوشبوئیں اس کے طواف میں لگ گئیں۔پاکیزہ جذبات نے اس کا دامن تھام لیا۔اسے اپنے من کی خانقاہ میں صندل سلگتا ہوا محسوس ہوا۔ہزاروں کلیوں کی چٹک سے اس کی روح سرشار ہو گئی۔شاخ محبت پر عشق کے پرندے نے آن بسیرا کیا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ کوئی جادوئی نغمہ چھیڑتا وہ الوہی حسن بھی اس کی

جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ خاموش اور تنہا کھڑی تھی۔ اس سارے تماشے سے بے نیاز۔ اس کے حسن میں سچائی تھی۔ بیضوی چہرہ، بڑی بڑی دل نشیں آنکھیں، گلاب پنکھڑیوں جیسے ہونٹ، سیاہ چمکتے ہوئے دراز گیسو جن میں تازہ موتیے کی لڑی پروئی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں حیا بار تھیں اور وہ بڑے خوشگوار انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ کی نرمی اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی جو بہت کم عورتوں کے نصیب میں ہوتی ہے۔ وہ سارے ہجوم سے الگ تھلگ اور منفرد تھی، جیسے وہ اس تماشے کا حصہ نہ ہو محض وہاں پر تماشائی کی حیثیت سے موجود ہو۔ شہزادہ خرم نے بہت غور سے اسے دیکھا تھا۔ اس کے من نے گواہی دے دی تھی کہ اس حسن میں مصنوعی پن نہیں ہے۔ وہ حسن، جو صرف عشق کی دستک پر دل کا دروازہ کھولتا ہے۔ فقط آوازۂ عشق ہی اسے اپنی جانب متوجہ کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی بھی لالچ اس کی توجہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کے دل کی دھڑکن اس وقت انتہائی تیز رفتار ہوگئی جب اس حسن بے مثال نے اس کی جانب توجہ کی تھی۔ وہ بے نیازی سے مڑی تھی اور یونہی بے ساختہ اس پر نگاہ پڑی تھی اور پھر وہ ساکت سی ہوگئی تھی۔

وہ شہزادہ خرم جس کی صلاحیتوں کا معترف ایک زمانہ تھا۔ جس کی بہادری اور دلیری میں اک نام تھا۔ جسے مغلیہ سلطنت پر حکمرانی کے لیے چن لیا گیا تھا، وہ خطرات پر قابو پانے کی جرأت رکھتا تھا۔ اک مہین سے خیال کے آتے ہی خوف زدہ ہوگیا۔ اسے اپنی سانس اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کہیں یہ حسن بے مثال بھی رعب شہزادگی میں نہ آجائے؟ اسے احساس تو تھا کہ وہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ اس کے پاس دکھاوے کی محبت نہیں ہوسکتی۔ ورنہ اس کے حسن میں پاکیزگی کا تاثر نہ جھلکتا۔ خالص محبت رکھنے والے اس گوہر نایاب کو آلودہ نہیں ہونے دیتے، یہی فطری سچائی ہے۔ وہ خوف کی دھند میں لپٹا ہوا اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اور وہ قدرے حیرت میں ڈوبی اسے پہچاننے کی کوشش کررہی تھی۔ کہیں وہ مجھے پہچان نہ لے؟۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے دل پر جبر کیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ چند قدم کے بعد آگے جا ہی نہیں سکا۔ اسے وہ سارا تماشہ انتہائی پھیکا لگنے لگا تھا۔ وہ ایک لمحہ کو ٹھہرا اور پھر پلٹ کر اس کی دوکان کی جانب بڑھ گیا۔

اس کی دوکان پر بیچنے کے لیے چاندی کا زیور پڑا ہوا تھا جو بہت تھوڑا سا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کے عقب میں مدد کے لیے ایک دبلا پتلا سا لڑکا کھڑا تھا خرم اس کی دوکان کے سامنے جا کر رک گیا۔ اس نے خمار آلود نگاہوں سے خرم کی جانب دیکھا اور خاموش رہی۔ خرم کے دل میں کہنے کے لیے اتنا کچھ تھا کہ اسے خود سمجھ نہیں آرہی تھی کہ پہلے کیا کہے، لیکن جب اس نے کچھ کہنا چاہا تو لفظ گنگ ہوگئے۔ وہ چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر دھیرے

سے بولی۔

''فرمایئے۔!'' دھیرے سے کہے گئے اس لفظ میں دنیا بھر کی سحر انگیزی تھی۔ اتنا اعتماد کہ اس کے لفظوں کو بھی گویائی نصیب ہوگئی۔

''پتہ نہیں تم خواب ہو یا حقیقت، مگر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جیسے میں نے تمہیں چھوا ہے، کیا تم نے بھی ایسا ہی کچھ محسوس کیا ہے؟'' خرم نے وہ بات کہہ دی جو اس کے من سے ابھری تھی۔ وہ خاموش رہی تو اس نے پوچھا ''تمہارا کیا نام ہے؟''

''ارجمند بانو۔! شہزادہ معظم۔''

''تو کیا تم مجھے پہچانتی ہو!'' ایک لمحہ کو اس کا اعتماد ڈانواں ڈول ہوگیا۔

''جی ہاں! آپ شہزادہ خرم ہیں، جو سلطنت ہند کے ولی عہد کی حیثیت سے چن لیے گئے ہیں'' وہ دھیرے سے بولی۔ اس کا لہجہ احترام میں لپٹا ہوا تھا۔ لیکن کہیں بھی خوشامد کی آلائش نہیں تھی۔

ارجمند۔! جس قدر تمہارا حسن قیامت خیز ہے اسی طرح تمہاری آواز بھی سحر انگیز ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکا اور پھر بولا ''میں نے تم سے یہ پوچھا تھا کہ تم نے بھی ایسا ہی محسوس کیا تھا جیسے میں نے کیا ہے۔''

''ارجمند نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔'' چاندی کا یہ زیور بہت اچھا ہے کیا آپ اسے خریدنا چاہیں گے؟''

''مگر میں نے ایک سوال کیا ہے؟'' خرم نے ضدی لہجے میں پوچھا تو ارجمند بولی۔

''کیا میں اسے ایک شہزادے کی ضدی خواہش سمجھ لوں؟ آپ یہاں پر ایک گاہک کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔'' ارجمند نے اسے سرزنش ملے لہجے میں جواب دیا۔

''کوئی من چاہا مل جائے تو اس سے دل کی باتیں کہنے کو بھی دل چاہتا ہے۔'' شہزادہ خرم نے پورے اعتماد سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر اجنبی نہیں، دل کی باتوں کے لیے تو بااعتماد ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ تو ہم دل کی باتوں کی توہین کریں گے۔''

''بہت خوب۔! مگر اے نازنیں، میرا سوال ابھی تک تشنہ جواب ہے۔''

''ایسا تو انہی لمحات میں محسوس ہوتا ہے جب کشش کے مدار میں انسان آ جائے۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ ایسی صورت حال ہو کہ جیسے آئینے کے سامنے رکھ دیا گیا ہو۔'' ارجمند نے کھوئے ہوئے انداز میں دھیرے سے کہا اور حیا سے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ چراغ محبت کی لو بڑھانے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ شہزادے کے دل میں روشن ننھی سی جوت بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ اسی وقت اس نے اپنے من کی کیفیت بدلتی ہوئی محسوس کی جیسے برسوں بعد صحرا میں بارش کے قطرے امنڈ آئیں اور ریت کی فطری مہک چاروں جانب پھیل جائے۔ شہزادہ خمار سے بھر گیا۔ اس نے میٹھی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لفظ بڑے ہی اثر انگیز ہیں۔''

''لفظ اثر انگیز ہی ہوا کرتے ہیں شہزادہ معظم۔'' ارجمند نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا اور بڑے وقار سے مڑ کر ہجوم پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ اس کی یہ ادا شہزادہ خرم کے دل میں اتر گئی۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

''کیا جذبات اور احساسات بھی لفظوں کے محتاج ہوتے ہیں؟''

''یہ تو ان جذبات اور احساسات کے خالص پن اور سچا ہونے پر منحصر ہے۔ کیونکہ سچائی اور خالص پن ہی انسانی جذبات اور احساسات کو قوت بخشتے ہیں۔ کیا سلگتے ہوئے خالص صندل اور نیم میں کوئی فرق نہیں، ان کا دھواں ان کی اپنی حقیقت حال بیان کر دیتا ہے۔ ابلاغ ہوتا ضرور ہے، چاہے لفظوں میں ہو یا رویئے سے۔ حقیقت تو صندل اور نیم کے سلگنے سے اٹھنے والے دھوئیں میں ہے۔'' ارجمند نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ شہزادہ خرم دربار حسن میں باادب کھڑا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ لاشعوری طور پر بولا۔

''میں بے سکون ہو گیا ہوں ارجمند بانو۔! مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میں خواب ناک کیفیت میں ہوں تمہارا حسن مجھے گھائل کر چکا ہے۔ یہ زخم ایسا ہے کہ جس کی ٹیس میدان جنگ میں لگنے والے زخم سے کہیں مختلف ہے۔ اور محبت تو ایک ایسی جنگ ہے جس میں کوئی بھی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا، بس محبت کے ہاتھوں انسان مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے۔

''نہیں شہزادہ معظم۔! محبت میں انسان کو ناتواں نہیں ہونا چاہیے۔ محبت بذات خود جنگ نہیں مگر ایک معرکے کی محرک ضرور ہے۔ جس قدر من میں محبت ہوگی، اتنی ہی جدوجہد میں شدت ہوگی۔ خواب اور حقیقت میں محض سوچ کا فرق

ہے۔‘‘

’’ارجمند۔! یہ محبت کی لطافت نہیں کہ ایک وجود انسان کو خوابوں کی دنیا میں پہنچا دے؟ کیا یہ حسن کی کرشمہ سازیاں نہیں؟ میرا من تو یہی چاہ رہا ہے کہ میں یہاں بیٹھ جاؤں اور پھر صدیوں تک تمہیں دیکھتا رہوں۔ جب تک مجھے خواب اور حقیقت کے درمیان فرق محسوس نہ ہو جائے۔‘‘ شہزادہ خرم نے زندگی سے بھر پور لہجہ میں نشاط انگیز انداز میں کہا تو وہ ہنس دی۔ تب اسے یوں لگا جیسے کوئی اجنبی محبت بھری موسیقی اس کے کانوں میں رس گھول گئی ہو۔ اس قہقہے نے اس کے چہرے پر سرخی پھیلا دی تھی۔ تب اس نے کہا۔

’’ابھی تو ایک عمر پڑی ہے شہزادہ معظم، یوں کسی اجنبی کے لیے اپنی زندگی گنوا دینا، کہاں کا خوبصورت پن ہے۔‘‘

’’ہماری زندگی میں کیا خوبصورتیاں ہو سکتی ہیں؟ یہی نا کہ من چاہی مرادیں مل جائیں۔ اصل خوبصورتی یہ ہے کہ کسی شے کے بارے میں کوئی انسان یہ خیال کرے کہ وہ بہت طویل جدوجہد کے بعد ملے گی۔ ملے گی بھی یا نہیں تب وہ شے اچانک سامنے آ جائے۔‘‘

’’آپ نے مجھے چند لمحوں کے لیے دیکھا ہے جبکہ یہاں اس شاہی مینا بازار میں حسن بکھرا پڑا ہے جو مجھ سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ انہیں............‘‘

’’نہیں۔! ارجمند بانو نہیں۔! کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہاری ناک کا یہ خم، تمہاری آنکھوں کی مست مست گہرائیاں، تمہارے یہ لذت انگیز ہونٹ، یہ دھوپ جیسی پیشانی، یہ نرماہٹوں سے بھرے ہوئے گال، یہ تمہارے اوپری لب اور ناک کے درمیان چمکتے ہوئے ننھے منے ہیرے، یہ تمہاری تراشی ہوئی گردن...... کیا یہی حسن ہے؟ نہیں بلکہ اس میں جو ماورایت ہے۔ اسے میں محسوس کر رہا ہوں۔ ایسی ماورایت جو مجھے کہیں نہیں ملی۔ اسی سے ہی مجھے یہ راز ملا ہے کہ میں تمہیں صدیوں سے جانتا ہوں، تمہیں دیکھ کر یوں لگا جیسے میں نے تمہیں چھو کر نرماہٹوں بھرا لمس محسوس کیا ہے۔ پھر اس قدر احساس کے بعد بھی تشنہ ہوں، اتنی پیاس کبھی شدت سے نہیں بھڑکی تھی کہ میں تجھے جان لوں، تجھے سمجھ لوں، تجھے پا لوں، یہ میرے لیے عطیہ خداوندی ہے کہ اس شام میں نے تمہیں دیکھ لیا۔‘‘

’’آپ شہزادے ہیں اور آپ کے احساس و مشاہدے عام انسان سے زیادہ نازک اور گہرے ہو سکتے ہیں۔ میں آپ کی معترف ہوئی کہ بلاشبہ آپ ولی عہد کے رتبے پر ہیں تو یہ آپ کا حق تھا۔‘‘

ارجمند نے انتہائی گبھراہٹ میں خود پر قابو پاتے ہوئے شہزادے کی جذباتی کیفیات کو کسی اور راستے پر ڈالنا چاہا ورنہ وہ خود اندر سے پگھلتی جارہی تھی۔حیا کے حصار میں کھڑی وہ بے خود ہورہی تھی۔شہزادے کی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی محبتیں ،تیز چمکتی ہوئی روشنی کی طرح اس کے گرد ہالہ بنارہیں تھیں۔اسے لگا جیسے وہ ان دیکھے حصار میں قید ہوتی چلی جارہی ہے۔ اسے خرم نے محسوس کرلیا اور کہا۔

''ارجمند۔! کیا تم فرار چاہتی ہو۔؟ تم نے چھوئے بغیر اپنی گرمئ احساس کا پتہ مجھے دے دیا ہے۔دور ہونے کے باوجود تم نے میرے دل تک رسائی حاصل کر لی ہے۔تمہاری پوشیدہ محبت مجھ پر آشکار ہو چکی ہے۔میں اظہار کا طلب گار نہیں لیکن خواب کو حقیقت میں بدلنے کی سعی تو کرسکتا ہوں۔اور بقول تمہارے محبت ہی میری اس جدو جہد کا محرک ہوگی۔''

''حضور۔! میرے لیے شاید انتہائی مشکل ہو۔''

ارجمند نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا تو خرم کے من کی دنیا بھی ڈوبنے لگی۔ چراغ امید کی لو پھڑ پھڑانے لگی۔وجد آفریں احساس کے بادل بن بارش کے چھٹنے لگے۔

''کیا اسی وجہ سے کہ میں شہزادہ ہوں۔؟''

خرم نے بھنور کی طرف بڑھتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''ایک اچھا انسان تو صرف انسان ہوتا ہے۔عام یا حکمران ہونا تو الگ صفت ہے۔''

ارجمند نے لفظوں کے سہارے اپنا مدعا کہہ دیا۔خرم ان کے معانی میں کھو گیا۔جس قدر وہ گہرائی میں انہیں سوچتا جا رہا تھا۔اسی قدر محبت عود کرآرہی تھی۔چشمے کے اس پانی کی طرح کہ جس قدر دباؤ میں ہوتا ہے اس قدر ابلتا ہوا زمین پر پھیل جاتا ہے۔تبھی بے ساختہ خرم کے منہ سے نکل گیا۔

''تم......ارجمند تم ،میرا انتخاب ہوسکتی ہو۔''

اچانک کہے گئے ان لفظوں میں تیرتی ہوئی جذباتی خواہشوں نے اسے سرشار کر کے رکھ دیا۔ارجمند اپنی پوری آنکھوں سے مسکرادی۔وہ لمحۂ جاوداں جس میں وقت ٹھہر جاتا ہے اور انسان اپنے وجود سے بھاری ہو کر بے وزنی کی کیفیت میں آجاتا ہے۔لفظ گنگ ہو کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ہوائیں ششدر رہ جاتیں ہیں۔زمانے کا ادراک بے معنی ہو جاتا ہے۔ارجمند کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ارد گرد دوکاندار خواتین ،شہزادہ خرم کے ہونے کا شدت سے احساس کررہی تھیں۔ارجمند

کی معنی خیز مسکراہٹ نے سبھی سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔

''میرا انتظار کرنا ارجمند، یہ میری خواہش ہے۔''

خرم نے کہا اور اس کے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ جہاں گلاب مہک اٹھے تھے۔ ارجمند کے لیے اس لمحۂ جاوداں میں اپنا وجود سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری ہو گیا۔ بہت ممکن تھا کہ اس محبت کی بارش میں وہ پور پور تک بھیگ کر ہوش کھو دیتی، اس نے بڑی تیزی سے خود پر قابو پایا شاید اس کا لاشعور اسے مسلسل سمجھا رہا تھا کہ ان گنت آنکھیں ان پر لگی ہوئیں ہیں جو مسلسل ان کی طرف دیکھتی چلی جا رہی ہیں۔

''کیا آپ یہاں سے کچھ نہیں خریدیں گے۔'' ارجمند نے کہا۔

''یہ زیور تو خواتین پہنتی ہیں اور............''

''لیکن کسی خاتون کی طرف سے نشانی بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس زیور میں اتنی تو صلاحیت ہو گی کہ آپ کو اس مینا بازار کی یاد دلاتی رہے۔ کیا آپ یہاں سے خالی ہاتھ لوٹ جانا پسند کریں گے؟''

ارجمند نے خرم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ خوشگوار حیرت میں ڈوب گیا۔ ارجمند نے اس کی خواہش کا کس قدر خوبصورت جواب دیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے انتہائی خوشی میں پوچھا۔

''ہاں، بلاشبہ یہ زیور مجھے یاد دلاتا رہے گا لیکن اس کے عوض جو میں قیمت ادا کروں گا اس میں کیسی صلاحیت ہو گی؟''

ارجمند مسکرا دی، وہ خرم کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ تب اس نے کہا۔

''یہ تو آپ کی جانب سے دی گئی قیمت پر منحصر ہو گا کہ وہ اپنے اندر کتنی دیرپا صلاحیت رکھتی ہے۔''

''پھر بھی۔!'' خرم نے یونہی پوچھا۔

''میں اس رقم کو غریبوں کے لیے مختص کر دوں گی۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''غرباء کے لیے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا

''ہاں۔! ان غرباء میں جن پر توجہ کے لیے آپ کے پاس وقت نہیں ہوتا اور یہ غرباء محل سے باہر زندگی بسر کرتے ہیں۔''

''مگر تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہیں......''اس نے وجد آفریں لہجے میں کہا اور پوچھا''یہ کتنے کا ہے؟''

''جتنے کا آپ اندازہ لگائیں۔''ارجمند نے شرارت سے کہا۔

''چلو ہمارے درمیان سودا طے ہو چکا۔''شہزادہ خرم نے ہاتھ کے اشارے سے دور کھڑے رضا کو بلاتے ہوئے کہا۔اگلے ہی لمحے خدمت گار رضا طلائی سکوں سے بھری تھیلی کے ساتھ اس کے پاس موجود تھا۔اس نے وہ تھیلی پکڑی اور دوکان پر اس جگہ رکھ دی جہاں چاندی کا وہ تھوڑا سا زیور پڑا تھا۔ارجمند نے وہ تھیلی اپنے عقب میں کھڑے عیسیٰ کو تھما دی اور خود گہرے سبز رنگ کے اس ریشمی پارچے میں چاندی کا زیور باندھ دیا جو طلائی تاروں سے کڑھا ہوا تھا۔

ارجمند نے وہ زیور شہزادہ خرم کی طرف بڑھایا۔انگلیوں کی پوریں ایک دوسرے سے ملیں تو دونوں نے خود میں ایک الوہی ارتعاش محسوس کیا۔ارجمند نے حیا سے آنکھیں جھکا لیں۔تب خرم نے کہا۔

''تم سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔''

''میں انتظار کروں گی۔''

پھر وہ کچھ نہیں بولا،محض اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا،جیسے وہ اس کے حسن کو اپنی آنکھوں میں گھول رہا ہو۔ارجمند نے شہزادہ خرم کے چہرے پر لکھے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی تو وہ گھبرا گئی اور ایک بار پھر حیا سے آنکھیں نیچی کر لیں۔

......☆......

ارجمند نے چند لمحوں بعد اپنی حیا بار آنکھیں اٹھائیں تو خرم وہاں نہیں تھا۔فطرتی طور پر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے کھڑا رہے اور نہ ختم ہونے والی باتیں دراز ہوتی رہیں۔یہاں تک کہ باتیں ختم ہو جائیں اور خاموشی ان کے درمیان زبان بن جائے۔وہ نوائے احساس سے گفتگو کرتے چلے جائیں۔اب وہ اس کے سامنے نہیں تھا مگر اس کی موجودگی کا احساس مہک رہا تھا۔اس نے نگاہیں ادھر ادھر دوڑا کر دیکھا،وہ اسے دکھائی نہیں دیا۔شاید اس ہجوم میں کھو گیا تھا۔تبھی اس کے من سے کھو جانے کا احساس ابھرا۔وہ ایک دم سے گھبرا گئی۔انہی لمحوں میں اس پر یہ راز کھلا کہ خواب اور حقیقت میں کس قدر فرق ہوتا ہے اور ان کے تاثرات کتنے مختلف ہوتے ہیں۔جتنی تیزی سے اس کے اندر خرم کے کھو جانے کا احساس ابھرا تھا۔اتنی تیزی سے یہ خیال اس کے من میں سائے کی مانند پھیل گیا کہ وہ اب کہیں،کسی اور دوکان پر،کسی اور لڑکی کے سامنے کھڑا اس طرح کی گفتگو نہ کر رہا ہو،جیسے وہ ابھی کچھ دیر پہلے اس سے کر رہا تھا؟ وہ چند لمحے اس کیفیت میں رہی۔تب اس

سے رہا نہیں گیا۔اس نے عیسیٰ سے کہا۔

''عیسیٰ۔! جاؤ، دیکھ کر آؤ۔ شہزادہ کدھر گیا ہے؟''

''جی بہتر آقازادی۔'' اس نے جھک کر کہا اور حکم کی تابعداری میں فوراً ہی چلا گیا۔ وہ وہاں پر اکیلی رہ گئی۔ اس کے سامنے طلائی سکوں کی بھری ہوئی تھیلی پڑی ہوئی تھی۔ مگر اس کا دھیان اس تھیلی کی طرف نہیں تھا۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ شہزادہ اب مینا بازار میں نہیں ٹھہرے گا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے اندر اٹھنے والی وہ کسک یاد آئی جب اس کی نگاہ شہزادہ خرم پر پڑی تھی۔ وہ بے سکون سی ہوگئی۔ وہ کچھ بھی نہ چھپا سکی تھی۔ نہایت کوشش کے باوجود، اس کی کسک خرم پر عیاں ہوگئی تھی۔ وہ جس قدر سوچتی اس کے من میں صندل سلگتا رہا، جس کی مہک سے وہ خمار آلود ہوگئی۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنے اردگرد دیکھا اس کی نگاہوں میں بہت ساری عورتیں آئیں، جو اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں رشک، حسد، اشتیاق اور نجانے کیا کچھ تھا۔ اسے لگا کہ اس شاہی مینا بازار میں بھڑکنے والی چنگاری کی حدت بے شمار لوگوں نے محسوس کی ہے، اگر یہی چنگاری آگ بن گئی تو اس کی رسائیاں کہاں تک ہوں گی۔ وہ عورتیں اس شخص کو محض شہزادہ خرم کی حیثیت سے دیکھ رہی تھیں جس کے ساتھ طاقت، دولت اور حاکمیت تھی۔ مگر ارجمند نے ایسا کوئی تاثر نہیں لیا تھا۔ اس کے لیے تو وہ محض ایک عاشق تھا۔ وہ عشق جو حسن پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ وہ بھی اگر شہزادہ خرم کو اسی مرصع آئینے میں دیکھتی تو اس میں اور ان بے شمار خواتین میں کیا فرق رہ جاتا؟

اسے پہلی بار اپنے ہونے کا، اپنے وجود کا اور اپنے حسن کا احساس ہوا تھا، یہی احساس اسے اعتماد بخش رہا تھا۔ جس کی بدولت اسے زعم ہوگیا کہ وہ نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اس کے حسن میں ایسا رس ہے کہ جس سے کسی کو بھی مدہوش کیا جاسکتا ہے۔

''وہ باغ سے چلے گئے ہیں آقازادی۔''

عیسیٰ نے آکر کہا تو وہ اپنے خیالات سے چونکی۔

''کب۔؟''

''جب یہاں سے گئے ہیں، اسی وقت۔'' عیسیٰ یہ کہہ کر ایک لمحہ کو رکا اور پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''یہ بات سرگوشیوں میں پھیل رہی ہے کہ شہزادہ خرم نے فقط آپ کی دوکان سے خریداری کی ہے اور پھر یہاں نہیں رہے۔''

''ایسا کیوں ہے عیسیٰ؟'' ارجمند نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

''وہ خرم ہے۔ سلطنت ہند کا وارث، وہ اب مملکت میں دل کی حیثیت رکھتا ہے۔''

''تم نے ایسے کیسے سوچا؟'' ارجمند کو اس چھریرے بدن والے لڑکے سے ایسی بات کی امید نہیں تھی۔

''ایک خاتون کہہ رہی تھی۔'' عیسیٰ نے کہا تو وہ پرسکون ہوگئی۔ تب اس نے تھیلی عیسیٰ کے حوالے کی اور اپنی ماں کی طرف چل دی جس کے ساتھ لاڈلی تھی۔

رات کے آخری پہر ہوا ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی صبح کے خواب اور شاہی مینا بازار میں خرم کی حقیقت کا موازنہ کر رہی تھیں، کہاں مماثلت ہے؟ یہ بھی اپنے خواب کی نئی نئی تعبیر تراشنے جیسا کھیل تھا جس میں وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔ اس قدر تھکن ہو جانے کے باوجود نینداس کی آنکھوں میں نہیں اتری تھی۔ شاید اب رت جگے اس کا نصیب ہو گئے تھے اور اُمید اس کا وظیفہ تھا۔

وہ دن خاندانِ غیاث بیگ کے لیے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ اس دن شام کے وقت شہنشاہ ہند، نورالدین جہانگیر ان کے ہاں آنے والا تھا۔ سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی بادشاہ وقت کے استقبال کی تیاریاں شروع ہوگئیں تھیں۔ مغل اعظم کا کسی امیر کے ہاں آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ اسے خصوصی پذیرائی تصور کیا جاتا تھا۔ عام رعایا سے لے کر عمائدین سلطنت تک میں اس شخص کو انتہائی قدر و عزت سے دیکھا جاتا تھا۔ جبکہ اس دن شہنشاہ ہند کی غیاث بیگ کے ہاں تشریف آوری اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ وہ اپنے بیٹے، شہزادہ خرم کی آصف خاں کی بیٹی اور غیاث بیگ کی پوتی ارجمند بانو سے منگنی کی رسم ادا کرنے کے لیے آ رہا تھا۔ یہ تاریخ ہندوستان میں عمومی اور مغلیہ خاندان میں خصوصی اہمیت کا واقعہ تھا۔

اس وقت طلوع صبح کی روشنی افق پر پھیل رہی تھی۔ ارجمند اپنے گھر کے باغ میں لگے جھولے پر بیٹھی تھی۔ وہ جھولا مسند کی مانند تھا جس پر تکیہ لگا ہوا تھا مگر اس نے تکیہ سے ٹیک نہیں لگائی تھی بلکہ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی پاؤں لٹکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی گہری بھوری آنکھوں میں گذشتہ دنوں کی یاد جھلملا رہی تھی۔ شاہی مینا بازار کی وہ سحر انگیز شب تو کئی دن ہوئے ماضی میں تحلیل ہو چکی تھی لیکن اس کی یاد، اس کی لطافتیں، جادوئی پن، اس شب من میں اٹھنے والی کیفیات اور شہزادہ

خرم سے کی گئی باتوں کی معنی خیزیاں بالکل تازہ تھیں۔کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا جیسے وہ اب بھی اسی شب کے کسی پہر میں ہے۔ یہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے وہ دکھی نہیں ہوا کرتی تھی کہ وہ شب کسی تتلی کی مانند اس کے ہاتھ سے نکل کر کھو گئی ہے بلکہ وہ خواب اور حقیقت کا فرق سمجھ گئی تھی۔ وہ رات خواب ہوئی اور اس شب سے جنم لینے والی سرگوشیاں حقیقت کی طرح اس سے ملنے لگیں۔''شہزادہ خرم، ارجمند سے محبت کرتا ہے۔'' ہر سرگوشی کا یہی لب لباب ہوتا، جو اسے روح تک سرشار کر جاتا۔ وہ بس چپ چاپ سن لیا کرتی تھی اور اپنے کسی بھی طرح کے ردعمل کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ وہ منتظر تھی کہ شہزادہ خرم اپنی محبت کا اظہار کیسے کرتا ہے؟ اس نے الوداعی لمحوں میں کہا تھا کہ وہ اسے دوبارہ ملے گا۔ اسے خرم کے لفظوں پر یقین تھا۔ اور اس دن اسی یقین کا ثبوت ملنے والا تھا۔ اس کا انتظار رنگ لانے والا تھا۔ وہ جھولے پر بیٹھی اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی گود میں شاعری کی کتاب دھری ہوئی تھی لیکن اس نے ایک بھی شعر نہیں پڑھا تھا۔ ایک محویت کا عالم تھا اور وہ اس میں کھوئی ہوئی تھی۔

''آپ بہت تھکی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں؟''

ایک خادمہ نے اس کے قریب آ کر کہا تو اس کی ساری محویت ٹوٹ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اسی لمحے اس کے اردگرد یہ سبز باغ اُگ آیا ہو اور وہ یہ سارا سبزہ پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

''یہ تمہاری نگاہوں کا دھوکہ ہے ورنہ میں تو بہت سکون محسوس کر رہی ہوں۔'' ارجمند نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خادمہ جھینپ گئی۔ جیسے ایک بڑی غلطی کر بیٹھی ہو۔ تبھی ارجمند نے پوچھا ''کیوں آئی ہو؟''

''آپ کی والدہ محترمہ آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔''

''میں آ رہی ہو۔'' ارجمند نے کہا تو خادمہ تعظیم سے جھک کر واپس چلی گئی۔

اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ابھی واپس جائے۔ وہ ابھی سحر خیزی کی لطافتوں سے لطف اندوز ہونا چاہ رہی تھی۔ اسے اپنا یہ باغ ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔ عہدِ اکبری ہی سے یہ گھر انہیں ملا تھا۔ جس میں بے شمار کمرے اور یہ بہت بڑا باغ تھا جو قلعہ میں موجود شاہی محل کے باغ کی طرز پر بنا ہوا تھا۔ وہی باغ جس میں شاہی مینا بازار منعقد ہوا تھا۔ شہزادہ خرم کے لفظوں نے یقین جیسی دولت سے نوازا تھا۔ یقین۔! ایک ایسی نعمت جس کے ہونے ہی سے انسان خدا کے وجود کو پاتا ہے، اسے اپنے من میں محسوس کرتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اس کی مسکان پھول کی اس پتی کی طرح تھی جو ہوا کے دوش پر

لہراتی ہوئی ساکت جھیل کی سطح پر جا گرے، اس سے ہلکی ہلکی لہریں اٹھیں اوران لہروں میں گہرے پانیوں کی معنی خیزی ہو۔ وہ اٹھی اور باغ سے حویلی کی جانب چل دی۔

غیاث بیگ کے گھر کا ہر فرد شہنشاہ ہند کے استقبال کی تیاریوں میں پورے جوش وخروش سے مصروف تھا۔ کیونکہ مغل اعظم کا آنا کوئی معمولی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے لیے اوراس کے ساتھ آئے لوگوں کے لیے کھانے پینے اور تفریح کا انتظام کرنا تھا۔ اس کے علاوہ شہنشاہ کو پیش کرنے کے لیے تحائف کا چناؤ تھا۔ یہ رسم تھی کہ جس کے ہاں شہنشاہ ہند تشریف لے جاتا وہاں اس کے سامنے تحائف بھی پیش کیے جاتے۔ اب یہ اس پر منحصر ہوتا کہ وہ کیا قبول کرتا ہے اور کیا نہیں۔

اس وقت تمام تر انتظامات اور تیاریوں پر آخری نظر ڈالی جا رہی تھی۔ غیاث بیگ باہر کے لیے کیے گئے انتظامات سے مطمئن ہو کر اندر آیا۔ دیوان عام میں ایرانی قالین پر تحائف رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سونے اور چاندی کی طشتریاں، ساغر، شیشے کے پیالے، گل دان، چینی کے برتن، ہیرے، جواہرات، قیمتی پتھروں کے علاوہ چند نادر و نایاب گھوڑے تھے جنہیں باہر باندھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز ایرانی قالین پر دھری ہوتی تھی جو خصوصی طور پر غیاث بیگ نے شہنشاہ کے مزاج کو دیکھ کر تحفے کے لیے چنی تھی۔ وہ ایک بندوق تھی۔ یہ بندوق اس نے ایک فرنگی ملاح سے خریدی تھی۔ ان دنوں ساحلی علاقوں پر فرنگی ملاحوں کی آمد و رفت تھی۔ وہ مختلف ملکوں سے اپنے جہازوں میں سامان لاتے اور لے جاتے۔ انہی ساحلی علاقوں پر ان کی بستیاں بھی آباد ہو چکی تھیں۔ وہ بندوق شکار کے لیے بہت کار آمد تھی۔ ان تمام تحائف پر ایک محافظ کو نگرانی کے لیے کھڑا کیا ہوا تھا۔

مہرالنساء کے کمرے میں ماحول جوش وخروش سے بھرا ہوا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھی تھی اور ماہر مشاطائیں اس کے سنگھار میں مصروف تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگ چکا تھا اور ایک مشاطہ اس کے بال سنوار رہی تھی کہ عیسیٰ کے اندر آنے کی اجازت کے بارے میں ایک کنیز نے دریافت کیا۔

''ہاں۔! اسے تھوڑی دیر بعد بھیج دو، میں نے اسے بلوایا تھا۔''

مشاطہ بال سنوار چکی تو اس نے کچھ وقت کے لیے تخلیے کا کہہ دیا۔ سبھی خادمائیں اور مشاطائیں کمرے سے باہر چلی گئیں۔ کمرہ خالی ہو گیا تو عیسیٰ اندر داخل ہوا۔ وہ تعظیم سے کورنش بجا لایا اور پھر نگاہیں نیچی کیے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ مہرالنساء آہستگی سے اٹھی اور ایک قد آدم الماری کی جانب بڑھی۔ وہ مقفل تھی۔ مہرالنساء نے اسے چابی سے کھولا اور اس میں

سے ایک ہاتھی دانت سے بنا ہوا صندوقچہ نکالا، جو کپڑوں کی تہہ میں چھپا ہوا تھا۔

''عیسیٰ۔'' اس نے مڑ کر وہ صندوقچہ عیسیٰ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔'' تم نے یہ بادشاہ کو تحفے میں پیش کرنا ہے۔''

''میں......بیگم صاحبہ۔!'' وہ پوری جان سے لرز گیا۔ یقیناً یہ بے حد قیمتی ہوگا جو اتنی رازداری سے دیا جا رہا تھا۔

''ہاں تم......اس کے متعلق کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے اور تم اس کی حفاظت اپنی جان سے بھی زیادہ کرو گے۔''

مہرالنساء نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

''جی بیگم صاحبہ۔! میں اس کی پوری حفاظت کروں گا۔''

''تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا ورنہ تم اپنی جان سے بھی جا سکتے ہو۔'' مہرالنساء نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو عیسیٰ کے بدن میں خوف پھیل گیا۔'' یہ تحفہ تم خود شہنشاہ کو پیش کرو گے۔''

''میں بیگم صاحبہ۔'' عیسیٰ پر مزید حیرت ٹوٹ پڑی تھی۔ خوف سے اس کا پسینہ بہہ نکلا۔'' میں......میری اوقات بیگم صاحبہ۔! میں بادشاہ تک کیسے رسائی حاصل کر سکتا ہوں۔ میں تو ایک ادنیٰ......''

''میں کہہ رہی ہوں کہ تم ہی اسے دو گے۔'' پھر سربمہر صندوقچے کی جانب اشارہ کر کے بولی۔'' اسے کھولنے کی کوشش بھی مت کرنا، اگر ایسا ہوا تو ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوا دوں گی۔'' اس نے انتہائی سرد لہجے میں دھمکی دی۔

''میں پھر کہوں گا بیگم صاحبہ کہ میں اسے یہ تحفہ کیسے دے پاؤں گا۔''

''تم اسے سب کے سامنے یوں دو گے کہ جیسے یہ تمہاری طرف سے ہے۔''

عیسیٰ بری طرح پھنس چکا تھا۔ گردن زنی ان امراء کے لیے تو محض کھیل ہوتی ہے یا پھر سزا دینے کا ایک انداز۔ وہ ایک ایسا غلام تھا جس کا کوئی نہیں تھا۔ اس کی گردن تو ایک مچھر مار دینے کے برابر تھی۔ اگر کسی بھی طرح یہ پتہ چل جاتا کہ یہ تحفہ کس کا ہے۔ یہ راز افشا ہو گیا تو اس کی گردن زنی لازمی تھی۔ تب اس نے آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہو سکتا ہے مجھ غریب اور نادار شخص کی اس تک رسائی نہ ہو پائے اور اگر ہو بھی جائے تو وہ یہ تحفہ ہی قبول نہ کرے۔''

''وہ قبول کرے گا'' مہرالنساء نے حتمی انداز میں کہا اور آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔ عیسیٰ خوف کے مارے وہ صندوقچہ پکڑے رہا۔ تب اس نے مڑے بغیر کہا۔'' یاد رکھنا۔! تم میری نگاہوں کے سامنے رہو گے، اب جاؤ۔''

عیسیٰ نے اس کی جانب دیکھا۔ بلاشبہ وہ ایک حسین ترین عورت تھی۔ کمرے میں روشن قندیلیوں میں اس کا حسن جادوئی لگ رہا تھا۔ مگراس کے باوجود ایک غیر مرئی سختی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ اس سختی کو وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ کمرے سے نکلتے وقت اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے آقاؤں پر قربان ہو جائے گا۔ اب اس کی گردن زنی کا وقت آ گیا ہے۔ مہر النساء کی ذرا سی خواہش کے بدلے اسے اپنی جان کی قیمت چکانا ہوگی۔

سرگوشیاں ہوا کے بہاؤ کی مانند ہوتی ہیں۔ وہ اپنا احساس خود دلاتی ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اسی ہوا میں جب شدت آ جائے تو بگولے انہیں حقیقت کے قریب لے جاتے ہیں۔ مہر النساء کا چہرہ نقاب کی مانند تھا۔ وہ بظاہر ایک وفا شعار دکھائی دیتی لیکن اس کا دل اب بھی جہانگیر کے لیے دھڑکتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ جب جہانگیر نے مہر النساء کو اپنانے کے لیے ضد کی تھی۔ تب وہ شہزادہ تھا، اکبر نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور مہر النساء کی شادی علی قلی خان سے ہوگئی ہے۔ جسے بعد میں شیر افگن کا خطاب ملا تھا۔ یہ ایک طوفان تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو کر رہ گیا۔ لیکن اتنے برسوں بعد یہ خفیہ تحفہ، جسے سب کے سامنے اسے جہانگیر کو پیش کرنا تھا، اور اس نے قبول بھی کرنا تھا پرانی کہانی میں نئے موڑ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ جہانگیر اور مہر النساء کے درمیان اب بھی روابط تھے۔ وہ انہی خیالات میں کھویا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ اس وقت کسی بیماری کے شکار مریض کی طرح برآمدے میں نکل آیا تھا۔ اسے مہر النساء کے حکم کی تعمیل ہی نہیں کرنا تھی بلکہ اس راز کو راز میں بھی رکھنا تھا۔ جبکہ اس کے اندر اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا۔

''کیا تم ٹھیک ہو عیسیٰ؟'' ارجمند کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''میں ٹھیک ہوں آقا زادی۔'' اس نے لرزش بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا پھوپھی مہر النساء نے کچھ کہا ہے؟'' ارجمند نے پوچھا تو عیسیٰ جواب نہیں دے پایا۔ بس چپ چاپ نگاہیں نیچی کیئے کھڑا رہا۔ جب کچھ بھی جواب نہیں ملا تو اس نے اپنا سر جھٹک کر کہا ''چلو کوئی بات نہیں۔ میں نہیں پوچھتی کہ اس نے تمہیں کیا کہا ہے۔ اور تم اس قدر بے حوصلہ دکھائی کیوں دے رہے ہو؟''

''میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا آقا زادی۔''

''کہنا بھی نہیں، ورنہ مہر النساء کے عتاب کا شکار ہو جاؤ گے۔ جاؤ۔'' ارجمند نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ وہیں جم کر

کھڑا سوچتا رہا کہ ایک اکیلا غلام اپنے کئی آقاؤں اور آقا زادیوں کی خدمت کیسے کر سکتا ہے؟ ان سب کا اعتماد کیسے بحال رکھ سکتا ہے؟ سب کے ساتھ کس طرح وفاداری نبھا سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ شاہی مینا بازار والی بات سے اگلے ہی دن مہرالنساء نے اسے بلا لیا تھا۔ اس وقت وہ چاندی کی چوکی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا سر کھلا ہوا تھا اور اماوس کی رات کی مانند سیاہ اور بادلوں کی طرح پھیلے بالوں میں اس کا سرخ و سفید چہرہ بہت ہی حسین دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس وقت ''آئین اکبری'' پڑھ رہی تھی۔ اسے ابوالفضل نے لکھا تھا اور اس میں رموز حکمرانی کے علاوہ سلطنت کے امور بیان کئے ہوئے تھے۔ شاید وہ حکمرانی کرنے کی خواہش اپنے دل میں رکھتی تھی۔ وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے قدرے کرخت لہجے میں کہا۔

''رات شہزادہ خرم اور ارجمند کے درمیان کیا باتیں ہوتی رہیں تھیں؟''

''میں نے غور نہیں کیا تھا کہ وہ............''

''تمہارے دماغ میں بھس نہیں بھرا یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ کیا تم اپنے احمق پن سے اپنا یہ سر اپنے تن سے جدا کروانا چاہتے ہو؟ خیریت اسی میں ہے کہ فوراً سب کچھ اگل دو۔''

عیسیٰ کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ مہرالنساء کے حکم کے سامنے دم مار سکے۔ اس لیے عیسیٰ نے سب کچھ بتا دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے انتہائی حقارت سے عیسیٰ کو جانے کے لیے کہہ دیا۔ واپسی پر اس کا دل ارجمند سے غداری پر انتہائی نادم تھا مگر وہ مجبور تھا۔

......☆......

شاہی نقارہ بجنے کی مخصوص آواز قریب سے قریب تر آتی چلی جا رہی تھی۔ ناقوس بج رہے تھے۔ سپاہی راستہ صاف کرتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ بادشاہ کی سواری بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ جس کے آگے احادی پر وقار انداز میں چل رہے تھے۔ بادشاہ سونے کی پالکی میں سوار تھا۔ اس کا چہرہ خوشگوار تھا۔ اس کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ اور آنکھیں خمار آلود تھیں۔ شاہی سواری کے آگے آگے غلام پھولوں کی پتیوں بھرے تھال پکڑے کھڑے تھے۔ وہ بادشاہ کی پالکی پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ جہاں پالکی رک جاتی تھی، وہاں سے غیاث بیگ کے گھر کی دہلیز تک سرخ ایرانی قالین بچھا دیا گیا تھا۔ غیاث بیگ اور مرد افراد خانہ انتظار میں کھڑے تھے۔ پالکی سے بادشاہ باہر آیا تو سبھی کورنش بجا لائے۔ شہنشاہ جہانگیر کے

چہرے پر خوشگواریت تھی اوراس کے انداز میں گرم جوشی عیاں تھی۔ وہ غیاث بیگ کے ساتھ بغل گیر ہوا، پھر شیر افگن اور آصف خاں کو بہت محبت سے گلے لگایا۔ اس کے بعد دوسروں سے ہاتھ ملاتے ہوئے آگے بڑھا۔ غیاث بیگ اس کے ساتھ تھا۔

دیوان عام خوب سجایا ہوا تھا۔ بادشاہ کے لیے بہت خوبصورت مسند بنائی گئی تھی جواس کے شایان شان تھی۔ وہ بیٹھا تو اس کے عقب میں ایک تلوار بردار اور دوسرا کتاب تھامے حاشیہ بردار موجود تھا۔ جہانگیر نامہ میں مہرالنساء کے حسن بارے بہترین لفاظی کی گئی تھی۔ لیکن اس شام مہرالنساء کیسی تھی اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ رسم کے مطابق سب سے پہلے شہنشاہ کے حضور تحائف پیش کئے گئے۔ لیکن اس نے سوائے اس غیر ملکی بندوق کے اور کچھ بھی قبول نہ کیا۔

''غیاث الدین۔! یہ تحفہ ہمارے لیے کس نے چنا تھا؟''

''جہاں پناہ اس بندہ ناچیز نے۔'' وہ قدرے جھکتے ہوئے بولا۔

''اس میں ایسی کیا انفرادیت ہے کہ تم نے اسے ہمارے لیے پسند کیا؟''

''جہاں پناہ۔! قمرغہ میں یہ آپ کے بہت کام آ سکتی ہے۔ یہ جدید ترین اسلحہ میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی خیال کیا ہے کہ اگر ہمارے اسلحہ ساز ماہرین اس بندوق کا بغور مطالعہ کر کے بندوق اوراس میں ڈالنے والا بارود بنالیں تو مغل فوج اور زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔''

''بہت خوب، غیاث بیگ بہت خوب۔ ہمیں تمہارا خیال پسند آیا۔'' یہ کہہ کر وہ بندوق بغور دیکھنے لگا۔ چند لمحے وہ مشاہدہ کرتا رہا اور پھر واپس کر دی۔ رسم پوری ہو چکی تو تحائف وہاں سے ہٹا دیئے گئے۔ تب بادشاہ اوراس کے مصاحبین کے لیے عمدہ شربت اور پھلوں کے رس پیش کئے گئے۔ اسی دوران عیسیٰ آگے بڑھا اوراس نے وہ صندوقچہ ایک طشتری میں سجا کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔

''جہاں پناہ۔! مجھ عاجز کی طرف سے یہ تحفہ قبول فرمائیں۔''

جہانگیر نے پہلے اس صندوقچہ کو اور پھر عیسیٰ کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ ایک لمحہ بعد اس نے وہ صندوقچہ اٹھا لیا اوراس کی مہر توڑ دی۔ اس نے ایک لمحہ کو اس کے اندر موجود پڑی شے کو دیکھا اور پھر بند کر دیا۔ جہانگیر کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ جس سے خوشگواریت کے رنگ اور زیادہ گہرے ہو گئے۔ لاشعوری طور پر اس کے ہونٹوں سے آہ

نکل گئی۔ انہی لمحوں میں یہ یقین مزید پختہ ہو گیا کہ جہانگیر ابھی تک مہر النساء کے حصار میں تھا۔ اس نے بڑی چابکدستی سے اس کا دل اپنے قبضے میں کیا ہوا تھا۔ غیاث بیگ نے وہ تحفہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو جہانگیر نے لاپرواہی سے صندوقچہ اپنے ایک غلام کو تھماتے ہوئے کہا۔

''اس میں اتنا کچھ خاص نہیں ہے۔ بس ایک معمہ ہے۔ تمہارا غلام واقعی انعام کے قابل ہے۔'' اس نے کہا اور اپنی انگلی سے زمرد جڑی انگوٹھی نکال کر اس کی طرف پھینک دی۔ جسے اس نے تیزی کے ساتھ پکڑ لیا۔ تب جہانگیر نے کہا ''غیاث بیگ اب ہمیں منگنی کی رسم ادا کرنی چاہیے۔''

یہی وہ بات تھی جس کے لیے یہ سارا اہتمام کیا گیا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کا یہ حکم غیاث بیگ خاندان کی قسمت بدل دینے والا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر اٹھ گیا تو اس کے ساتھ سبھی لوگ کھڑے ہو گئے۔ شہنشاہ کے ساتھ محض چند لوگ ہی بڑھے تھے جو کسی نہ کسی حوالے سے ان دونوں خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ باقی سب افراد، مصاحبین اور حاشیہ بردار دیوان عام میں ہی رہ گئے۔

دیوان خاص میں غیاث بیگ کے حرم کی خواتین اور شہنشاہ کے ساتھ آئیں خواتین موجود تھیں۔ جودھی بائی اور دیوان جی بیگم ایک ہی مسند پر بیٹھی ہوئیں تھیں اور ان کے ساتھ ہی ایک نشست پر ارجمند بانو بیگم بیٹھی ہوئی تھی۔ شہنشاہ کے ساتھ محض چند لوگ دیوان خاص میں آئے تو خواتین اٹھ کھڑی ہوئیں اور تعظیم سے کورنش بجا لائیں۔ جہانگیر کی نگاہ ایک لمحہ کے لیے سب پر پڑی اور پھر مایوس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں مہر النساء نہیں تھی۔ وہ ابھی تک زنان خانے میں موجود تھی۔ شاید کسی خصوصی بلاوے کی منتظر تھی۔ بادشاہ چند لمحے کھڑا رہا اور پھر ایک نظر جودھی بائی پر ڈالی۔ وہ سمجھ گئی کہ شہنشاہ کیا چاہتا ہے وہ اٹھی اور اس طلائی ڈبے کو کھول کر شہنشاہ کے سامنے کر دیا جس میں ہیرے جڑی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ اجازت پاتے ہی وہ انگوٹھی ارجمند بانو کے دائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنا دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی غیاث بیگ کے خاندان کے چہرے مسرت سے شادمان ہو گئے کہ ان کا تعلق حکمران خاندان سے رشتہ داری میں بدل گیا تھا۔

شہنشاہ کے لیے دیوان خاص میں بنائی گئی نشست پر جہانگیر بیٹھ گیا۔ تب ساری خواتین بھی بیٹھ گئیں۔ چند لمحے گذرے ہوں گے کہ مہر النساء آ گئی۔ سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ آگے بڑھی اور شہنشاہ کے سامنے کورنش بجا لائی۔ اس کے اس ادا سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی اہمیت سے نہ صرف آگاہ ہے بلکہ اپنی اہمیت منوانا بھی جانتی ہے۔ کتنی

ہی دیر تک شہنشاہ کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکیں رہیں۔ یہاں تک کہ مہر النساء ایک طرف جا کر بیٹھ گئی۔ شہنشاہ ان خواتین کے ساتھ کافی دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ پھر ضیافت اور تفریح کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس شام جہانگیر نے چند فرمان جاری کیے جن میں سے ایک غیاث بیگ کا عہدہ بڑھانے کے بارے تھا اور اسے اعتماد الدولہ کا خطاب دے کر اس کے وقار میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اس شام اس خاندان کی تقدیر بہت تیزی سے بدلی تھی۔

......☆......

اس وقت دن کا پہلا پہر گذر چکا تھا جب مہر النساء سخت طیش کے عالم میں دھاڑی تھی۔ اس کا غصہ قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ دیوان خانے میں تھی اور اس کے سامنے شیر افگن بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خاصا مضطرب تھا۔ جبکہ لاڈلی بیگم اپنے باپ کے ساتھ چمٹی ہوئی یوں بیٹھی تھی جیسے کسی خطرناک طوفان سے بچنے کی کوشش میں ہو۔ ماحول یوں تنا ہوا تھا جیسے بارش سے پہلے ہوا ساکت ہو جاتی ہے۔

''کیا اس شاہی فرمان پر ہم خوشیاں منائیں۔ ہم ان کا احسان مانیں۔'' اچانک مہر النساء پھر سے دھاڑی تو شیر افگن نے نہایت تحمل لیکن قدرے احتجاجی لہجے میں جواب دیا۔

''تم اچھی طرح سمجھتی ہو کہ یہ ایک بڑا اور اہم عہدہ ہے۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ اس کے احمق پن پر حیران ہو۔

''بنگال......! کہاں ہے بنگال...... پتہ ہے کتنے سو کوس ہے یہاں آگرہ سے۔ بادشاہ کی یہ کیسی فیاضی ہے کہ ہمیں یہاں سے اتنی دور بھیجا جا رہا ہے۔''

''مگر یہ بھی تو دیکھو کہ میں دیوان بن رہا ہوں۔ یہ ایک اہم رتبہ ہے۔ بنگال ایک زرخیز اور پرامن علاقہ ہے اور پھر شہنشاہ اپنی فیاضی سے ہمیں یہ باور کرا رہا ہے کہ وہ ہم پر اعتماد کرتا ہے۔ ہمیں اس کے اعتماد پر پورا اترنا چاہیے۔'' اس نے دوبارہ اسی تحمل سے کہا۔

''یہیں پر میر سامان یا اتنا ہی کوئی اور عہدہ دینے پر بادشاہ کو کیا شے مانع ہے۔'' مہر النساء اپنی بات پر اڑ رہی۔

''ٹھیک ہے اگر تم یہاں رہنا چاہو تو رہو لیکن مجھے تو شاہی فرمان کے مطابق بنگال روانہ ہونا ہے۔'' شیر افگن نے حتمی بات کہہ کر بحث ہی ختم کر دی۔ اس کے یوں کہنے پر مہر النساء کا غصہ اچانک تحلیل ہو گیا۔ دراصل وہ یہاں رہتے ہوئے بہت اچھا کاروبار کر رہی تھی۔ وہ شاہی حرم اور عمائدین سلطنت کی خواتین کے لیے لباس بناتی تھی۔ ان ملبوسات کے نمونے اور

نقش ونگار اس کی ذہنی تخلیق ہوا کرتے تھے۔اس کے بنائے ہوئے ملبوسات اس قدر مشہور تھے کہ دن بدن ان کی طلب بڑھ رہی تھی۔شہنشاہ کے لیے دیوان اور میر سمان کے عہدے وہ مہرے تھے جو وہ بساط حکمرانی پر چلتا رہتا تھا۔شاید مہر النساء اس دھاگے سے بندھ کر چل پڑی تھی جس کی منزل طاقت تھی۔اس کا چہرہ تبدیل ہو گیا۔غضب نا کی کی جگہ شرمندگی بھری خجالت آ گئی۔پھر لمحوں میں وہاں مسکراہٹ تھی۔اس کے نین نقش پہلے کی مانند خوبصورت ہو گئے۔وہ انتہائی نرم لہجے میں بولی۔

''مجھے معاف کر دیں۔مجھے غصہ آ گیا تھا۔دراصل یہاں سے جانے پر میرا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔لیکن کوئی بات نہیں۔میں تو وہیں رہوں گی جہاں آپ ہوں گے۔''

مہر النساء کا انداز ایسے ہی تھا کہ جیسے اس کا غصے میں آ جانا انتہائی معمولی سی بات ہو۔

......☆......

انہی لمحوں میں ارجمند بانو اپنے کمرے میں تنہا تھی۔اس کی نگاہ انگلی میں پہنی ہوئی اس انگوٹھی پر تھی جو اس کا شہزادہ خرم سے بندھن کا ثبوت تھی۔شاہی مینا بازار کی اس جادوئی رات سے لے کر اس مہک خیز شب تک کا دورانیہ کس قدر ہیجان خیز تھا۔اس دوران وہ دونوں مل نہیں پائے تھے اور نہ ہی کوئی محبت بھرا پیغام اس کی طرف سے آیا تھا۔نجانے اس نے بادشاہ تک کیسے رسائی کی ہو گی؟ اسے کس طرح آمادہ کیا ہو گا؟ کیا بادشاہ کو بھی اس کی محبت کا احساس ہو گیا تھا اور نجانے مزید کتنے سوال اس کے ذہن میں امنڈتے چلے آ رہے تھے۔اسے شہزادہ خرم پر حد سے زیادہ پیار آ رہا تھا۔اس نے اپنی محبت کا اظہار بہت خوبصورت انداز میں کیا تھا۔کیا یہ سچ ہے کہ محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی؟

دھیرے دھیرے گذرتی شب کے ساتھ وہ بھی روشن قندیل کی طرح شہزادہ خرم کی محبت میں پگھلتی جا رہی تھی۔شاید وہ لاشعوری طور پر من وتو کا فرق مٹا رہی تھی۔

''حضور۔! کیا آپ خواب دیکھ رہے تھے؟''

''کیا شہزادے خواب نہیں دیکھ سکتے؟''

''اس وقت نہیں، جب وہ میدان جنگ میں ہوں۔ میں آپ کو کئی بار قتل کر سکتا تھا۔'' سپہ سالار مہابت خان نے تلوار کی نوک اس کے جسم کے مختلف حصوں پر لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں میں وار کر سکتا تھا، یہاں اور یہاں پر بھی۔'' پھر اپنی تلوار میان میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میدان جنگ میں بادشاہ کی حیثیت دل کی مانند ہوتی ہے اگر وہی قتل ہو جائے تو شکست قسمت میں لکھ دی جاتی ہے۔ آپ کو شہنشاہ بننا ہے اور......''

''میں ابھی شہنشاہ نہیں ہوں، ابھی میرے خواب دیکھنے کے دن ہیں۔'' شہزادہ خرم نے اپنی تلوار اور ڈھال ایک سپاہی کو تھماتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر میں آپ کو موقع نہ دوں تو آپ کی لڑائی کا انداز میں کیسے سمجھ پاؤں گا۔''

''مگر زندگی محض تجربات کا نام نہیں۔ آپ کو یہ نصیحت یاد رکھنی چاہیے کہ حکمرانی کو تبھی دوام نصیب ہوتا ہے جب تک علاقے فتح ہوتے رہیں۔ ورنہ امن کی کوکھ سے شورشیں اور سازشیں جنم لینا شروع ہو جاتی ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تاہم یہ خواب ہی ہوتے ہیں جو انسان کو آگے ہی آگے بڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔'' خرم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مہابت خاں ایک قابل، ذہین اور بہادر سپہ سالار تھا۔ وہ بھی شہزادہ خرم کا اتالیق تھا۔ خرم اس ضمن میں خاصا خوش قسمت واقع ہوا تھا کہ اسے بہترین اساتذہ سے فیض حاصل کرنا کا موقعہ مل رہا تھا۔ خود وہ بھی قدرتی طور پر ذہنی اور جسمانی طور پر ایسی صلاحیتیں رکھتا تھا کہ جس طرح کے بھی علم وفن کی اسے تربیت دی جاتی، وہ اساتذہ کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خود شہنشاہ اکبر اس کی انہی صلاحیتوں پر فریفتہ تھا۔ خرم اس کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس کی ذہنی نشوونما کے لیے مرزا خان ابوالخیر، میاں وحید الدین گجراتی اور حکم دوائی جیسے جید اساتذہ مقرر کئے گئے۔ جن کی تعلیم نے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ دقیق سے دقیق مسائل کو فوراً سمجھنے لگا تھا۔ پیچیدہ مسائل کے حل وہ لمحوں میں تلاش کر لیتا تھا۔ مادری زبان ترکی کے لیے تاتار خان نے شہزادے پر اپنی صلاحیتیں آزمائیں۔ فنون سپہ گری میں تیر اندازی سکھانے کے لیے میر مراد دکنی، بندوق چلانے کے لیے راجہ سال باہن اور گھڑ سواری، کشتی، ترتیب فوج، میدان جنگ کے راز مہابت خان سکھا رہا تھا۔ آداب جہاں بانی اور طریق حکمرانی کی تربیت خود شہنشاہ اکبر نے دی تھی۔

اکبر کو اپنے پوتے خرم سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اسے ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ تربیت علوم وفنون اور محبت کے باعث بچپن ہی سے خرم کی صلاحیتوں کا اظہار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ علمی میدان اور

میدان جنگ میں اس کے جوہر کھل رہے تھے۔انداز حکمرانی اس میں رچ بس گیا تھا۔حکمرانی کے لیے سفارتی گفتگو ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے۔خرم بچپن ہی سے اس فن میں یکتا ہو گیا تھا۔اس کا اظہار اس نے بچپن ہی میں کر دیا تھا۔

ایک دن شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی خواہش پر ہاتھیوں کی لڑائی کا جشن منعقد کیا گیا۔شہزادہ سلیم کے پاس ''گراں بار'' نامی ہاتھی تھا جس کا مقابلہ خسرو کے ہاتھی ''آپ روپ'' سے ٹھہر گیا۔مقابلہ کے وقت شہنشاہ اکبر کے ساتھ خرم بھی موجود تھا۔ شہزادہ سلیم اور خسرو اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔مقابلہ شروع ہوا تو سلیم کا گراں بار ہاتھی غلبہ پا گیا اور آپ روپ دبنے لگا۔اس پر شاہی خاصہ سے ''ورن تھمن'' نامی ہاتھی کو آگے بڑھایا گیا۔کیونکہ یہ طے تھا کہ دو میں سے جو ہاتھی بھی مغلوب ہو گا ورن تھمن اس کی مدد کرے گا۔ورن تھمن کو آگے بڑھتا دیکھ کر سلیم کے عملہ اور نوکروں نے اسے روکنے کے لیے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔یہاں تک کہ شاہی فیل بان پتھر لگنے سے زخمی ہو گیا۔خسرو ہمیشہ ہی سے اپنے باپ کے خلاف رہا تھا۔اس نے بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ ان گستاخیوں کے بارے میں اکبر کے پاس شکایت کی جس پر اکبر نے شہزادہ خرم کو اپنا سفیر بنا کر سلیم کے پاس بھیجا۔کیونکہ اکبر انتہائی برہم ہو گیا تھا۔شہزادہ خرم نے نہایت خوبصورتی سے اپنے دادا کا پیغام اپنے باپ تک پہنچایا اور پھر نہایت خوش اسلوبی سے جہانگیر کا جواب اپنے دادا کے گوش گذار کیا۔یوں خواہ مخواہ کا بڑھتا ہوا نزاع اور رنج و ملول دور کر دیا۔

مہابت خان شہزادے کا فن حرب میں ہی اتالیق نہیں تھا بلکہ اس کے زندگی کے کئی گوشے بھی اس کے سامنے بے نقاب تھے۔وہ جانتا تھا کہ شہزادہ خرم کی محبت ارجمند بانو ہے۔لیکن مہابت خان حالات میں تبدیلی کو محسوس کر چکا تھا۔مگر وہ کھلے لفظوں میں ایسا کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔اس وقت ان دونوں کے بدن غبار آلود تھے اور دھول فضا میں لٹکی ہوئی تھی۔تبھی مہابت خان نے کہا۔

''حضور۔! آپ ارجمند بانو کے خواب کچھ زیادہ ہی دیکھ رہے ہیں۔''

''ایک وہی تو ہے جو میرے خوابوں میں تسکین کا باعث ہے۔میری تنہا، اجاڑ اور ویران زندگی میں وہی رنگینی بھرتی ہے۔بلاشبہ میں اس کے خوابوں کے بغیر اب کہاں زندہ رہ سکتا ہوں۔''

''وقت کے بارے میں کوئی بھی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔کل کیا ہو گا اس بارے میں کوئی بھی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔اس کے اتنے خواب مت دیکھیں، ہو سکتا ہے کل آپ کو اسے بھولنا پڑے۔''

''ایسا ہو نہیں سکتا کہ میں اسے بھول جاؤں۔''

''میں جانتا ہوں خرم، میں آپ کو غلط نصیحت نہیں کر رہا اور پھر میں اچھا درباری بھی نہیں ہوں مگر۔! میں یہ درباری اصول اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ اگر بادشاہ دوپہر کے وقت کہے کہ رات ہے تو آپ کہہ دیں کہ ہاں چاند اور ستارے بھی چمک رہے ہیں۔''

''مگر میں درباری نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' خرم نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہو سکتا ہے ایسا وقت آن پڑے اور آپ کو بھولنا پڑ جائے۔'' مہابت خان نے بھی مسکراتے ہوئے کہا اور حمام کی طرف جانے کے لیے قدم اٹھا لیے۔

اس وقت وہ تازہ دم ہو کر کمرہ خاص میں مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ روشن قندیلیوں سے وہ کمرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ہر شے سونے کی بن گئی ہو۔ ماحول میں بہترین خوشبو رچی ہوئی تھی اور اس کے خیالوں میں مہابت خان کی گفتگو سمائی ہوئی تھی۔ خرم کے لیے اس کی باتوں میں، الفاظ اور لہجہ میں موجود، آنے والے حالات کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔ جیسے بارش آنے سے پہلے ہوا بدل جاتی ہے اور اسی سے اندازہ لگا لیا جاتا ہے کہ بارش ہو گی، سو مہابت خاں کی گفتگو نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ارجمند بانو کی خواستگاری میں شہنشاہ نے خود دلچسپی لی تھی۔ اور اس سے پہلے خود جہانگیر نے اس کی صلاحیتوں کی بناء پر اس کے اعزاز میں غیر معمولی اضافہ کیا تھا۔ آٹھ ہزاری ذات، پانچ ہزار سوار، طبل و علم کے علاوہ شاہی فرامین پر مہر لگانے کا شرف اسے دے چکا تھا۔ اس سے بڑھ کر چھتر، سرخ بارگاہ لگانے اور سواری کے ساتھ نقارہ رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ جو بلاشبہ ایک ولی عہد سلطنت کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ مہابت خاں نے جو ارجمند بانو کو بھول جانے کی بابت کہا تھا تو ایسی بات ایک ولی عہد شہزادے کے لیے تو کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی ہو لیکن ایک عاشق صادق کے دل پر چوٹ لگنے والی کیفیت بن جاتی ہے۔ ارجمند سے منگنی کے بعد شہنشاہ آگرہ میں نہیں رہے تھے۔ وہ شکار کرتے ہوئے کابل کی جانب کوچ کر گئے تھے۔ تقریباً ایک سال بعد وہاں سے واپسی پر نئی طرح کی صورت حال جنم لینا، اسے چوکنا کر دینے کے لیے کافی تھی۔

ارجمند۔! جسے خرم ہمیشہ اپنے قریب محسوس کیا کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ منگنی ہو جانے تک اس نے کوئی نامہ یا پیغام اس کی طرف نہیں بھیجا تھا۔ بس اپنے خدمت گار رضا کو اس کے معمولات کی نگرانی کے لیے خصوصی حکم دے دیا تھا۔ رضا

کو جب بھی کوئی نئی بات معلوم ہوتی وہ شہزادے کے گوش گذار کر دیتا تھا۔ یہ احساس قرب ہی کا اعجاز تھا کہ شہزادہ خرم نے شاہی مینا بازار کی جادوئی شب کے بعد دوبارہ اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے خوابوں میں ہمکتی اور خیالوں پر چھا گئی تھی۔ وہ حسن دلنواز اس کے تصور میں اسی طرح تازہ تھا جیسے گل یاسمین کو لمحہ پہلے ٹہنی سے جدا کر لیا گیا ہو۔ محبت کے بھی الوہی تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ جب چاہتا ارجمند سے مل سکتا تھا۔ وہ اس قدر طاقت وثروت رکھتا تھا مگر شہزادہ خرم وہ محبّ صادق تھا جو ارجمند کے دل پر پوری نرماہٹوں سے حکمرانی کرنا چاہتا تھا۔ محبت میں قوتیں نہیں خلوص بھرا رویہ ہی کارآمد ہوسکتا ہے۔ ورنہ محبت آلودہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ارجمند کے خیال کی صورت میں اس کے ہاتھ نئی دلچسپی لگ چکی تھی۔ وہ اسے کھلی آنکھوں کے خواب میں دیکھتا۔ وہ ہر بار نئی دکھائی دیتی۔ اس کے ریشمی بال، اس کے بدن کی رنگت، اس کے قرب کی مہک، وہ شب میں روشن قندیل کے سامنے چمکتا ہوا حسن، جس نے آنکھیں خیرہ کر کے رکھ دیں تھیں، وہی ایک تھی جسے اس نے پوری دنیا میں سے چن لیا تھا۔ وہی تھی جو اس کے دل پر حکمرانی کرنے کے لائق تھی اور اس کے لیے اس نے اپنا من وا کر دیا تھا۔ وہ اس کے لیے کوہ نور ہیرا سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔

خرم کو احساس تھا کہ وہ محض شہزادہ خرم نہیں، ولی عہد سلطنت کے طور پر چنا ہوا شہزادہ ہے۔ وہ نہ تو ایک عام سپاہی ہے اور نہ ہی گنوار دیہاتی۔ وہ اپنی محبت میں سنیاس لینے والا نہیں تھا کہ راکھ مل کر زمین پر آسن جما کر بیٹھ جائے یا گلیوں میں نکل جائے۔ اس کا اپنا ایک مقام تھا اور وہ اپنی محبت سے دستبردار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے یہ پوری طرح احساس تھا کہ مغلیہ حکمران سیاست کے لیے شادیاں کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی محبت کا نام لے تو زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسے جہانگیر کے معاملے میں اکبر نے مخالفت کی، انہی لمحوں میں اسے اپنے دادا کی باتیں یاد آنے لگیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ آئین تیموری ہے۔ کبھی اپنے بھائی کے خلاف مت جانا۔ اس وقت تک رکے رہنا جب تک تمہیں وہ مجبور نہ کر دے۔

خرم کے سامنے ایسی کوئی صورت حال نہیں تھی سوائے یہ کہ اس کا باپ مہرالنساء سے محبت کرتا ہے۔ اس کی محبت کا رنگ کچھ اور ہی طرح کا تھا۔ مہرالنساء اس کے باپ کے سر پر مسلط ہو چکی تھی۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس نے سوچا تھا کہ مہرالنساء ایک پیچ دار، الجھا ہوا معمہ تھی جسے نہایت احتیاط اور خاموشی سے حل کرنا تھا۔ وہ ملکہ نہیں بن سکی تھی لیکن اس کی ماں جودھی بائی پہلی بیوی ہونے کے باعث ملکہ ہند بن گئی تھی۔ مگر ایک رشتہ، ایک تعلق، ایک ربط یا ایک بندھن ان دونوں کے درمیان ضرور تھا۔ اسے یہ پوری طرح یقین تھا کہ جب محبت کی چنگاری سلگ اٹھتی ہے تو پھر بجھائے نہیں بجھتی۔ اسے یہ اچھی

طرح معلوم تھا کہ جہانگیر کے دل میں محبت کا بیج پھوٹا ضرور تھا۔اب اس پودے کا حال کیا ہے؟ وہ یہ نہیں جانتا تھا۔لیکن اسے یہ خوش گمانی تھی کہ جس تجربے سے اس کا باپ گذر چکا ہے۔اس کی ایذاء وہ اپنے بیٹے کو نہیں دے گا۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ بھی خیال آیا کہ جہانگیر فقط اس کا باپ ہی نہیں شہنشاہ ہند بھی ہے۔تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ حکمرانی کے لیے رشتے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ویسے بھی مغل ''تخت یا تختہ'' کے قائل تھے۔اس نے اچانک ساری سوچوں کو جھٹک دیا۔ یہ سب اسے قنوطیت کا شکار کررہی تھیں۔اسے تو بس ارجمند سے محبت ہے اور وہ محبت کرتا رہے گا۔دنیا کی کوئی طاقت اس کے دل سے ارجمند کو نہیں نکال سکتی۔اس خیال نے اس کے اندر خوشگواریت بھردی۔وہ اٹھا اور دیوان عام کی طرف جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

خرم کا محل قلعے سے دریائے جمنا کی جانب تھا۔یہ اسی کی ذہنی اختراع تھی جو اس نے محکمہ بیوتات کے ماہرین تعمیرات اور ہنرمندوں کے مشوروں سے تخلیق کی تھی۔وہ فطری طور پر تعمیرات میں دلچسپی رکھتا تھا۔اس نے بہت ساری تعمیرات کے نمونے دیکھے تھے اور ان پر غور کیا تھا۔آگرہ اور دہلی کی عمارتوں میں وہ اک بے جان خاموشی محسوس کیا کرتا تھا۔اس کی خواہش تھی کہ عمارتیں بھی باتیں کریں۔وہ ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا۔انہیں سمجھنا چاہتا تھا۔اس کا محل سادگی اور انفرادیت کی عمدہ مثال تھا۔اس وقت چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور اس کی تخلیق اس میں نہائی ہوئی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے چاندی سے مرصع ہو۔دور تک پھیلے ہوئے باغ سے پھولوں اور پھلوں کی مہک نے اسے خمار آلود کردیا تھا۔

دیوان عام میں اس کے دوست بیٹھے ہوئے تھے۔سعداللہ خان کے علاوہ خدمت گار رضا ان میں شامل تھے۔وہ سردرات تھی اور پھولوں کی خوشبو پہلی شراب کی مانند مسحورکن تھی۔باغ کے چبوترے پر موسیقار شام کا راگ گا رہا تھا۔اس کی تانیں بڑی نرم اور دل آویز تھیں۔شہزادہ خرم اس دن اپنے آپ میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔اس نے مسند خاص پر بیٹھتے ہی رقاصاؤں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔جس سے ماحول میں نشاط گھل گیا۔

......☆......

شہنشاہ جہانگیر تخت پر براجمان تھا۔اس کے چہرے پر انتہائی درجے کی سنجیدگی اور سخت گیری تھی۔مودب درباری پوری توجہ سے ایک وزیر کی بات سن رہے تھے۔وزرا کی صف میں غیاث بیگ بھی موجود تھا جسے اعتمادالدولہ کا خطاب مل چکا تھا۔شہزادہ خرم دربار میں حاضر ہوا۔وہ انتہائی ادب سے کورنش بجالایا۔بادشاہ نے اس کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور

اپنی توجہ وزیر کی طرف ہی رکھی۔ یہ سلسلہ خاصا طویل ہو گیا تھا۔ امور مملکت خاصے پیچیدہ تھے اور بادشاہ بہت محتاط تھا۔ شہزادہ خرم جو کہ ولی عہد سلطنت کے لیے چن لیا گیا تھا وہ بھی جب دربار میں حاضر ہونے کے لیے آیا تو محافظوں نے اس سے مرصع دستے والا خنجر لے لیا تھا۔ شاہی ماحول میں سازشیں گھلی ہوئی تھیں۔ خسرو کی ناکام بغاوت کے بعد سے حفاظتی حصار اور زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ جہانگیر کے دور حکمرانی کے یہ ابتدائی سال تھے۔ وہ امور سلطنت پر بہت زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ شاید خسرو بغارت نہ کرتا یا حالات کسی اور طرح ہوتے اگر اکبر سے غلطی سرزد نہ ہوئی ہوتی۔ یہ اکبر ہی کا فیصلہ تھا کہ اس کے بعد خسرو کو نیا شہنشاہ بنا دیا جائے۔ لیکن پھر بستر مرگ پر اس نے اپنا فیصلہ تبدیل کر کے جہانگیر کے حق میں دے دیا۔ یہ خرم ہی تھا جو اکبر کے دم آخری تک اسی کے پاس موجود رہا۔ اکبر نے جہاں ایک وسیع مملکت اور بھرا ہوا خزانہ چھوڑا تھا، وہاں سازشی ماحول اور نفرت بھی چھوڑی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اکبر ایک ان پڑھ اور جاہل قسم کا حکمران تھا جسے صرف اپنی حکمرانی کے ثبات سے غرض تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے بہت حد تک احمقانہ فیصلے صادر کیے تھے جن میں سے ایک دین الٰہی بھی تھا۔ اس کے فیصلوں کی بنیادیں عوامی فلاح و بہبود کی بجائے سیاست اور اپنے ذاتی نظریات کو تقویت دینا تھی۔ مثلاً قمری سال سے عیسوی سال میں تبدیلی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سورج کی پرستش کرتا تھا۔ اس نے جزیہ اس لیے بند کیا کہ ہندوؤں کی حمایت چاہیے تھی لیکن اسے ٹیکس کا نام دے کر لاگو کر دیا۔ ستی کی رسم اور بچپن کی شادی کو ممنوع قرار دیا لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کی۔ اس کی حکمرانی طاقت کے بل بوتے پر تھی۔ اس کے حصول میں اسے جو کچھ بھی کرنا پڑا، کیا۔ اس کے دربار میں ہی خان اعظم کوکلتاش اور راجہ مان سنگھ خسرو کی تخت نشینی کے لیے صرف اس وجہ سے سازش تیار کر چکے تھے کہ خسرو ان کا رشتے دار تھا۔ سلیم کو اندھا کر کے قید میں ڈالنے کا عزم پختہ ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے آدمی محل کے باہر اس لیے متعین تھے کہ شہزادہ خرم جونہی محل سے باہر آئے اسے گرفتار کر لیا جائے۔ ہو سکتا تھا کہ یہ سازش کامیاب ہو جاتی مگر خسرو ہی میں دم نہیں تھا۔ وہ محض حاسد اور دوسروں کو بھڑکانے والا فرد تھا۔ تین لاکھ ساٹھ ہزار سالانہ آمدنی پانے والے شخص کے پاس اپنی کوئی فوج نہیں تھی جو اس کے ارادوں میں کامیاب ہونے کے لیے اس کی مدد کرتی۔

دوپہر ہو گئی اور دربار کی معمول کی کاروائی بھی اختتام کو پہنچ گئی۔ شہنشاہ تھک چکا تھا اس کی آنکھیں خمار آلود اور قدرے سرخ تھیں۔ اپنی نگاہوں سے اس نے خرم کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''شہزادہ خرم۔! میرے ساتھ آؤ۔''

شہنشاہ نے حکم دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دربار میں ہلچل مچ گئی۔ نقیب اونچی آواز میں بولنے لگا۔ خرم اپنے باپ کے قریب ہو گیا۔

''آؤ۔!'' یہ کہتے ہوئے بادشاہ نے اپنا بازو اس کے گلے میں حائل کر دیا۔ تب اسے جانی پہچانی مانوس سی صندل کی خوشبو کا احساس ہوا۔ یہ جہانگیر کی پسندیدہ خوشبو تھی اور وہ بچپن ہی سے مانوس تھا۔ وہ اس وقت بادشاہ نہیں، ایک باپ کی حیثیت سے مل رہا تھا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے بادشاہ کے کمرہ خاص میں چلے گئے۔ شفقت پدری سے مغلوب جہانگیر نے اپنے بیٹے کو پیار کیا جیسے وہ اسے بچپن میں کیا کرتا تھا۔ اصل میں جب سے خسرو نے بغاوت کی تھی، تب سے خرم کا وقار بہت بلند ہو گیا تھا۔ خسرو نے جہانگیر کے قتل کی جو سازش کی تھی اسے سب سے پہلے شہزادہ خرم ہی نے محسوس کیا تھا۔ اور اس نے یہ اطلاع اپنے باپ تک پہنچائی تھی۔ لقب، عہدہ اور حسن فیروز کی جاگیر کا عطا کرنا جہانگیر کے اعتماد کی نشانی ہی تھی۔ بادشاہ شہزادہ خرم سے الگ ہو کر مسند خاص پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے دریائے جمنا کا نظارہ بہت خوبصورت تھا۔ سرخ ریت سے پشتے ڈھکے ہوئے تھے لیکن اس میں شاہی وقار کے شایان شان کوئی نظارگی نہیں تھی۔ غلام آگے بڑھے اور انہوں نے دستار تھامی، سونے کا کمربند اور بازوبند اتارے،، طلائی خنجر اور مرصع میان اس سے الگ کی تو وہ پرسکون ہو گیا۔ تبھی اس کے سامنے جام آ گیا۔ بادشاہ نے دو گھونٹ بھرے اور خرم کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کہو شہزادہ خرم۔! کیا چاہتے ہو؟''

''میں کیا چاہوں گا، جس کا باپ شہنشاہ ہندوستان ہے۔''

''لیکن میں چاہتا ہوں کہ تمہاری خواہشات میں بھی پوری کروں۔'' بادشاہ نے پرشفقت نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور طلائی جام سے چند گھونٹ اور لے لیے۔ پھر خود ہی بولا ''دکن کی مہمات کی طرف بھی ہماری نگاہ ہے اور یہ طے کیا جا رہا ہے کہ اس طرف کسے روانہ کیا جائے۔ دوسرے چتوڑ کی بحث بھی جاری ہے کہ انہیں کیسے سبق سکھایا جائے۔ اس بار کچھ ایسا کرنا ہو گا کہ ہم مطمئن ہو جائیں۔'' بادشاہ اپنی دھن میں کہے جا رہا تھا اور خرم اطمینان سے اس کی سن رہا تھا۔ اس نے چند گھونٹ اور بھر کر جام خالی کر دیا۔ جسے غلام نے فوراً ہی تھام لیا۔ تب اس نے کہا ''اُو۔! شہزادہ خرم، بتاؤ اگر کوئی پریشانی والی بات ہے تو میں اسے فرو کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔''

اس وقت خرم قدرے بے چین ہو گیا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ان لمحوں میں وہ اپنے شفیق باپ سے مل رہا ہے یا

شہنشاہ ہند سے۔ایسے میں وہ اس کے لیے فیاض ثابت ہوگا یا سخت گیر۔اسے اپنے استاد محترم کی نصیحت یاد تھی کہ بادشاہ کے حضور انتہائی محتاط انداز میں بات کی جاتی ہے کیونکہ اس کے پاس طاقت کا خمار ہوتا ہے۔بہترے لوگوں کی گردنیں صرف ان کی زبان کے باعث کٹ جاتی ہیں۔وہ شہنشاہ ہند کے حضور تھا کیونکہ اس کی باتیں ہی ایسی تھیں۔سو وہ بہت زیادہ محتاط تھا کہ اس وقت زمین پر اس کا حکم چل رہا تھا۔اس نے انتہائی خوش گفتاری سے کہا۔

''شہنشاہ اعظم، بادشاہ ہندوستان، جہاں پناہ، ظل الٰہی میں بس آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا تھا۔''

''اُوہ۔!'' یہ کہہ کہ شہنشاہ ہنس دیا۔اس نے نئے جام بنانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ شہزادہ خرم کا لہجہ نہیں کسی درباری کی خوشامدانہ آواز لگتی ہے تم میرے چہیتے بیٹے ہو۔تم میرے ساتھ ایسا رویہ نہ رکھو جس میں تکلف ہو۔''

اس نے پیار سے خرم کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔اس وقت خرم کا گمان یہی تھا کہ وقت اس کا ساتھ دے رہا ہے۔شہنشاہ کا سلوک دوستانہ ہے۔وہ زیادہ سے زیادہ گفتگو کر کے آنے والے حالات کی جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔بادشاہ کے ہاتھ میں نیا جام آ گیا تھا جسے اس نے جلدی سے خالی کر دینا چاہا۔سو اس نے کئی سارے لمبے گھونٹ لیے۔تب تک دونوں میں خاموشی رہی اور جام خالی ہوگیا۔بادشاہ نے وہ واپس کر کے نیا بنانے کا اشارہ کیا اور بولا۔

''اس وقت تک سلطنت سازشوں کے ماحول سے نکل چکی ہے۔حکمرانی کا ایک نیا دور ہمارے سامنے ہے۔ہمیں زیادہ سے زیادہ طاقت کے حصول کے لیے کوششیں کرنی چاہئیں۔'' خرم نے محسوس کیا کہ جہانگیر کے لہجے میں اکبر بول رہا ہے۔بلاشبہ اس نے بھی وہی انداز حکمرانی اپنا لیے تھے مگر کسی حد تک بدل کر۔وہ کہہ رہا تھا۔''میرے باپ نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ ایک شہزادے کے فرائض کیا ہوتے ہیں۔خرم۔!ہماری قسمت میں حکمرانی کرنا لکھ دیا گیا ہوا ہے اور خدا نے ہمیں اس مقصد کے لیے منتخب کیا ہے۔ہم کوئی ڈاکو یا لٹیرے نہیں جنہوں نے اقتدار پر قبضہ جمایا ہے۔ہم فاتحین ہیں۔ہم چنگیز خان اور تیمور لنگ کی اولاد ہیں۔جن کی فطرت میں حکمرانی کی صلاحتیں ہیں۔ایک شہزادے کو فقط یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اس کی مملکت کو زیادہ سے زیادہ کس طرح مستحکم بنایا جاسکتا ہے۔اگر وہ اپنی ذات کو مقدم رکھے گا تو بہت کچھ کھودے گا۔مجھے یقین ہے کہ تم نے آئین اکبری پڑھی ہوگی لیکن ہندوؤں کے مزاج اور طریق سیاست کو سمجھنے کے لیے تمہیں کوتلیہ چانکیہ کی ارتھ شاستر بھی پڑھنی چاہیے۔''

''جی شہنشاہ معظم۔!میں اسے ضرور پڑھوں گا۔''

''میں نے مملکت کے بارے میں سوچا، اسے سبقت دی ہے تو شہنشاہیت کے لیے خود کو تیار کیا ہے۔ جب تمہیں اقتدار مل جائے گا تو تمہیں معلوم ہوگا کہ مجھے کس طرح سوچنا چاہیے تھا۔ میرے بیٹے ہماری زندگیاں فقط ہمارے لیے نہیں ہیں، یہ حکومت اور عوام کے لیے ہیں۔ پورا ہندوستان ہماری طرف دیکھتا ہے۔''

''جی شہنشاہ معظم۔! خرم نے ہنکارا ابھرا اور اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جام کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ خرم نے سوچا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ اس کے باپ کو محبت کی ضرورت نہ رہی ہو۔ اس نے محبت کی تھی لیکن اکبر نے اسے محبت نہیں دی۔ بلکہ اس نے سیاسی حلیف بنانے کے لیے اپنا بیٹا استعمال کیا۔ یقیناً وہ اب تک اکبر کے فیصلوں کی روشنی میں چل رہا تھا۔ خرم نے بادشاہ کے چہرے پر ایسے واضح اشارے تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے اسے اپنا مقصد حل ہوتا دکھائی دے۔ بادشاہ کا سراپا، انداز نشست تک بدل گیا تھا۔ وہ خمار آلود ہو گیا تھا۔

جہانگیر نے جام خالی کیا اور غلام کو واپس کر دیا۔ اس نے خرم کو غور سے دیکھا جیسے اسے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اب تک وہ بھی نہیں سمجھ پایا تھا کہ خرم کس مقصد کے لیے اس کے پاس آیا ہے۔ شاید وہ یہ جاننے کی کوشش میں تھا کہ اس کا بیٹا بھی اس کی طرح محبت کے تجربے سے گذر چکا ہے۔ جو ایک جذباتی الجھاؤ والا مشکل ترین راستہ ہوتا ہے۔ جہانگیر نے جب پہلی بار مہر النساء کو دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنے باپ کی فرمانبرداری میں اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اسے یہ احساس گومگو کی کیفیت میں مبتلا کر رہا تھا کہ کیا وہ اپنی محبت کو بھلا بیٹھا ہے یا نہیں؟ کیا شہنشاہ بن جانے سے محبت ختم ہو گئی؟ اسے یوں لگا جیسے جہانگیر نے اس کے خیالات پڑھ لیے تھے۔

''میں نے تمہاری محبت کو دیکھتے ہوئے تمہاری منگنی ارجمند بانو سے کر دی۔ غیاث بیگ اب میرا وزیر ہے اور آصف خاں میرے وفاداروں میں شامل ہے۔ لیکن ذرا سوچو۔! ارجمند بانو سے شادی کر لینے کے بعد تمہاری سلطنت کو کیا مضبوطی فراہم ہو سکتی ہے؟''

یہی وہ لمحات تھے جن کی کوکھ میں آنے والے حالات کی چکا چوند بھری جھلک تھی۔ کھو جانے کا احساس پوری طرح ابھرا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ ناامیدی میں بولا۔

''وہ مجھے خوشی دے گی۔''

''کاش تم نے میری بات غور سے سنی ہوتی۔'' بادشاہ کا لہجہ قدرے بدل گیا۔ اس نے خرم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے

ہوئے کہا"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہماری زندگیاں فقط ہمارے لیے نہیں ہیں۔ایک سپاہی کی بات یا خواہش کا اثر زیادہ سے زیادہ اس کی اپنی ذات یا اس کے خاندان پر ہوگا۔لیکن اگر خرم کسی خواہش کا اظہار کرے یا کوئی دعویٰ کرے تو اس کا اثر پوری مملکت پر پڑے گا۔ارجمند بانو اپنے ساتھ کیا لائے گی،دولت۔؟ طاقت؟ یا کوئی اقتدار،کوئی سیاسی حلیف۔؟اس سے شادی کر کے کیا تمہارے دوستوں میں اضافہ ہوسکتا ہے؟ میں اکبر کی نصیحت ایک بار پھر تمہارے سامنے دہراتا ہوں کہ اپنی سلطنت کو وسعت دیتے رہو۔اگر میرے ہر سوال کا جواب ہاں میں ہے تو میں تمہیں ارجمند بانو سے شادی کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔"

"آپ جانتے ہیں جہاں پناہ کی ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔"

"تو پھر یہ مسئلہ حل ہو چکا"جہانگیر نے پیار سے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔

"مگر اس کے ساتھ میری منگنی ہو چکی ہے اور وہ میری محبت............"

"تمہاری پہلی شادی مملکت کے مفاد کے لیے ہوگی۔تم ارجمند سے شادی کر لینا اور اسے دوسری بیوی کے طور پر رکھ لینا، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔اگر تم اس سے اسی طرح محبت کرتے رہے تو............ورنہ تم جوان ہو اور تم ولی عہد سلطنت کے لائق ہو۔یہ عشق و محبت اب بھول جاؤ۔"

"نہیں جہاں پناہ۔! ارجمند ہی میری پہلی بیوی ہوگی۔اس کے علاوہ نہیں۔"شہزادہ خرم ہٹ دھرمی پر اتر آیا اس کے لہجے میں ایک بیٹے کا مان بھی تھا۔

"میرے سامنے حکم مت چلاؤ شہزادے۔"شہنشاہ کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں اور چہرہ سخت گیر ہو گیا۔جیسے ہمدردی اور محبت کا نقاب اتر گیا ہو۔"تم وہی کرو گے جس کا تمہیں حکم دیا جائے گا۔اب جاؤ، میں تھک چکا ہوں۔"

"شہنشاہ معظم۔اپنے فیصلے پر نظر.................."

"جاؤ............"

شہنشاہ نے سختی سے کہا تو خرم کے اندر غصہ عود کر آیا۔اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ بادشاہ مزید غصے میں آ جائے۔وہ اٹھا اور تعظیم کے لیے جھکا اور تیزی سے باہر جانے کے لیے لپکا۔تبھی بادشاہ نے اونچی آواز میں کہا۔

"میں نے تمہارے لیے بیوی کا انتخاب کر لیا ہے۔"

اس آواز کے تعاقب میں وہ مڑا نہیں اور نہ ہی یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کون ہے۔ وہ رکا نہیں بلکہ وہاں سے چلا گیا۔ اسے حالات کی سلوٹوں کے بارے معلوم ہو گیا تھا۔

شاہی قافلہ کو آگرہ سے کوچ کیئے دو دن ہو گئے تھے۔ شہنشاہ جہانگیر اجمیر کی طرف جا رہا تھا۔ یہ شاہی قافلہ مغلیہ تزک واحتشام کے ساتھ رواں دواں تھا۔ لوگوں اور مویشیوں کا ایک سیلاب تھا جو بہتا چلا جا رہا تھا۔ شاہی قافلہ کے ابتداء میں بارہ ہاتھی تھے جن کے جلو میں شہنشاہ جہانگیر اپنے پسندیدہ ہاتھی پر سوار تھا۔ اس کے ساتھ ہودج میں شہزادہ خرم بھی موجود تھا۔ دن کے پہلے پہر کا سورج چمک رہا تھا جس کی کرنیں ان کے سنہری ہودج کو چمکا رہی تھیں۔ ہاتھیوں کو شاہانہ وقار کے مطابق آراستہ کیا گیا تھا جو دھوپ میں چمک رہی تھے۔ ان کے آگے سنہری زین، رکاب اور نعل کے ساتھ سفید گھوڑے تھے جن پر شاہی محافظوں کے عہدیدار پورے وقار کے ساتھ براجمان تھے۔ ان کے ہاتھوں میں شاہی پرچم پکڑے ہوئے تھے، جن میں ایک بڑا پرچم سبز رنگ کا تھا اور اس پر ''مغل اعظم'' لکھا ہوا تھا۔ ان گھوڑوں اور ہاتھیوں کے درمیان شاہی نقارہ بج رہے تھا۔ جس کے بجانے والے یوں محسوس ہو رہے تھے کہ وہ دیوانے ہو گئے ہو۔ شاہی نقارہ مسلسل بجتا چلا جا رہا تھا۔ شہنشاہ کے اردگرد کئی سارے لوگ عطر کی پھواریں مارتے ہوئے چل رہے تھے تا کہ شہنشاہ مٹی اور دھول سے بچا رہے۔ جہانگیر کی سواری کے پیچھے ''ہزاری'' تھے۔ ان کا رعب وجلال ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ ان کے ساتھ ہزار سوار تھے جو ان کے اشارے پر چل رہے تھے۔

جہانگیر کے پیچھے چار ہاتھیوں پر اس کے وزیر سوار تھے۔ وہ اپنے ساتھ دفتر بھی لائے تھے کہ اگر کسی بھی وقت بادشاہ کو ،کسی معلومات کی ضرورت پڑے تو اسے فوراً مہیا کر دیں۔ یہ معلومات آگرہ سے اجمیر تک کے درمیانی علاقے کی تھی۔ وہ کس گاؤں سے گزر رہے ہیں، اس کا سربراہ کون ہے، وہاں سے کتنی آمدنی ہوتی ہے، وہاں کی فصلیں اور لوگ کیسے ہیں؟ جہانگیر اپنی معلومات کو ہمیشہ تازہ رکھا کرتا تھا۔ جس کے لیے باقاعدہ ایک محکمہ تھا اور اس پر زرکثیر خرچ ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ ہی'' جہانگیر نامہ'' کے مولف بھی تھے جنہیں جو معلومات چاہیے ہوتی وہ طلب کر لیتے۔ انہی کے ساتھ دو دو کی جوڑی میں کئی

سارے لوگ تھے۔ یہ لوگ وہ فاصلہ ناپ رہے تھے جو شاہی قافلہ طے کر چکا تھا۔اس فاصلے کی ابتداء لال قلعے سے ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ایک رسہ پکڑا ہوا تھا۔ایک شخص نشان پر کھڑا ہو جاتا تو دوسرا آگے بڑھ جاتا۔ یوں اس کی مدد سے فاصلہ ناپ کرایک کتاب میں درج کیا جاتا۔انہی کے ساتھ ایک شخص نے گھڑی تھامی ہوئی تھی جو شیشے کی تھی۔ جونہی ایک گھنٹہ ہوتا تو ایک شخص جس نے تانبے کی گھنٹی پکڑی ہوئی تھی پورے زوروں سے بجا دیتا۔

ان کے پیچھے کئی گھڑ سوار تھے جو خوبصورت انداز میں آراستہ تھے۔دو گھڑ سواروں نے اپنی کلائیوں پر شاہین بٹھائے ہوئے تھے۔چار سواروں نے بندوقیں پکڑی ہوئیں تھیں۔ پانچویں نے نیزہ اٹھایا ہوا تھا، چھٹے نے تلوار، ساتویں نے ڈھال ،آٹھویں نے خنجر ،نویں نے کمان اور دسویں نے ترکش پکڑا ہوا تھا۔ یہ سب علامتی اسلحہ بردار تھے۔ان ہتھیار برداری کے بعد ''احادی'' تھے۔ یہ وہ شاہی محافظ تھے جو براہ راست بادشاہ کے حکم کے تابع تھے۔ان کے جلو میں تین شاہی پالکیاں تھیں۔ ہر ایک سونے، چاندی اور موتیوں سے مرصع تھی۔بادشاہ چاہتا تو ان پالکیوں میں سے کسی ایک میں سفر کر سکتا تھا۔ان پالکیوں پر شاہی پرچموں کے سائے تھے۔جن پر مختلف علامتیں،نعرے اور لقب درج تھے۔

ان علامت برداروں کے بعد حرم کی خوتین سوار تھیں۔وہ سب ملکہ جودھی بائی کے زیر سایہ تھیں۔جبکہ ملکہ ایک ہاتھی پر سوار تھی جس پر چھتر لگا سونے کا تخت تھا اور وہ قیمتی پتھروں سے مزین تھا۔اگر چہ وہ بیمار تھی لیکن اس نے جہانگیر کے ساتھ سفر کرنے کو ترجیح دی تھی۔حرم کی ان خواتین کے لیے درندہ صفت لڑاکا ازبک عورتوں کی فوج ہمراہ تھی۔جنہوں نے نیزے تھامے ہوئے تھے۔ان کے ساتھ سم چڑھی لاٹھیاں پکڑے خواجہ سراڈگ بھرتے چلے جا رہے تھے۔ان کے علاوہ غلام، کنیزیں اور خدمت گار تھے۔

ان کے عقب میں اونٹوں،اور بیل گاڑیوں کا قافلہ تھا جس پر سرکاری دستاویزات لدی ہوئیں تھیں۔کیونکہ یہ ممکن نہیں تھا کہ بادشاہ امور مملکت کو نظرانداز کر سکے۔وہ جہاں بھی جاتا، جہاں بھی ہوتا اس کا دربار ساتھ ہوتا۔اسی طرح ہاتھی، اونٹ اور گھوڑے بڑی تعداد میں ایسے بھی تھے جن پر شاہی خزانے سے زیورات،طلائی و نقرئی سکے وغیرہ لدے ہوئے تھے۔ بادشاہ کا ذاتی سامان،حمام،خلوت خانے،قمرغہ کے لیے ساز و سامان اور پھر اس کے پیچھے راجپوت شہزادہ جے سنگھ تھا،جس کا منصب آٹھ ہزاری تھا اور اس کے سپاہ چلے آرہے تھے۔

شاہی قافلہ سے ایک کوس پہلے کے سفر پر گھڑ سوار چلتے چلے جا رہے تھے۔ان کے پاس سفید کپڑے کے تھان تھے۔

یہ اس لیے تھا کہ اگر انہیں کوئی مردہ شخص یا جانور دکھائی دے تو اس پر کپڑا ڈال دیں یا ممکن ہو تو انہیں دفن کر دیں۔ تا کہ بادشاہ کے لیے ناگواری کا باعث نہ بن سکے۔ اس سے بھی آگے ایک دن کے فاصلے پر ایک اور قافلہ رواں دواں تھا۔ یہ شاہی قافلہ ٹھہرنے اور اس کے پڑاؤ کے لیے بندوبست کرتا تھا۔ اس کے ساتھ با قاعدہ نوکروں کی فوج ہوتی جو یہ سارا انتظام کرتی تھی۔ سب سے پہلے جگہ کا انتخاب کیا جاتا تھا زیادہ تر دریا کے کنارے یا کوئی جھیل ان کی ترجیح میں شامل ہوتی تھی۔ اس کے بعد خیموں کا ایک شہر آباد کر دیا جاتا تھا۔ بادشاہ کا خیمہ ان کے درمیان لگتا۔ یہ خیمہ دو منزلہ ہوتا جو ایک دیوان عام اور دیوان خاص سمیت ایک محل کی طرز پر عالی شان ہوتا تھا۔ اس میں کئی سارے کمرے ہوتے تھے۔ خیموں کی یہ ترتیب تیمور لنگ کے دور سے وہی تھی۔ سبھی کو علم ہوتا تھا کہ کس نے کہاں ٹھہرنا ہے۔ جانور اور مویشی کہاں باندھے جائیں گے۔ ان میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ شاہی قافلہ پہنچتے ہی وہ لوگ چل پڑتے تا کہ اگلے پڑاؤ کا انتخاب کیا جا سکے۔ اس دوران اگر بادشاہ شکار یا دیگر تفریحات کی وجہ سے ایک مقام پر زیادہ دن بھی گذارتا تو پیش رو قافلے سے شاہی قافلے کا رابطہ رہتا تھا۔ اس طرح راستوں کے متعلق بھی پوری معلومات رہتی تھی۔

شاہی قافلہ رواں دواں تھا۔ اس قافلے کے ساتھ ارجمند بانو بھی سفر کر رہی تھی۔ اسے گمان نہیں تھا کہ قافلے کی ابتداء کہاں سے ہے اور یہ ختم کہاں پر ہوتا ہے۔ وہ اپنی پالکی میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کیا اس کا محبوب بھی اس قافلے کے ساتھ سفر کر رہا ہے یا نہیں؟ اس وقت اس کے ذہن میں وہ ساری افواہیں سرگوشیاں اور باتیں گونج رہی تھیں جو مختلف حوالوں سے اس تک پہنچی تھیں۔ یہ سب شہنشاہ اور شہزادے کے درمیان ہونے والی باتیں تھیں جو کچھ عرصہ پہلے کمرہ خاص میں ہوئیں تھیں۔ سبھی کو معلوم تھا کہ شہزادہ خرم اور ارجمند بانو کی منگنی ہو چکی ہے لیکن اب نئی بیوی کیوں منتخب کی جا رہی ہے؟ جس کے ہاتھ بھی یہ بات آئی اس نے اپنی رائے شامل کر کے اپنی نئی اختراع ڈال کر رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی لیکن افسانے بہت سارے بن گئے تھے۔ اس سے بھی کئی سارے لوگوں نے جن میں عورتیں زیادہ تھیں اس پہلو پر گفتگو کی۔ ان سب کی باتوں میں جھوٹا غم، مسرت افزاء دکھ یا بناوٹی ترس پنہاں تھا۔ وہ لوگ بھی چاہتے تھے کہ ارجمند اس پر اپنی کوئی رائے کہے لیکن وہ خاموش رہی۔ اپنی کوئی بھی رائے دینے سے اجتناب کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے کہے ہوئے لفظ کیسی صورت میں پھیل جائیں گے۔ شاید لفظ وہی رہیں لیکن لہجہ تو ان لوگوں کا اپنا تھا۔ وہ بااعتماد تھی اور اس کا یہ اعتماد صرف اور صرف شہزادے کی اس سے محبت کی وجہ سے تھا۔ کم ازکم اس نے بادشاہ کے سامنے اپنا مدعا تو کہا۔ اس ضمن میں گفتگو تو کی۔

وہ خود ہی اپنی سوچوں سے گھبرا گئی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پالکی کا پردہ ہٹایا تو اسے دھول ہی دھول دکھائی دی۔ بھوری دھول جو آسمان تک چڑھی ہوئی تھی۔ جس نے ماحول کو گدلا کر کے رکھ دیا تھا۔ جب شاہی قافلہ گذر جاتا تو یہی دھول درختوں اور پودوں پر گر کر ان کے سنہری مائل رنگ کو بھورا کر کے رکھ دیتی۔ تبھی اسے اپنا غلام عیسیٰ دکھائی دیا۔ تب اس نے سوچا کہ خرم کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ ’’کیا بات ہے آقا زادی؟‘‘ ارجمند کے مسلسل اس کی طرف دیکھتے رہنے پر عیسیٰ نے قریب آ کر پوچھا۔

’’کیا تمہیں معلوم ہے کہ شہزادہ خرم بھی اس قافلے کے ساتھ سفر کر رہا ہے یا نہیں۔‘‘ اس نے پوچھا۔

’’نہیں آقا زادی۔‘‘ اس نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

’’تو پھر معلوم کرو۔‘‘ یہ کہہ کر ارجمند نے اپنی چاندی کی انگوٹھی اسے دے دی۔ اور کہا ’’اسے معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس قافلے کے ساتھ سفر کر رہی ہوں اور تمہیں معلوم ہے کہ کل ہم نے اس قافلے کا ساتھ چھوڑ دینا ہے۔‘‘

’’جی آقا آزادی۔! میں پوری کوشش کرتا ہوں۔‘‘ عیسیٰ نے انگوٹھی لی اور اپنے کپڑوں میں چھپا لی۔ پھر وہاں سے ہٹ گیا۔ ارجمند نے دیکھا قافلے کے ساتھ ساتھ گھڑ سوار آگے پیچھے حفاظت کے لیے بھاگتے پھر رہے تھے۔ اسے یہ خوف بھی لاحق ہو گیا کہ کہیں عیسیٰ محافظوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔

......☆......

خرم اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس میں وہی شاہی وقار اور تمکنت تھی جس طرح اس کے باپ شہنشاہ جہانگیر میں دکھائی دے رہی تھی۔ شہنشاہ ہاتھی کے چلنے سے پیدا ہونے والے ہلارے سے قدرے مست ہو گیا تھا۔ یوں جسے کوئی پالنے میں جھولا جھول رہا ہو۔ تاہم خرم کسی چیتے کی طرح مستعد اور ہر طرف نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ دن ختم ہونے کو تھا اور پڑاؤ بھی نزدیک آ چکا تھا۔ منزل سامنے دیکھ کر جس طرح راہی کے قدم تیز ہو جاتے ہیں اسی طرح شاہی قافلے میں بھی تیزی آ گئی تھی۔ اک شور مچ گیا تھا غلغلہ بلند تھا جو شاہی نقارے میں مدغم ہو رہا تھا۔ دن ڈھلنے سے ذرا پہلے قافلہ پڑاؤ پر آن ٹھہرا۔

اس وقت شہزادہ خرم اپنے خیمے کے کمرہ خاص میں موجود تھا کہ خدمت گار رضا اندر داخل ہوا۔ وہ تعظیم سے جھکا اور بولا

’’شہزادہ معظم۔! شاہی قافلے کے ساتھ ارجمند بانو بیگم صاحبہ بھی محو سفر ہیں۔‘‘

''کیا۔!'' شہزادے نے حیرت سے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟''

''آج دوپہر کے وقت ایک غلام آپ کے متعلق مختلف لوگوں سے دریافت کرتا پھر رہا تھا لیکن کسی نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا کہ آپ قافلے کے ساتھ ہیں یا نہیں۔ وہ بھی بہت محتاط انداز سے پوچھ رہا تھا۔ یہ خبر مجھ تک بھی پہنچ گئی۔ اس لیے میں نے تصدیق کرنا مناسب خیال کیا۔ میں نے جب معلومات لیں تو پتہ چلا کہ ارجمند بانو بیگم صاحبہ ہمارے ساتھ محوِ سفر ہیں اور وہ غلام انہی کا تھا۔''

''تمہیں پتہ ہے کہ وہ کہاں ٹھہری ہیں۔'' شہزادے نے پوچھا تو خدمت گار رضا فوراً سمجھ گیا کہ اصل میں شہزادے خرم کی منشاء کیا ہے۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا اور واپس کے لیے مڑ گیا۔

......☆......

ارجمند بھی دوسری خواتین کی طرح نہا دھو کر تر و تازہ ہو چکی تھی مگر ان خواتین کی طرح کسی بھی تفریحی مشغلے میں شامل نہیں ہوئی تھی۔ دیگر خواتین نے بھی لباس تبدیل کیا تھا اور کھانے کے لیے تیار تھیں لیکن وہ اپنے خیمے میں چپ چاپ پڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے عیسیٰ نے آکر اسے بتایا تھا کہ شہزادے کے بارے میں کوئی معلومات نہیں مل سکیں۔ وہ قدرے نڈھال سی ہو رہی تھی اور ایک انجانا غم اس پر مسلط ہو چکا تھا۔ خیموں کے اس آباد شہر میں کہیں سے موسیقی کی آواز، کہیں سے قہقہے، اونچی آواز میں باتیں، ہوا کے دوش پر تیر رہی تھیں۔ ابھی چاند نہیں نکلا تھا۔ اس لیے اندھیرا ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ خیموں کے اندر روشن قندیلیوں سے اس آباد شہر کا پتہ چل رہا تھا۔ ارجمند کے ساتھ آئیں ہوئیں ملازم خواتین اپنے اپنے معمولات میں مصروف تھیں۔ رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی کہ عیسیٰ اجازت لے کر اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''کیا بات ہے عیسیٰ۔'' اس نے اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر پوچھا۔

''آقا زادی۔! کوئی پیام بر ہے اور آپ کی راہ تک رہا ہے۔''

''کون ہے وہ، کس کی طرف سے آیا ہے؟'' ارجمند نے نڈھال لہجے میں کہا۔

''شہزادہ خرم کی طرف سے۔'' عیسیٰ ادب سے بولا

''اس سے پیغام لے لو اور اس سے کہو کہ میں اس کا جواب بھجوا دوں گی۔'' وہ لاپرواہی سے بولی۔

''آقا زادی۔! وہ پیام بر اس بات پر مصر ہے کہ وہ پیام آپ ہی کو دے گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ وہ پیام وصول کر

لیں۔''عیسیٰ نے اس بار قدرے اصرار سے کہا تو وہ ہچکچاہٹ سے اٹھ گئی۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔میں آتی ہوں۔''اس کے یوں کہنے پر عیسیٰ پلٹ گیا۔

خیموں کا وہ عارضی شہر دور تک پھیلا ہوا تھا۔رات گہری ہو کر قدرے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ہوا بھیگ جانے سے بوجھل ہو رہی تھی، جب ارجمند دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی ہوئی عیسیٰ کی رہنمائی میں آگے بڑھی تھی۔اس نے دیکھا کہیں کہیں آگ کے الاؤ روشن تھے یا پھر لالٹین کی مدہم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔عیسیٰ ایک شخص کے قریب جا کر رک گیا جو خیموں سے قدرے ہٹ کر گہرے اندھیرے میں کھڑا تھا اس کا منہ ڈھکا ہوا تھا۔

''کون ہو تم ،اور تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''ارجمند نے سخت لہجے میں کہا تو اس اجنبی شخص نے اپنے منہ سے کپڑا ہٹا دیا۔لالٹین کی مدہم سی روشنی میں ارجمند کو شہزادہ خرم کا چہرہ دکھائی دیا تو وہ ساکت سی رہ گئی۔نہ سنبھلنے والا خوشی کا طوفان اس کے من میں اٹھا اور وہ پور پور بھیگ گئی۔غیر متوقع خوشی انسان کو بے حال کر کے رکھ دیتی ہے۔اسے ہوش آیا تو عیسیٰ ان کے قریب نہیں تھا۔

''حضور آپ۔!''ارجمند کے منہ سے فقط اتنا ہی نکل سکا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے تمہارے بارے میں پتہ چلے اور میں تم سے ملنے نہ آؤں۔''

''مگر آپ کے بارے میں تو پتہ ہی نہیں...................''

''میں نے یہ دو دن شہنشاہ کے ساتھ سواری کی ہے۔شاہی محافظوں کا حصار توڑ کر کوئی بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن صرف اس وقت جب بادشاہ خود چاہتا۔''

''مجھے تو بس احساس ہی ہوا تھا کہ آپ بھی اس قافلے کے ساتھ موجود ہیں۔''

''لیکن تم اس قافلے کے ساتھ کیسے؟''

''میں بنگال جا رہی ہوں۔ پھوپھی مہر النساء اور پھوپھا شیر افگن کے پاس۔میں کئی دنوں سے خواہش کر رہی تھی کہ دادا نے اس قافلے کے ساتھ چلے جانے کو کہا۔''

''ہاں وہ بھی ساتھ ہیں۔اس کا مطلب ہے کل دوپہر سے پہلے تم اس قافلے سے جدا ہو جاؤ گی۔''

''جی حضور۔!''ارجمند نے کہا تو ان میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔تبھی شہزادہ خرم نے کہا

''ارجمند۔! تم کہیں مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟''

''میں آپ سے ناراض کیوں ہونے لگی۔ آپ نے جو کہا وہ کر کے دکھایا۔'' اس نے تیزی سے کہا تو شہزادہ خرم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ تبھی ارجمند نے شرمگیں احساس اپنے اندر اٹھتا محسوس کیا۔ وہ یوں کبھی بھی کسی سے تنہا نہیں ملی تھی۔ مگر وہ شخص تو اس کا اپنا تھا۔

''ہاں۔! لیکن حالات کبھی بھی اتنے ہموار نہیں رہ پائیں گے۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔''

''شہزادہ معظم۔! حالات کی ناہمواریاں تو زندگی کی خوبصورتی ہیں یہی تو انسان کو آگے اور بہت آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔''

''بے شک۔! مگر کاش میں ایک عام سپاہی ہوتا تو آسانی سے اپنی محبت کو پا چکا ہوتا۔ میں ایک عام سا سپاہی نہیں اس لیے میرے سامنے رکاوٹیں بھی عام سی نہیں ہیں۔ میں ولی عہد سلطنت کے طور پر چن تو لیا گیا ہوں۔ اس لیے میری آزمائش بھی سخت ہے۔ مجھے اپنے باپ کے معیار پر بھی پورا اترنا ہے اور مجھے اپنی محبت بھی حاصل کرنی ہے۔

''میں نے اس شہزادے خرم سے محبت نہیں کی جو ولی عہد سلطنت ہے میری محبت تو اس عاشق صادق کے لیے ہے جس نے اپنے جذبوں سے میرا دل لے لیا تھا۔ بتایئے! میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟

''جب تک میں بااختیار نہیں ہو جاتا، ہمیں یہ سختیاں اور بوجھ برداشت کرنا ہوں گے۔''

''کہیں یہ اتنی شدت اختیار نہ کر جائیں کہ ہماری محبت اس میں گم ہو جائے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' خرم نے پختہ عزم سے کہا پھر چند لمحوں بعد ہنستے ہوئے کہا ''تمہیں معلوم ہے کہ میں جو یہاں تک چھپ کر آیا ہوا ہوں۔ اگر پکڑا گیا تو میرا کس قدر نقصان ہو سکتا ہے۔ ایک عام سپاہی ہوتا تو اسے سزا دے دی جاتی اور قصہ ختم لیکن میرا اعتماد ٹوٹ جائے گا۔ میری شخصیت کے مطابق افواہوں کا ایک بازار گرم ہو جائے گا۔''

''مجھے تو بس آپ کی محبت چاہیے۔''

''اس کا تم یقین کرو، میں تم سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوں۔ میں تم سے اور تخت دونوں سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے'' ارجمند نے محبت کی پھوار میں بھیگتے ہوئے کہا۔

''یہی کہ کسی کی بات پر بھی دھیان مت دو۔بس میری محبت کا یقین رکھو جو صرف تمہارے لیے ہے۔''

''میں انتظار کروں گی اور آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔''

شاید وہ مزید باتیں کرتے کہ عیسیٰ کی گھبرائی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔'' آقا زادی۔!''

اچانک سحر ٹوٹ گیا۔وہ کیف آگہیں لمحے ہوا میں تحلیل ہو گئے اور وہاں ان کے درمیان خوف در آیا۔عیسیٰ اپنی لاٹھی اٹھا چکا تھا اور شہزادہ خرم نے اپنی تلوار کا دستہ اپنے ہاتھ میں لے لیا جو ایک لمحہ میں باہر نکال سکتا تھا۔

''کون ہو تم۔؟''عیسیٰ کی آواز ابھری۔

''میں رضا ہوں۔''ایک اور سرگوشی ابھری''شہزادہ معظم سے کہیں اب ہمیں نکلنا چاہیے۔''

ارجمند نے خرم کے چہرے کی طرف دیکھا۔وہاں سکون تھا۔اس نے اپنا ہاتھ تلوار کے دستے سے ہٹا لیا اور نرم آواز میں بولا''میرا خدمت گار ہے۔'' پھر ایک لمحہ کو ٹھہر کر بولا''میں نہیں چاہتا کہ کسی پہرے دار یا ازبک عورت کی نگاہوں میں آ جاؤں اور یہ خبر شہنشاہ تک پہنچ جائے۔'' یہ کہہ کر خرم نے ارجمند کی ہتھیلی کو قدرے دبایا اور پھر اپنے ہونٹوں کے پاس لے جا کر چوم لیا۔تمہارا لمس کس قدر شاندار ہے۔گلاب کے پھول کی پتی کی طرح نرم''

''شہزادہ معظم۔''رضا کی سرگوشی ابھری۔

''میں انہیں حفاظت سے باہر نکال دوں گا۔تم جاؤ......''عیسیٰ نے کہا اور پھر وہ سامنے نمودار ہو گیا۔شہزادہ اٹھا اور لالٹین کی پیلی مدھم روشنی میں ارجمند کے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی اور ایک طرف کو نکل گیا۔جہاں اندھیرے میں اس کا ہیولا بھی گم ہو گیا تھا۔

خرم کے ہونٹوں کا وہ لمس ساری رات اس کی ہتھیلی کی پشت پر سلگتا رہا۔یہ ایک ایسا درد تھا جس میں سکون،تسکین اور فرحت تھی۔کچھ دیر کے وصل نے ایک طویل فراق کو یوں ختم کر کے رکھ دیا تھا جیسے گہرے اندھیرے میں روشنی کی ہلکی سی کرن تاریکی دور کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔اگرچہ شہزادے بہت جلد اپنا وعدہ بھول جاتے تھے لیکن ارجمند کو اپنی محبت پر یقین تھا۔

اگلے دن وہ شاہی قافلے سے الگ ہو گئے۔اب ان کی رفتار زیادہ تیز تھی۔شاہی قافلہ تو ایک سیل رواں کی طرح اپنی رفتار سے بڑھ رہا تھا۔جبکہ ان کا قافلہ پانچ سو گھڑ سواروں کی حفاظت میں بڑھ رہا تھا۔اس کے علاوہ ملازمین عورتیں اور

مرد تھے۔انہوں نے کہیں بھی خیمے نصب نہیں کرنا تھے بلکہ ان کا پڑاؤ کسی بھی سرائے میں ہونا تھا جو پوری سلطنت میں بنائی گئیں تھیں۔ دوران سفر کہیں قیام کرنا ہوتا تو قافلے ان سرائے میں قیام کرتے تھے۔ان کا پڑاؤ بھی ایسی ہی ایک سرائے میں ہوا۔ سپاہیوں نے سرائے کو حفاظتی مقصد کے لیے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔انہیں سرائے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔صرف قریبی ملازمین ہی ارجمند کے ساتھ موجود تھے۔

ارجمند خواب گاہ میں لیٹی ہوئی خرم کے خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ابھی نینداس کی آنکھوں میں نہیں اتری تھی۔وہ اس سکون اور اُمید کا احساس کر کے مخمور ہو رہی تھی جو گذشتہ رات شہزادہ خرم نے اسے دی تھی۔وہ اس وقت خود میں اتنا اعتماد محسوس کر رہی تھی کہ اگر اسے اس پھیلی ہوئی کائنات میں سے کہیں دوسری کائنات میں بھی سفر کرنا پڑتا تو گریز نہ کرتی۔صرف اپنی محبت کو پانے کے لیے وہ دشوار گزار راہوں پر بھی چل سکتی تھی۔اس نے خواب گاہ کی کھڑکی سے نظر آنے والے تھوڑے سے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں ستارے جھلملا رہے تھے۔اس نے سوچا کیا یہ ستارے کسی انسان کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں؟ وہ ستارے جو خود کائنات کی پابندیوں میں مجبور محض ہیں۔اور جنہیں نام ہی انسان نے دیا اور ان کی شناخت بنائی۔وہ ان کی قسمت کو کیسے بدل سکتے ہیں۔یہ جوتشیوں کے حساب کتاب یونہی ٹامک ٹوئیاں اور اندازے ہیں۔اصل شے تو انسان کا اپنا ارادہ ہے۔انسان کے ارادے میں ہی کائنات کی قوتیں شامل ہوتی ہیں۔اور یہ کائنات۔! جو انسان کو ہمیشہ سے حیرت میں مبتلا کرتی آ رہی ہے اس کے رمز کی جستجو بھی تو عشق کی مرہون منت ہے۔عشق ہی وہ قوت ہے جو انسان کے محدود تصور کو انتشار کا شکار نہیں کرتی، بلکہ وہ یکسوئی عطا کرتی ہے جس سے وہ لاشعوری طور پر اس قدر طاقتور ہو جاتا ہے کہ کائناتی رمز اس پر آشکار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔کائنات اور زمین کا رشتہ اٹوٹ انگ کی طرح ہے جس میں صرف ایک ہی قوت کارفرما ہے اور وہ ہے باہمی کشش، محبت بھی اسی طرح پروان چڑھتی ہے جس میں طرفین کی کشش موجود ہو یا پھر کسی ایک طرف ہی سے۔زمین۔! جو نجانے کب سے آباد ہے اور اس پر نجانے کتنے فاتحین آ کر گذر گئے۔وہ سبھی مٹی میں مل گئے اور دوام ہے تو اس فطرت کو جو قدرت کی مظہر ہے جس کی راہ پر چل کر انسان خالق حقیقی کو پا لیتا ہے کہ فطرت میں ہی آیات موجود ہیں۔

کیا وہ شہزادے خرم کے لیے اپنا آپ گم کر سکتی ہے؟ یا اگر اسے طاقت، دولت اور دنیاوی لذتوں کو ترک کرنا پڑے تو وہ کر سکتی ہے؟ اس کا جواب ہاں میں تھا، اسے صرف اپنا محبوب چاہیے کہ وہی ایک اس کی تمام تر خوشیوں کا منبع بن چکا تھا۔وہ

کون ہوسکتی ہے جسے جہانگیر نے شہزادہ خرم کی بیوی کے طور پر منتخب کر لیا تھا؟ یہ تجسس تو فطری تھا۔ بلاشبہ یہ شادی سیاسی اتحاد کے لیے تھی۔ تو کیا وہ کسی ہندو عورت سے شادی کرے گا جیسے جہانگیر کی جودھی بائی سے ہوئی؟ اگر یہ شادی سیاسی اتحاد ہی کے لیے ہے تو جہانگیر کن لوگوں سے ہاتھ ملانے والا ہے؟ پرسکون رات میں اس قدر خاموشی تھی کہ ہلکی سی سرسراہٹ بھی واضح سنائی دے رہی تھی اور اس کے ذہن میں سوالوں کے آتش فشاں پھٹ رہے تھے۔ اچانک اس نے سارے خیالات کو جھٹک دیا۔ کمرے میں لوبان سلگنے کی خوشگوار مہک تھی وہ اسے محسوس کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ملازم عورتیں اس کے اردگرد سو رہی تھیں اور خواجہ سرا عیسیٰ دہلیز پر پڑا سو رہا تھا۔ سارا ماحول پرسکون اور خمار آلود تھا۔

وہ اس وقت ابھی نیند کے سمندر میں ساحل کے قریب ہی تھی کہ اسے گھڑ سواروں کی آمد کا احساس ہوا۔ لحہ لحہ گھوڑوں کی ٹاپیں بلند ہو رہی تھیں۔ پھر اچانک وہ ان کی سرائے کے نزدیک خاموش ہو گئیں۔ اس کے ساتھ سنتری کی للکار ابھری۔ اس کے بعد باتوں کی آوازیں آنے لگیں جن کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کچھ وقت گذر جانے کے بعد عیسیٰ کی نرم آواز ابھری۔

''آقازادی۔!''

اس کی دوسری آواز پر ارجمند نے جواب دیا۔ ''کیا بات ہے عیسیٰ۔''

''آقازادی۔! شہنشاہ کی طرف سے پیام بر آیا ہے، وہ صرف آپ ہی سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' اس کی آواز پر ارجمند کی ملازم عورتیں بیدار ہو گئیں۔ خواب گاہ میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شہنشاہ ہی کا پیام بر ہے۔''

''جی آقازادی۔! ہمارے حفاظتی دستے کے حاکم فتح سنگھ نے اس بات کی تصدیق کر لی ہے۔''

''ٹھیک ہے، اسے بلاؤ، میں آتی ہوں۔'' ارجمند نے کہا تو ملازمہ نے اسے بڑی ساری چادر لا کر دی تا کہ اس سے وہ باحجاب ہو کر جائے۔

وہ شخص دوسرے کمرے میں کھڑا تھا۔ وہ تنہا تھا اور اس کا چہرہ ایک بڑی سی پگڑی کے پلو سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ اسلحہ سے لیس تھا اور اس نے قدرے عجیب سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ سپاہی کی وردی نہیں تھی۔ ارجمند دروازے کے ایک طرف ہو کر بولی۔

''کون ہوتم۔!'' ارجمند کی آواز پر وہ شخص چونکا۔

''میں احادی اور شہنشاہ کا پیغام رساں ہوں بیگم صاحبہ۔!''

''مگر نہ تم نے وردی پہنی ہوئی ہے اور نہ ہی زرہ بکتر۔''

''میں شہنشاہ کا خفیہ پیغام آپ تک لے کر آیا ہوں۔ میرے بارے میں فتح سنگھ تصدیق کر چکے ہیں۔'' اس نے بے چینی سے کہا، وہ کسی طرح بھی ایک احادی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کی مخصوص گلناری وردی ہوتی تھی اور پھر شہنشاہ نے ایسا کونسا خفیہ پیغام دینا تھے جو ایک ایسے شخص کو بھیجنا پڑا جو ڈاکو دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا ہے پیغام۔!'' ارجمند نے رعب سے کہا۔

''بیگم صاحبہ! یہ تحفے ہیں جنہیں آپ ذاتی طور پر مہر النساء بیگم تک پہنچا دیں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے کپڑوں کی تہہ سے دو چھوٹے چھوٹے ڈبے نکالے۔ وہ دونوں ہی ریشمی کپڑے میں بند تھے اور ان پر شاہی مہر لگی ہوئی تھی۔

''یہ عیسیٰ کو دے دو، مجھ تک پہنچ جائیں گے۔''

ارجمند کے کہنے پر اس نے وہ ڈبے عیسیٰ کو دے دیئے اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ارجمند کے لیے یہ لمحے انتہائی تکلیف دہ تھے۔ شہنشاہ نے کس قدر دانش مندی سے اسے اس کی اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ وہ انکار کی جرات نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ جہانگیر کی محبت کی نشانیاں اٹھا کر مہر النساء تک لے جانی تھیں۔ وہ ان دونوں کے درمیان تعلق سے آگاہ تھی اور جذباتی کیفیت سے بھی مطلع تھی جو ان کی ایک دوسرے کے لیے تھی۔ کیا شہنشاہ اس کی محبت سے آگاہ نہیں تھا، کیا اس کی محبت اس قابل نہیں تھی کہ اسے اہمیت دی جائے؟ یہ ستم ظریفی نہیں تھی کہ کچھ کہے بنا اسے خرم کو بھول جانے کے لیے احساس دلایا جائے۔ کیا وہ خرم اور اس کی محبت کو بھول سکتی ہے؟ نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی، کسی شہنشاہ کا حکم بھی اسے اپنی خواہش سے باز نہیں رکھ سکتا۔ اس نے سامنے کھڑے پیام بر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کوئی اور بات۔!''

''یہی کہ میں اپنے دو سو سواروں کے ساتھ آپ کے عقب میں بنگال تک جاؤں گا۔''

''کیا یہ بھی شہنشاہ کا حکم ہے؟'' ارجمند نے انتہائی طنز سے کہا وہ اپنا غصہ دبا نہیں پائی تھی۔ اس پر احادی خاموش رہا تو وہ بولی ''کیا سب احادی ہیں؟''

''جی بیگم صاحبہ! اور میں نے یہ صرف آپ کو بتایا ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں۔''

''ملکہ معظّمہ کیسی ہیں؟'' ارجمند نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اچھی نہیں ہیں بیگم صاحبہ۔! ان کی طبیعت خاصی بگڑ گئی ہے۔''

جودھی بائی کوچ سے پہلے ہی بیمار تھی۔ وہ کچھ بھی کھا پی نہیں سکتی تھی۔ جیسے ہی وہ کھاتی یا پیتی فوراً قے کر دیتی۔ تمام تر علاج رائیگاں جا رہے تھے اور وہ دن بدن کمزور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ شاہی طبیب نے انہیں سفر سے منع کیا تھا لیکن جہانگیر کے اصرار پر اسے شاہی قافلے کے ساتھ کوچ کرنا ہی پڑا۔

''اور شہزادہ خرم......!'' ارجمند نے دھیرے سے پوچھا۔

''وہ بھی ٹھیک ہیں۔'' احادی نے ادب سے کہا

''ٹھیک ہے، اب تم جا سکتے ہو۔'' ارجمند نے کہا تو احادی تعظیم سے جھکا اور پلٹ کر دوسرے دروازے سے باہر نکل کر لمحوں میں تاریکی کا حصہ بن گیا۔

اگرچہ احادی شہنشاہ کے براہ راست ذاتی محافظ تھے اور اسی کو جوابدہ تھے۔ وہ اپنا خاص مقصد کسی سے بھی نہیں کہتے تھے۔ تاہم وہ سمجھ رہی تھی کہ شہنشاہ نے ان احادیوں کو ان کے عقب میں کیوں بھیجا ہے؟ انہیں ان تحائف کی نگرانی کرنا تھی جو ارجمند کو دے دیئے گئے تھے کہ وہ انہیں مہر النساء تک پہنچا دے۔ کیا وہ تحائف اس قدر غیر معمولی نوعیت کے ہیں؟ ارجمند نے سوچا اور واپس مڑ کر اپنی خواب گاہ میں آ کر لیٹ گئی۔

اگلی صبح جب ان کے قافلے نے کوچ کیا تو احادی گھڑ سوار ان سے کافی فاصلے پر عقب میں چلے آ رہے تھے۔ ان کی موجودگی سے قافلہ سالار فتح سنگھ بے چین ہو گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ احادی ہیں کیونکہ انہوں نے شاہی وردی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ فتح سنگھ بہادر نوجوان تھا۔ وہ ایک ہزاری منصب پر فائز تھا۔ ان کا خاندان ہمایوں کے زمانے سے مغل فوج میں خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ سو وہ بھی اپنے آباء واجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مغل فوج میں شامل ہو گیا تھا۔

وہ محو سفر تھے اور ان کے بڑھتے ہوئے قافلے کے ساتھ منظر بھی بدلتے جا رہے تھے۔ ان مناظر کی تبدیلی انتہائی غیر محسوس انداز میں تھی۔ ان کے راستے میں کئی طرح کی زمین آئی تھیں چٹیل میدان، گھنی جھاڑیاں، سرسبز جنگل اور تھوڑا بہت چٹانی علاقہ۔ ہر خطے کی انفرادیت الگ سے تھی۔ وہاں کی بود و باش، لوگ، لباس، پرندے، جانور اور فصلیں مختلف تھیں۔ وہ

ہر گاؤں کے پاس سے گذرتے جا رہے تھے۔ وہی لوگ انہیں دکھائی دیتے جو کھیتوں میں کام کر رہے ہوتے یا اکا دکا کوئی راہ گیر ہوتا۔ گاؤں ویسے ہی تھے جیسے ان غریب لوگوں کے ہوتے ہیں، مٹی اور گارے سے بنے ہوئے۔ یا پھر جھونپڑیاں دکھائی دیں جو گھاس پھوس اور درختوں سے کاٹی ہوئی شاخوں سے بنائی گئیں تھیں۔

ایک صبح جب ان کا قافلہ روانہ ہونے کو تھا۔ ارجمند اپنی پالکی میں بیٹھ چکی تھی۔ تب فتح سنگھ اس کی پالکی کے قریب آیا اور نہایت ادب سے کہا۔

'' بیگم صاحبہ۔! ہمارے راستے میں چند کوس کے فاصلے پر کھجوارا کے تاریخی مندر ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو انہیں دیکھا جائے؟''

'' ہاں میں نے ان کے بارے میں سنا تو ضرور ہے۔'' ارجمند نے جواباً کہا

'' وہاں کی تاریخی حیثیت کے ساتھ ساتھ آرٹ کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ بلاشبہ آپ ان سے لطف اندوز ہوں گی۔'' فتح سنگھ نے دھیمی اور نرم مسکراہٹ سے کہا

'' ٹھیک ہے ہم وہاں جائیں گے۔'' ارجمند نے کہا تو فتح سنگھ نے اپنے گھوڑے کو موڑ لیا اور کوچ کا حکم دے دیا۔

اس وقت ابھی ماحول میں صبح کی خوشگواریت موجود تھی۔ سورج اتنا اوپر نہیں اٹھا تھا کہ گرمی محسوس ہوتی۔ ان کا قافلہ رک گیا۔ ارجمند کی پالکی رکھ دی گئی۔ یقیناً کھجوارا آ گیا تھا۔ وہ اتر آئی۔ ان کے ساتھ چند محافظ، تھوڑے سے نوکر، خواتین ملازم اور عیسیٰ تھا۔ باقی سب وہیں رک گئے۔ وہ فتح سنگھ کی رہنمائی میں کھجوارا کے مندروں کی جانب چل پڑے۔ انہیں دور ہی سے مندروں کے کلس دکھائی دینے لگے۔ یہاں تک کہ وہ ان کے سامنے آ گئے۔ اصل میں وہ چند مندروں پر مشتمل عبادت گاہ تھی۔ جنہیں ہندوؤں نے تعمیر کیا تھا۔ وہ پتھریلی زمین تھی جن میں بہت گہری کھائیاں تھیں۔ وہاں جا بجا مندر دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے مہاتما بدھ کا بھی ایک بہت بڑا مجسمہ دیکھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک نزدیکی گاؤں میں جا پہنچے۔ وہاں کی آبادی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ شاید وہاں پر کبھی بہت بڑی آبادی رہی ہو؟ ارجمند نے سوچا اور ان خواتین کو دیکھنے لگی جو بڑی حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تھالیاں پکڑی ہوئیں تھیں جن میں پھول، ناریل اور پتے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ بلاشبہ وہ مندر کی طرف جا رہی تھیں کیونکہ ان کا رخ اس طرف تھا جدھر سے مندر کی گھنٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''یہ مندر کئی سوسال پرانے ہیں۔'' فتح سنگھ نے قریب آ کر کہا۔''اس کی صحیح قدر و قیمت تو نجانے کب لگے گی لیکن اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے انہیں تراشا کیسے گیا ہے؟'' پھر ذرا رک کر بولا'' دراصل یہ ایک ہندو ریاست تھی اور یہاں کے حکمران بہت زیادہ حوصلہ اور برداشت رکھتے تھے۔ یہاں پر بدھا کو ماننے والے بھی تھے اور جین مت کے ماننے والے بھی موجود تھے۔ مذہب تو رواداری کا نام ہی ہے نا۔'' فتح سنگھ بڑے جوش سے بول رہا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر بڑے کروفر سے بیٹھا ہوا تھا۔ یہی باتیں کرتے ہوئے وہ مندر کے نزدیک چلے گئے۔ وہ مندر پہاڑی تراش کر بنایا گیا تھا۔ اس میں اتنی سیڑھیاں تراشی ہوئی تھیں کہ لگتا تھا کہیں آسمان میں گم ہو جائیں گی۔ وہ گھوڑوں سے اتر گئے اور پیدل چلتے ہوئے مندروں تک جا پہنچے۔ جبکہ محافظ نیچے ہی کھڑے رہ گئے۔

جیسے ہی ارجمند کی نگاہ مندر کے باہر تراشے ہوئے بتوں پر پڑی تو وہ دم بخود رہ گئی۔ اس نے سنا ضرور تھا کہ ان مجسموں کو اس طرح تراشا گیا ہے کہ مرد اور عورت کی محبت کو بڑے دلکش انداز میں دکھایا گیا ہے۔ اسے گمان تک نہیں تھا کہ ان کا انداز اس قدر شہوانی ہوگا۔ اسے یوں لگا جیسے بسولے کی مدد سے ذہنی غلاظت ان مندروں کے در و دیوار پر تھوپ دی گئی ہو۔ وہ ننگ دھڑنگ مجسمے انسان کے وحشی دور کی یادگار معلوم ہو رہے تھے۔ ارجمند کا چہرہ غصے میں سرخ ہو گیا لیکن اس نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ ارجمند کے باحجاب چہرے کو فتح سنگھ نہیں دیکھ سکا۔ کافی وقت یونہی گذر گیا۔ فتح سنگھ کی محویت نہ ٹوٹی تو ارجمند نے انتہائی نرم انداز میں کہا۔

''فتح سنگھ۔! یہ بڑے حیرت کی بات ہے کہ ہندوؤں نے اس طرح کے ہیجان انگیز مجسمے اپنی عبارت گاہوں کو سجانے کے لیے بنائے ہوئے ہیں؟''

''اصل میں یہی خدائی حسن ہے وہ فطرتی حسن جسے پیش کیا جانا چاہیے۔'' فتح سنگھ نے قدرے کروفر سے کہا اور پھر چند ٹوٹے ہوئے بتوں کی طرف اشارہ کر کے بولا ''غزنوی نے ان بتوں کو توڑا۔ ان کے حسن کو تباہ کرنے کی کوشش کی لیکن فن کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ بیرونی حملہ آوروں نے سرزمین ہندوستان کی بہت سی جگہوں پر مندروں کو مسمار کیا۔ ان پر مسجدیں تعمیر کیں اور اب بھی ایسا ہی ہے، ہندوستان پر اسلام کو مسلط کر دیا گیا ہوا ہے اب بھی مندروں کو مسمار کیا جاتا ہے۔'' فتح سنگھ کے اندر سے جذباتی ہندو بولنے لگا تھا اور ارجمند نہیں چاہتی تھی کہ ان لمحات میں اس سے بحث کی جائے۔ وہ خاموش رہی۔

وہاں پر آنے والی خواتین نے اپنی پوجا ختم کر لی تھی۔ وہ بڑی حیرت سے وہاں آئے اس ہجوم کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ

شرمیلی، پرتجسس اور خاموش کھڑی تھیں۔ ارجمند نے ان سے بات کرنا چاہی لیکن وہ دھیرے سے ہنستی ہوئیں وہاں سے چلی گئیں۔ ان کی ہنسی میں کھسیانہ پن تھا وہ اپنے چہرے چھپاتی وہاں سے چلی گئیں۔ مندر کی سیڑھیوں کے سرے پر پنڈت کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں خمار آلود تھیں اور وہ ان کی طرف بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا اوپری بدن ننگا تھا۔ اس نے سفید دھوتی پہن رکھی تھی اور شانوں پر پیلا کپڑا دھرا ہوا تھا۔ اس نے جنیو پہن رکھی تھی۔ اس کے گنجے سر کے پیش رو ماتھے پر تین افقی لکیریں تھیں۔ یہ قشقشہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ شیوا کا پجاری ہے۔ ارجمند نے چند لمحے اسے غور سے دیکھا اور پھر سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ بالکل پجاری کے پاس پہنچ گئی۔ دونوں کے درمیان فاصلہ ایک سیڑھی تھا۔ تبھی اس پنڈت نے ارجمند کا راستہ روک لیا۔

''تم مسلمان ہو، اس لیے مندر کے اندر نہیں جاسکتی،'' پنڈت تیزی سے بولا۔

''کیوں۔! کیا یہ عبادت گاہ نہیں ہے؟'' ارجمند نے انتہائی نرمی سے کہا۔

''ہے۔! مگر مسلمانوں کے لیے نہیں،'' پنڈت نے نہایت نفرت سے کہا۔ اتنے میں فتح سنگھ آگے بڑھا اور اس نے پنڈت کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تم جانتے ہو یہ خاتون کون ہے؟ شہنشاہ جہانگیر کی ہونے والی بہو، شہزادہ خرم کی منگیتر، غیاث الدین اعتمادالدولہ کی پوتی، آصف خاں کی بیٹی............''

''شما کیجیے مہاراج۔'' پنڈت نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ''مجھے پتہ نہیں کہ اتنی مہان ہستی یہاں پر پدھاری ہیں۔ آیئے......'' پنڈت بچھا جا رہا تھا۔ ارجمند وہیں جم کر کھڑی ہوگئی تو فتح سنگھ نے کہا۔

''بیگم صاحبہ۔! آگے بڑھیں۔''

''نہیں فتح سنگھ ہم کسی کی دل آزاری نہیں کریں گے۔ میں بس یہیں سے اس مجسمے کو دیکھ لوں گی جو پھولوں سے لدا ہوا ہے۔'' ارجمند کی نگاہ کی سیدھ میں فتح سنگھ نے دیکھا شیوا کے مجسمے پر پھول چڑھے ہوئے تھے۔ ارجمند واپس لوٹ آئی۔ وہ سب سے آگے تھی۔ باقی سب اس کے پیچھے۔ وہ سیڑھیاں اتر چکی اور اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر واپس قافلہ کے پاس پہنچ گئی۔

جس وقت ''غور'' شہر کے آثار دکھائی دینے لگے تھے، اس وقت احادی گھڑ سوار ان کے عقب میں نہیں رہے۔ ان کے بارے معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ انہیں راستے کی دھول نگل گئی یا وہ واپس چلے گئے ہیں۔ ارجمند تو یہ بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ اس

سے احادیوں میں سے کون شخص تحائف دے گیا تھا۔اس نے کچھ دیر تک ان لوگوں کے بارے میں سوچا انہیں ذہن سے جھٹک کر وہاں کے دلفریب نظاروں میں کھو گئی۔اسے وہ خطہ خاصا پرکشش دکھائی دیا تھا۔اسے یہ تو پتہ تھا کہ یہیں کہیں نزدیک ہی دریائے جمنا بہتا ہے مگر اس کی سمت اور فاصلہ معلوم نہیں تھا۔شہر کے آثار سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ خطہ خاصا زرخیز ہے اور وہاں کے باشندے امیر ترین ہیں۔

شیر افگن کی رہائش گاہ کسی محل سے کم نہیں تھی۔کافی سارے گھرے ہوئے رقبے کے درمیان ایستادہ وہ کشادہ، وسیع اور خوبصورت عمارت تھی۔اس کے ساتھ ایک باغ بھی تھا جہاں پھلوں کے درخت وافر مقدار میں لگے ہوئے تھے۔اس کے علاوہ وہ عمارت سرسبز درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔بلاشبہ وہ ایک عالیشان رہائش گاہ تھی جو دیوان بنگال کے شایان شان تھی۔ ارجمند کی آمد بارے انہیں اطلاع ہو چکی تھی۔

اس وقت ارجمند نہا دھو کر اور کپڑے تبدیل کر کے تر و تازہ ہو چکی تھی۔وہ اس کے لیے مخصوص خواب گاہ میں آرام کی غرض سے لیٹی ہوئی تھی کہ مہر النساء آ گئی۔کچھ دیر باتوں کے بعد اس نے آگرہ سے آئے ہوئے تحائف کے بارے میں پوچھا۔ارجمند نے فوراً ہی شہنشاہ کی طرف سے دیئے گئے تحائف اسے دے دیئے۔مہر النساء انہیں پا کر بے حد خوش ہوئی تھی۔اس نے دیکھا، مہر النساء پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت، زیادہ زیورات سے لدی پھندی اور خوش دکھائی دے رہی تھی۔تحائف پانے کے بعد وہ زیادہ دیر اس کے پاس نہیں بیٹھی بلکہ طلائی و نقرئی صندوقچے اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر بولی۔

”تحائف پہنچا دینے کا بہت بہت شکریہ۔“

”یہ تو میں نے آپ تک پہنچانا ہی تھے لیکن کیا آپ مجھے نہیں دکھائیں گی کہ ان میں کیا ہے۔“ ارجمند نے شرارت سے کہا۔اسے جہانگیر اور مہر النساء کے درمیان تعلق کا احساس تھا۔مہر النساء بغیر کسی جھجک کے بولی۔

”نہیں۔! اس میں ایسا کچھ نہیں ہے جو تمہارے متعلق ہو۔“ پھر اچانک بات بدلتے ہوئے بولی۔”میں خوش ہوئی ہوں کہ تم نے ان صندوقچوں کو دیکھا نہیں ہے۔ان کی مہر یونہی لگی ہوئی ہے۔“

”آپ کو پتہ ہے پھوپھو، میں امانت میں خیانت نہیں کرتی۔“

”خیر۔! ان تحائف کا ذکر اپنے پھوپھا سے مت کرنا، وہ خواہ مخواہ شک میں مبتلا ہو جائیں گے۔“ مہر النساء نے حاکمانہ انداز میں کہا جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ماحول قدرے گھٹن زدہ ہو گیا تھا۔اس لیے وہ اٹھی اور اپنے کمرے میں

جانے کے لیے چل دی۔

ارجمند نے آگرہ سے غور کا سفر صرف شیر افگن کے بلاوے پر نہیں کیا تھا۔ وہ حالات کی نئی کروٹ سے پریشان ہو گئی تھی۔ اس تک جو بھی باتیں پہنچی تھیں ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ شہنشاہ کے لیے وہ اب کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور اب شاید ہی اس شادی شہزادہ خرم سے ہو پائے۔ اسے جہانگیر اور مہر النساء کے درمیان ریشمی تعلق کے بارے میں معلوم تھا۔ اسے یہاں تک احساس تھا کہ ان کے درمیان اب بھی گہرے روابط ہیں۔ اپنی پھوپھی مہر النساء کے پاس آنے کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ براہ راست شہنشاہ سے بات کرے۔ ارجمند یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ اسے شاہی اعزازات، حاکمیت اور اختیارات سے کوئی غرض نہیں، وہ صرف شہزادہ خرم کو چاہتی ہے اور اس سے پورے دل سے محبت کرتی ہے۔ اگر شہزادہ خرم ولی عہد نہیں بھی رہتا، اگر اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں رہتی وہ تب بھی اسے چاہتی رہے گی۔ اس کے علاوہ اب شہزادہ خرم سے اس کا نام جڑ گیا تھا۔ ہر جانب یہی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اس کی منگیتر ہے۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ شہزادہ خرم کو بھول جاتی۔ وہ اس کی ہو چکی تھی اور وہی اس کے من میں جگہ پا چکا تھا۔ شہنشاہ بذات خود محبت کے انہی احساسات و جذبات کی کیفیات سے گذر چکا تھا۔ وہ مہر النساء سے مدد کی طلب گار تھی۔ آگرہ میں اس کے قریبی لوگ اسے یہی باور کرا رہے تھے کہ وہ اب شہزادہ خرم کو بھول جائے یہاں تک کہ اس کی ماں نے بھی اسے ایسا ہی کرنے کی تلقین کی تھی مگر وہ ایسا کر نہیں سکتی تھی۔ اپنی محبت کو بھول جانے کی بات تو ایسے ہی تھی کہ جسم سے روح کو الگ کر دیا جائے۔ لیکن غور پہنچتے ہی اس کا ارادہ تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ اب مہر النساء سے مدد کی طالب نہیں تھی۔ اس بھیگی ہوئی اندھیری رات میں شہزادہ خرم کے اعتماد بھرے لفظوں نے اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ اضطراب جو آگرہ سے اس کے ساتھ ہم رکاب تھا۔ وہ راستے کی دھول میں تحلیل ہو کر وہیں کہیں رہ گیا تھا۔ اس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ اس ضمن میں مہر النساء سے کوئی بات کرے۔ اسے تو صرف اپنے تحائف سے غرض تھی۔ اس نے ارجمند سے کوئی ایسا احوال دریافت نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ بھی خاموش رہی۔

اگلے دن ارجمند نے فتح سنگھ کو طلب کر لیا۔ ایسا ہوتا نہیں تھا اس لیے وہ حیرت کے عالم میں شیر افگن کی رہائش گاہ پہنچا۔ ارجمند پردے کے پیچھے سے فتح سنگھ کو دیکھ رہی تھی جو فوجی انداز میں تنا ہوا باادب کھڑا تھا۔

''فتح سنگھ۔! کھجوارا کے مندروں میں تراشے ہوئے مجسموں کے بارے میں تمہاری رائے مجھے معلوم ہے۔ اس کے بارے میں تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟''

''جی بیگم صاحبہ۔! وہ فطرتی حسن کا شاہکار ہیں۔ وہاں تراشے ہوئے مجسمے اتنے خوبصورت ہیں کہ انہیں دیکھ کر سانسیں رک جاتی ہیں۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ جیسے بسولے کی مدد سے پتھروں کو گوشت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ بلاشبہ وہ مجسمہ سازی کے فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔'' اس کے لہجے میں وہی فخر اور کروفر تھا جسے وہ پہلے بھی سن چکی تھی۔

''لیکن۔! کیا تمہیں اندازہ ہے کہ وہ مجسمے کون سا پیغام دے رہے ہیں؟''

''یہی بیگم صاحبہ۔! کہ جس نے شہوانی سوچ رکھنی ہے وہ انہی دیواروں کے سائے میں رہے، اگر وہ عبادت کے لیے آیا ہے تو وہ اپنے ذہن کو صاف ستھرا کر کے مندر کے اندر داخل ہو جائے۔''

''تو گویا تم نے یہ تسلیم کر لیا کہ شہوانیت کا پرچار ذہنی غلاظت ہے۔ جس کا عبادت گاہ میں آنا غلط ہے۔''

''میرا یہ مطلب............''

''بے جا دلیلیوں کے پردے میں حقیقت نہیں چھپائی جا سکتی فتح سنگھ۔ میری رائے اس سے بہت مختلف ہے۔ یہ برہمن ازم ہے، جو ہندوؤں کو ہی نہیں تمام انسانوں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ یاد رکھو۔! شہوانیت کے گرد زندگی کا مدار گھمانے سے غلامیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ شہوانیت انسانی ذہن میں موجود فطری صلاحیتوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ برہمن نے شہوانیت کے ہتھیار کو بڑے موثر طریقے سے استعمال کیا ہے۔ وہ فن صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے قابل ہے جو غلامیت کا باعث بنے۔''

''مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے بیگم صاحبہ کو ہم اپنے دیوی دیوتاؤں کے مجسموں کو ختم کر دیں۔ اور کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ کسی کے دھرم میں مداخلت کرے۔''

''کیا تم نے اپنے پنڈت کا رویہ دیکھا تھا اور اس بے جان مورتی پر نگاہ ڈالی تھی؟ تمہارے پنڈت نے مجھے صرف اس لیے روکا کہ میں مسلمان ہوں۔ مان لیا ان کے حساب سے ان کی پوترتا میں فرق پڑتا ہے تو پھر ہر حال میں فرق پڑنا چاہیے۔ جب اس نے سنا کہ میں کون ہوں تو اس نے مندر کے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ کیا پھر فرق نہیں پڑتا؟ اس کے رویے سے ایک اور بات سامنے آتی ہے فتح سنگھ کہ کیا سارا دھرم پنڈت ہی کا فرمایا ہوا ہے؟ کیا اور کیوں کہنے کی کوئی گنجائش نہیں؟ بھگوان کی بنائی ہوئی جیتی جاگتی مورتی کی تذلیل کر کے، بے جان پتھروں کو پھولوں سے لاد دینا اور پھر اس کی پرستش کرنا خلاف عقل وفطرت نہیں تو اور کیا ہے؟''

''آپ ایک مسلمان سوچ کا اظہار کر رہی ہیں بیگم صاحبہ۔!'' فتح سنگھ کے لہجے میں غصہ دبا ہوا تھا۔

''یہی کچھ میں کہنا چاہ رہی ہوں کہ کھجوارا کے وہ مجسمے تمہارے لیے تو فن کا اعلیٰ شاہکار ہیں تو دوسرے کے لیے وہ غلاظت کے ڈھیر ہیں۔ ان پر فخر کرنے کی بجائے انسانیت کی بات کیا کرو، اسی میں انسانی عظمت ہے۔''

''کیا یہ انسانیت ہے بیگم صاحبہ کہ مندروں کو گرا کر ان پر مسجدیں تعمیر کر دی جائیں؟''

''اب تک کی تاریخ شاہد ہے فتح سنگھ کہ جب بھی ان مندروں میں عبادت کی جگہ حکمرانی کرنے کی سوچ کو فروغ ملا ہے، ایسا ہوتا آیا ہے۔ کیا تم نے ارتھ شاستر کا مطالعہ نہیں کیا؟ تم سپاہی ہو کر یہ بات نہیں جانتے کہ ان مندروں اور ان سے ملحقہ آشرموں میں کیا ہوتا ہے۔ انسانیت یہاں سسکتی ہے اور سازشیں پروان چڑھتی ہیں۔ کوئی بھی حکمران یہ نہیں چاہتا کہ اس کی حکمرانی کو زوال آ جائے۔ اسے جہاں سے بھی بغاوت کی بو آئے گی، وہ ایسا کرے گا کہ اس بغاوت کو کچل دے، اس کے لیے اسے جو کچھ بھی کرنا پڑے۔ تم نے غزنوی کے بارے میں بات کہی تو حقیقت بھری نگاہوں سے غور کرو، سومنات میں کیا ہوتا تھا، اگر نہیں معلوم تو جاؤ پتہ کرو۔''

''مجھے معلوم ہے بیگم صاحبہ۔! لیکن دھرم کا پالن کرنا ایک ہندو کا فرض ہے۔''

''میں تمہیں اس سے منع نہیں کر رہی۔ بس یہی کہنا چاہتی ہوں کہ انسانیت کو مقدم رکھو۔ غلامیت کے ماحول کو مزید پختہ کرنے سے باز رہو، دوسروں پر اپنی سوچ مت مسلط کرو۔''

''جی بیگم صاحبہ۔'' فتح سنگھ نے گویا ہتھیار ڈال دیئے۔ شاید اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی یا پھر وہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش کھڑا رہا تو ارجمند نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ ایک خوشگوار شام تھی۔ سورج ڈھلنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بڑے فرحت بخش معلوم ہو رہے تھے۔ گرمی کا زور کم ہوا تھا اور موسم میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ شیر افگن کی رہائش گاہ کے باغ میں اس قدر شادابی تھی کہ گویا بہار اتری ہوئی تھی۔ انہی لمحوں میں شیر افگن، مہر النساء، لاڈلی اور ارجمند بانو باغ کے ایک شاداب کونے میں بیٹھے باتوں میں محو تھے۔ مہر النساء کسی بات پر کھلکھلا کے ہنس دی تھی۔ تب ارجمند نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اسے آئے ہوئے چند دن ہوئے تھے اور ان دنوں میں وہ مہر النساء کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ کافی حد تک بدل گئی تھی اور تمام تر معمولات خوشی خوشی سرانجام دے رہی تھی۔ جیسے کوئی اس کے ہاتھ ہفت اقلیم لگ گیا ہو۔ اس

نے سوچا شاید بادشاہ کی طرف سے تحائف پانے کے بعد وہ خوشی سے معمور ہوگئی تھی۔اس نے کئی بار مذاق میں مہرالنساء سے پوچھا تھا کہ آخر وہ تحائف کیسے تھے؟ لیکن ہر بار وہ ٹال گئی تھی۔مہرالنساء کو بات کرنے کا ہنر آتا تھا۔وہ اپنی زبان کی نرمی سے دوسرے کو بہت جلد شیشے میں اتار لیتی تھی۔شیرافگن سے اس کا رویہ بہت ہی چاہت بھرا تھا۔وہ محبت کرنے والی بیوی کے علاوہ عشوہ طراز محبوبہ جیسا طرزِ عمل رکھتی تھی۔بلاشبہ شیرافگن ایک بہادر اور جوانمرد تھا۔وہ اگر بنگال کا دیوان بنا تھا تو اس میں تمام تر اس کی اپنی محنت اور صلاحیت تھی۔اس نے کبھی بھی مہرالنساء کے باپ غیاث بیگ کے اختیارات کا سہارا نہیں لیا تھا۔مہرالنساء پورے دل سے اپنی محبت کا اظہار کیا کرتی تھی۔وہ ایک وفا شعار بیوی کی مانند شیرافگن کا خیال رکھتی تھی۔یہ سب دیکھ کر ارجمند اکثر سوچ میں پڑ جاتی تھی کہ کیا یہ وہی عورت ہے یا اس کے خیالات بدل گئے ہیں؟ پہلے تو وہ کہا کرتی تھی کہ مرد کو قابو کرنا بہت آسان ہے اور اسے دھوکہ دینا اور زیادہ آسان، پیار کے دو بول یا پھر چند آنسو اپنی بات منوانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔یہ ارجمند کا مشاہدہ تھا کہ مہرالنساء اس فن میں بہت ماہر تھی۔جبکہ اس کے مقابلے میں لاڈلی انتہائی پژمردہ ہوگئی تھی۔اگرچہ اس نے تیزی سے قد نکالا تھا اور وہ لڑکی سے زیادہ عورت معلوم ہوتی تھی لیکن اس میں شرمیلا پن ختم نہیں ہوا تھا۔وہ پہلے سے زیادہ کم گو اور بدحواس سی ہوگئی تھی۔نجانے اس میں اعتماد کیوں نہیں آرہا تھا۔اس کی وجہ بھی شاید مہرالنساء تھی۔جیسے گھنے برگد کے تلے چھوٹا پودا پرورش نہیں پاتا، اس طرح مہرالنساء کے ہوتے ہوئے، اس کے حاکمانہ رویے کے سامنے لاڈلی میں خوداعتمادی نہ آسکی تھی۔مہرالنساء کے قہقہے کی گونج ابھی تک فضا میں معلق تھی کہ شیرافگن نے مسکراتے ہوئے ارجمند سے کہا۔

''اچھا ہوا تم آگئی ہو اور یہاں ہمارے گھر کا ماحول بہت حد تک خوشگوار ہوگیا ہے ورنہ تو تمہاری پھوپھو بہت بے حال رہا کرتیں تھیں۔وہ غم زدہ، نڈھال اور بے چین تھی۔دیکھو! تمہارے آنے سے یہ کس قدر خوش ہوگئی ہے۔''اس نے مہرالنساء کے چہرے کی طرف صدقے واری ہونے کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ارجمند کو شیرافگن پر بہت ترس آیا۔وہ کس قدر غلط فہمی میں تھا۔کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ کس وجہ سے خوش ہے اور اس کا مزاج کیسے خوشگوار ہوا ہے۔انہی لمحوں میں مہرالنساء نے فوراً بات کا سرا پکڑا اور روئے سخن شیرافگن کی طرف کر کے بولی۔

''حضور۔! بہت عرصہ ہوا، ہم باہر نہیں نکلے، اب تو ارجمند بھی آئی ہوئی ہے۔آپ اگلے ہفتے میں قمرغہ کا بندوبست کیوں نہیں کرتے۔اسے بھی یہ علاقہ دیکھنے کا موقعہ ملے اور اسے معلوم ہو کہ بندوق سے شیر کا شکار کیسے ہوتا ہے۔''

''مگر تمہیں تو بندوق چلانا نہیں آتی پھر تمہیں قمر غہ میں کیا لطف آئے گا۔'' شیر افگن نے دھیرے سے کہا

''میں شکار ہوتا ہوا دیکھوں گی تو سہی اور پھر جو ہم خواتین اپنی الگ سے تفریحات سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ کیا آپ ہمیں ایسا موقع نہیں دیں گے؟''

''اگر کوئی مشکل ہے تو اتنا ضروری بھی نہیں، میں شکار سے............'' ارجمند نے کہنا چاہا مگر مہر النساء نے اسے فوراً ٹوکتے ہوئے کہا

''تمہیں شاید نہیں معلوم کہ یہ کتنا بڑا علاقہ اور کس قدر حسین ہے۔ اور پھر یہاں کی تفریحات تو بہت ہی پر لطف ہوتی ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور خوشامدانہ انداز سے کہا۔ ''آپ کیجئے نا بندوبست۔''

''میں نے کیا کرنا ہے، بس حکم ہی دینا ہے۔ تم اپنی تیاری رکھو۔ اگلے ہفتے ہم قمر غہ کے لیے جائیں گے۔''

شیر افگن نے کہا تو وہ ڈھٹائی سے ہنس دی۔

قمر غہ! شکار کرنے کے ایک طریقے کو کہتے تھے۔ اس میں سینکڑوں گھڑ سوار جنگل میں ایک دائرے کی صورت پھیل جاتے پھر۔ دھیرے دھیرے وہ اپنا گھیرا تنگ کرتے جاتے، یہاں تک کہ ان کے گھیرے میں آنے والے بے شمار جانور پھنس جاتے۔ ان میں شیر، چیتے، لنگور، بیل، گائے، ہرن یا جو بھی ہوتے، آ جاتے۔ تب پھر بلحاظ عہدہ شکاری اس دائرے میں اترتے اور اپنی پسند کے جانور کا شکار کرتے۔ وہ شکار کے لیے اپنی پسند کا ہتھیار استعمال کر سکتے تھے۔ چاہے بندوق، تلوار، تیر کمان یا پھر نیزا استعمال ہوسکتا تھا۔ شکار کے اس طریقے کو تیمور لنگ نے پہلی بار استعمال کیا تھا، پھر وقت کے ساتھ اس میں تھوڑی بہت تبدیلی کی جاتی رہی۔

شیر افگن نے قمر غہ کے لیے غور کے مشرق کی جانب جنگل کا انتخاب کیا۔ اس علاقے کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں شیر زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اس جنگل کی شروعات میں ایک خوبصورت جھیل بھی تھی۔ طے یہی پایا کہ اسی جھیل کے کنارے خیمے نصب کر دیئے جائیں گے اور وہیں سے شکار کے لیے جایا جائے گا۔ اس نے ان امراء کی فہرست بھی مرتب کر لی جو اس کے ساتھ اپنی بیگمات کو بھی لے کر جائیں گے۔

ارجمند کو وہ شام بہت خوشگوار لگی تھی۔ جب وہ جھیل کنارے نصب خیموں میں پہنچے تھے۔ اس وقت دن اپنے اختتام کو تھا۔ وہ گھوڑے سے نہیں اتری بلکہ اس جھیل کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ کافی آگے آ گئی

جہاں سکوت تھا، جنگل کی فطری آواز اور جھیل کنارے پرندے اسے بہت خوبصورت لگے۔ یہ منظر اسے مدہوش کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ وہ اس فطری حسن کا حصہ بن جائے۔ اسے وہاں آئے ابھی اتنی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ مہرالنساء کے ملازم اسے تلاش کرتے ہوئے وہاں آ گئے۔ ان میں عیسیٰ بھی تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

''آپ یہاں ہیں آقازادی۔''

''ہاں۔! مجھے یہاں بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

''مگر وہاں سب آپ کے لیے پریشان ہو رہے ہیں، واپس چلیئے۔'' عیسیٰ نے اس کے گھوڑے کے لگام پکڑ لی تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ واپس مڑ گئی۔

جس قدر رات گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اسی قدر ان خیموں میں جشن طرب اپنی انتہا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شیر افگن کے خیمے میں مرد امراء جمع تھے۔ طوائفیں اور موسیقار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ طوائفوں کے لچکیلے اور اعضاء کی شاعری کرتے ہوئے جسم انہیں مدہوش کر رہے تھے۔ اس طرح مہرالنساء کے خیمے میں عورتیں جمع تھیں۔ وہاں بھی یہی لطف اندوزی تھی۔ طوائفیں اور گائیک عورتیں ان کی بھرپور تفریح کا سامان تھیں۔ گہری رات کے ساتھ گیتوں کی نوعیت بھی بدلتی چلی جا رہی تھی۔ ابتداء شوخ و چنچل گیتوں سے ہوئی تھی پھر محبت، پھر عشق اور ہجر فراق کے قصے چھڑ گئے۔ کئی گیت تو درد میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لذت کام و دہن کے ساتھ سرور انگیز تانیں بکھرتی رہیں۔ رات دھیرے دھیرے ڈھلتی رہی یہاں تک عورتیں تھک کر چور ہو گئیں۔ یہی حال مردوں کا تھا۔ وہاں کئی لوگ مدہوش ہو گئے تھے۔ وہ محفل کی سرور انگیزیوں میں یہ بھول گئے تھے کہ انہیں علی الصبح شکار کے لیے نکلنا ہے کیونکہ ہانکا لگانے کے لیے گھڑ سوار جنگل کی طرف چلے گئے تھے۔ اس وقت خواتین سونے کی تیاریاں کر رہی تھیں لیکن مردوں کی طرف سے ابھی تک ہاؤ ہو چل رہا تھا۔ ارجمند نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا کہ اگر ان کا یہی حال رہا تو وہ علی الصبح اٹھ کر نہیں جا سکتے تھے۔ مگر اسے ان سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جب چاہیں جائیں۔ وہ گیتوں کی مدھر تانوں اور خوبصورت گیتوں میں کھوئی نیند کی وادی میں اترتی چلی گئی۔

اس وقت پوہ نہیں پھٹی تھی۔ افق کناروں پر ابھی تک اندھیرا ہی تھا کہ شیر افگن کے خیمے میں زبردست تکرار کی آواز سنائی دینے لگی۔ پھر اچانک ہی یہ تکرار چیخنے چلانے اور تلواروں کی جھنکار میں بدل گئی۔ خیمے کے اندر تو قندیلوں کی روشنی تھی لیکن باہر اندھیرا تھا کسی کو کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اچانک کیا افتاد آن پڑی ہے۔ آوازوں سے سمت کی نشاندہی ہو رہی تھی۔

جس قدر تیزی سے آوازیں بلند ہوئیں تھیں ۔ مدہوش عورتیں اور مرد اتنی تیزی سے بیدار نہیں ہو سکے تھے۔لیکن جلد ہی ایک شور مچ گیا۔ ہر کسی کی زبان پر یہی تھا کہ کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیسا شور ہے؟ بہت سارے لوگ خوف کی وجہ سے چھپ گئے تھے۔ کیونکہ شیر افگن کے خیمے سے موت کا اعلان کرتی چیخیں سنائی دے رہی تھیں ۔ بندوقیں داغی جا رہی تھیں۔تلواروں کے ڈھالوں سے ٹکرانے کی آوازیں، گھڑسواروں کے نعرے اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی خوفناک آوازوں سے ماحول دہل کر رہ گیا تھا۔مرد چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ بدحواس عورتیں چھپ رہی تھیں یا بھاگ اٹھی تھیں۔ایسے میں ارجمند نے آگے بڑھ کر صورت حال دیکھنے کی غرض سے قدم اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے اسے دبوچ لیا۔

''کہاں جا رہی ہو تم؟'' مہرالنساء نے سرگوشی میں تیزی سے کہا۔

''یہ......باہر......آخر کیا ہو گیا ہے؟''

''باہر خطرہ ہے، یہیں رکی رہو'' اس نے اسی لہجے میں کہا۔

مہرالنساء قطعاً خوف زدہ نہیں تھی۔اس کا جسم تنا ہوا تھا۔وہ یوں دکھائی دے رہی تھی کہ جیسے اسے اس واقعے پر حیرت نہ ہو۔

اچانک ہی وہ ہنگامہ ختم ہو گیا۔ایک ہولناک خاموشی چاروں طرف پھیل گئی۔جس طرح قافلہ گذر جانے کے بعد دیر تک دھول فضا میں معلق رہتی ہے۔ یہ خاموشی کافی دیر تک قائم رہی۔ پھر جانوروں کی آوازوں کے ساتھ لوگوں کی بھی آوازیں ابھریں۔ مشعلیں روشن ہوئیں۔تب تک آسمان کا مشرقی افق گلابی ہو گیا تھا۔اس ہلچل میں یہ خبر پھیل گئی کہ شیر افگن قتل ہو گیا ہے۔

وہ جری بہادر زمین پر خون میں لت پت پڑا تھا۔اس کا خون گھاس پر موجود نمی میں مل کر خشک ہو رہا تھا۔وہاں پر موجود مرد اور خواتین کا ایک ہجوم لگ گیا تھا۔تلوار کا ایک گہرا گھاؤ اس کے شانے سے ہو کر گلے کو چیر گیا تھا۔وہ ابدی نیند سو چکا تھا اور اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔اس کے اردگرد کئی اور لاشیں پڑی تھیں۔صدمے، ہولناکی اور وحشت سے ارجمند بے ہوش ہونے والی ہو گئی تھی، اسے زمین پر پڑے موت سے ہمکنار شیر افگن پر ترس آ رہا تھا جس کی سپاہیانہ زندگی میں بہادری ایک ناقابل فراموش باب تھی اور اس کے قہقہے ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

مشعل جلانے سے مزید روشنی ہو گئی۔اس وقت اس کا جی اوب گیا جب خیمے کے ایک طرف خون کی لمبی سی لکیر

دیکھی۔اس کے نیچے ایک محافظ کا بے جان لاشہ پڑا ہوا تھا۔اسی طرح کئی اور لوگ موت کے خونیں پنجوں میں جکڑے ہوئے تھے۔تبھی اسی ہجوم میں سے کسی شخص کے بڑبڑانے کی آواز گونجی ''ڈاکو تھے.................''

مہرالنساءسوگوار تھی۔وہ مسلسل رو رہی تھی۔اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئیں تھیں۔جبکہ لاڈلی نے اپنے باپ کی موت کا غم بہت زیادہ محسوس کیا تھا۔وہ بے حال تھی۔اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔اس کی دبی دبی سسکاریاں گھر کے ماحول کو مزید سوگوار بناتی رہی تھیں۔پھر وہ خاموش ہوگئی اس طرح جیسے نیم پاگل ہوگئی ہو۔وہ ارجمند کی ہم عمر تھی اور فطری طور پر وہی اسے دلاسہ دے سکتی تھی۔وہی سمجھتی تھی کہ لاڈلی ایک باپ ہی سے نہیں ایک دوست سے بھی ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئی ہے۔ارجمند نے ممکن حد تک اس کی دلجوئی کی تو اسے ڈھارس ملی۔

میر بخشی نے جہانگیر کو اس واقعہ کی خبر دے دی تھی۔اس نے یہی لکھا تھا کہ شیر افگن کو ڈاکوؤں نے قتل کر دیا۔مزاحمت پر کافی نقصان ہوا۔چند دن بعد شہنشاہ کی جانب سے مہرالنساء کے لیے تعزیتی پیغام آ گیا۔اس کے ساتھ ہی بارگاہ میں طلبی کے احکامات بھی تھے۔بنگال میں موجود شہنشاہ کے اہلکاروں نے اس کے حکم کی پاسداری میں مہرالنساء کو بادشاہ کے حضور بھجوانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔وہ اس بات پر مصر تھی کہ وہ اپنے شوہر کے مقبرے کی تعمیر کے بعد ہی یہاں سے جائے گی۔اس نے شہر کے دور افتادہ علاقے میں اسی جھیل کے کنارے جگہ منتخب کی تھی جہاں وہ قتل ہوا تھا۔بہت جلد اس نے مقبرے کے لیے تعمیراتی وسائل مہیا کر دیئے۔

اس دن انہیں غور شہر سے کوچ کر جانا تھا۔لاڈلی غم سے نڈھال تھی۔وہ اس شہر کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی جہاں اس کا باپ دفن تھا۔اس کی توجہ ارجمند کی طرف نہیں تھی جبکہ وہ اس کی دلجوئی کر کے اسے جانے کے لیے تیار کر رہی تھی۔لاڈلی شدت غم سے رونے لگی تو اس نے رونے دیا۔ایسے میں اس کی نگاہ اس طلائی صندوقچے پر پڑی جسے اس نے مہرالنساء تک پہنچایا تھا۔وہ کھلا ہوا تھا اور چابی اس کے تالے میں موجود تھے۔ارجمند نے وہ صندوقچہ کھول لیا جس میں مٹھی بھر ہیرا زمردیں پارچے کے اوپر دھرا ہوا تھا۔اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔یہ وہی ہیرا تھا جسے بابر نے ہمایوں کو دیا تھا۔یہی ہیرا اپنے ساتھ موت کا پیغام رکھتا تھا۔

⸻ ✵ ⸻

''شہزادہ خرم کی دلہن محل میں آ گئی ہے۔اس کا استقبال مریم مکانی نے کیا ہے۔''

ایک وزیر کی بیگم نے حسرت ناک لہجے میں ارجمند کی ماں دیوان جی بیگم سے کہا۔جس پر دیوان جی بیگم نے پہلو بدلا اور دھیرے سے بولی۔

''کیسی ہے وہ؟''

''بہت خوبصورت۔!'' یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے جیسے کھو سی گئی، پھر کہتی چلی گئی۔''محل میں اس کے استقبال کے لیے خواتین کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔اس کے علاوہ حرم کی خواتین بھی تھیں۔اتنا ہجوم تھا کہ دم گھٹ رہا تھا۔جب اس کی آمد ہوئی تو عورتیں بالکونی سے گویا لٹک گئی تھیں۔ایک دوسری سے بڑھ کر وہ یہ منظر دیکھنا چاہتی تھیں کہ اس کے ساتھ کتنا بڑا قافلہ آیا ہے۔اصل میں یہی شے عورتوں کے لیے تجسس رکھتی تھی۔''

''کیا آپ نے بھی دیکھا؟'' دیوان جی بیگم نے پوچھا۔

''ہاں۔! میں بھی اس وقت بالکونی میں کھڑی تھی۔محل کے دروازے پر بہت زیادہ لوگ جمع تھے۔وہاں سے سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔محل کا دروازہ، اس کے آگے وسیع میدان، گلیاں، حتیٰ کہ لال قلعے کے باہر دریائے جمنا کی چمکتی ہوئی سطح بھی دکھائی دے رہی تھی۔اس جگہ کا انتخاب ہی میں نے اس لیے کیا تھا کہ سب کچھ دکھائی دے سکے۔محل کے دروازے پر اس کی پالکی آ کر رکی تو اس کے ساتھ آیا پورا قافلہ ٹھہر گیا۔پالکی ویسے ہی محل کے اندر لے آئی گئی۔حرم کے صدر دروازے پر آ کے پالکی رکی تو مریم مکانی استقبال کے لیے آگے بڑھی تھی اور پھر اسے اندر لے جایا گیا۔''

''اس کے قافلے میں کیا کچھ تھا؟'' دیوان جی بیگم نے پوچھا۔

''وہ اپنے ساتھ بیش قیمت تحائف لائی ہے جس کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ اس کے چاچا شہنشاہ ایران نے مغل اعظم جہانگیر کے لیے جو تحائف بھیجے ہیں ان میں پچاس سے زائد اعلیٰ عربی نسل کے گھوڑے اور گھوڑیاں ہیں، پانچ سو غلام، دو اونٹ طلائی سکے، چار اونٹ نقرئی سکے کے اور اسی طرح دو اونٹ قیمتی پتھروں کے ہیں۔اس کے علاوہ کنیزوں کی ایک کثیر تعداد بھی اس کے ساتھ ہے۔''

''اس خزانے کے علاوہ جو سب سے اہم چیز ہے وہ شہنشاہ ایران کی دوستی ہے جو مغل اعظم کو میسر آ گئی ہے۔'' دیوان جی بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی۔! ظاہر ہے یہ شہنشاہ ایران کی طرف سے دوستی کا پیغام ہی ہے جو اس نے مظفر حسین صفوی کی بیٹی کو مغل اعظم کے پاس اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہ اس کی شادی شہزادہ خرم سے کردے۔ بلاشبہ اس نے کئی ماہ سفر کیا ہوگا تو قندھار سے یہاں تک پہنچی ہے۔'' وزیر کی بیوی نے کہا۔

ارجمند ان دونوں خواتین کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھی۔ وہ ان سے فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسی باتیں حیرت انگیز نہیں تھیں۔ یہ ان خواتین کی معمول کی باتیں تھیں۔ چونکہ وہ اور اس کی والدہ دیوان جی بیگم اس استقبال میں نہیں تھیں، اسی لیے وہ خاتون تفصیل بتانے کے لیے آ موجود ہوئی تھی۔ کسی بھی عورت کے لیے یہ بڑی تکلیف دہ صورت حال ہوتی ہے کہ جس سے وہ منسوب ہو اس کی شادی کسی اور سے کی جا رہی ہے۔ جبکہ یہاں تو معاملہ ہی محبت کا تھا۔ ارجمند نے ان خواتین کی گفتگو سن کر اپنے من کو ٹٹولا، کہیں کوئی حیرت آمیز جذبہ، چبھن یا چھن جانے کا احساس تو نہیں؟ وہ پرسکون تھی۔ اسے اپنی محبت پر یقین تھا۔ یہی یقین ارادوں کی پختگی کا باعث ہوا کرتا ہے یہی وہ عطیہ فطرت ہے جو محبت کرنے والوں کو عطا ہوتا ہے۔

ارجمند کو چند دن پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ شہزادہ خرم کی شادی کس خاتون سے کی جا رہی ہے۔ اس شادی کی بنیاد میں سیاست تھی اور ساری کوشش سیاسی حلیف بنانے کے لیے تھی۔ یہ مہرے تھے جو شہنشاہ حکومت کی بساط پر چلتے تھے۔ شاہ ایران نے مظفر حسین صفوی کی بیٹی اور جہانگیر نے شہزادہ خرم کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہا تھا۔

قندھار۔! ایران اور ہندوستان جیسی عظیم سلطنتوں کے درمیان سرحد پر موجود آباد شہر، اہم ترین تجارتی مرکز تھا۔ یہ امیر ترین ترقی یافتہ شہر تھا۔ دونوں سلطنتوں کے لیے بہت اہم تھا اور وجہ نزاع بھی۔ اس پر شاہ ایران کا بھی قبضہ رہا تھا لیکن ان دنوں وہ مغل اعظم کی مملکت میں شامل تھا۔ ان دونوں سلطنتوں کے درمیان تعلقات کبھی بھی اچھے نہیں رہے تھے۔ بلکہ ان دونوں کے معاملات میں ایک دوسرے کے لیے سرد مہری، نفرت اور دشمنی تھی۔ شیر شاہ سوری نے جب ہمایوں کو شکست دی اور دہلی پر قبضہ کر لیا تو ہمایوں کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ اس صحرا نوردی میں وہ شاہ ایران تک جا پہنچا۔ اس نے بھی ہمایوں کو ایک شہنشاہ کی مناسبت ہی سے احترام دیا تھا۔ ہمایوں کی شاہ ایران شاہ طہماسپ سے باقاعدہ ملاقات ۹۵۱ھ میں ہوئی تھی۔ وہ شہنشاہ ایران کا مہمان رہا۔

ایک دن شاہ سے گفتگو کے دوران ہمایوں کی شکست کے بارے میں باتیں ہونے لگیں تو ہمایوں نے اس کی وجہ

بھائیوں کی منافقت اور سازشیں بتائیں۔ اتفاق سے وہیں شاہ ایران کا چھوٹا بھائی بہرام مرزا بھی موجود تھا۔ شاہ نے ہمایوں کے بیان کی نہ صرف تائید کی بلکہ اس کا ہم خیال بھی ہوا۔ بہرام مرزا کے دل میں گرہ پڑ گئی۔ ہمایوں نے جب شاہ سے امداد طلب کی تو بہرام مرزا ہی آڑے آیا۔ اس نے اختلاف مذہب کی توجہہ پیش کی اور شدید اختلاف کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمایوں سنی مذہب سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کی امداد نہیں کرنی چاہیے۔ اس پر شاہ ایران کو ہمایوں کے شیعہ عقیدہ ہونے کی بابت یقین دلوایا گیا اور ہمایوں کی یہ رباعی بطور ثبوت بھی پیش کی کہ

مائیم ز جان بندۂ اولادِ علی
ہستم ہمیشہ شاد بابا یادِ علی
چوں سر ولائیت ز علی ظاہر شد
کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علی

اس کے علاوہ ہمایوں کی شکست کی وجہ یہ بھی بتائی کہ اس کی زمام حکومت ایرانیوں کے ہاتھ میں تھی۔ قصہ مختصر شاہ ایران نے ہمایوں کو امداد دی اور قندھار فتح ہوا۔ اکبر کے زمانہ میں جب اسے تخت نشین ہوئے کچھ عرصہ ہی ہوا تھا، شاہ اسمٰعیل کے لشکر نے قندھار پر قبضہ کر لیا۔ ایران اور ہندوستان کی مملکتوں کے درمیان پہلا جھگڑا ہوا اور پھر دو متحارب سلطنتوں کے درمیان یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

سلطان مظہر حسین مرزا کے باپ کا نام بہرام مرزا ولد شاہ اسمٰعیل صفوی تھا۔ اکبر کے تخت نشین ہوتے ہی محمد خان قلاتی نے قندھار کا علاقہ طہماسپ صفوی کے حوالے کر دیا تو اس نے اپنے بھتیجے سلطان حسین مرزا کو والئ قندھار مقرر کیا، جو عرف عام میں بہرام مرزا کہلاتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں مظفر حسین مرزا، رستم مرزا، ابو سعید مرزا اور سنجر مرزا میں ٹھن گئی۔ یہ سارے بھائی باری باری دربار اکبری میں آتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مظفر مرزا نے قندھار کو اکبر کی سلطنت میں شامل کر دیا اور اس کے نام کا سکہ اور خطبہ بھی رائج کیا۔ یوں جہانگیر کے نزدیک مظفر حسین مرزا کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس کی بیٹی شہزادی گل بدن کی شادی شہزادہ خرم سے کی جانے والی تھی، جو شاہ ایران کی رشتے میں بھتیجی لگتی تھی۔ اس کی آمد بلاشبہ دوستی کا آغاز تھی اور یہ دونوں سلطنتوں کے لیے تاریخی اہمیت کی حامل تھی۔ ارجمند حکمرانی کے اس کھیل اور اس کے دور رس اثرات کو سمجھتی تھی۔ اسے یہ احساس تھا کہ اس موقع پر شہزادہ خرم کے لیے فرار ممکن ہی نہیں۔ وہ اگر فرماں برداری دکھاتا

ہے تو اسے شادی کرنا ہوگی ورنہ وہ باغی قرار دے دیا جا سکتا تھا۔

''شہزادی گل بدن ایرانی حسن کا پرتو ہے۔ اس کی عمر یہی کوئی چودہ سال رہی ہوگی۔ اس کی چال اور بدن واقعی ہی پھولوں جیسا ہے، نازک اندام، شرمیلی اور خوبصورت۔'' وزیر کی بیوی اپنی دھن میں کہتی چلی جا رہی تھی۔ ''اس کا محل میں شاندار استقبال ہوا ہے۔ ویسے اس کی آنکھیں غم سے بھری ہوئی لگتی تھی جو اور زیادہ بڑی، حسین اور خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔ مہرالنساء وہیں تھی، سلیمہ بیگم کے ساتھ۔ وہیں جودھی بائی بھی تھی۔ ان کا تعارف ہوا تو مہرالنساء کا تعارف ارجمند بانو کے حوالے ہی سے کروایا گیا۔''

''کیسے؟''

''یہی کہ یہ ارجمند بانو کی پھوپھو ہے اور گل بدن کو معلوم تھا کہ ارجمند کون ہے۔'' وزیر کی بیوی نے حیرت ناک انداز میں کہا۔

ارجمند سنتی رہی۔

یہاں تک کہ وہ وہاں آنے والی خواتین کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگی۔ ان میں ارجمند کے لیے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

......☆......

''شہزادی گل بدن............!''

خرم صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ نجانے وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہا تھا۔ مگر اس کی سوچ کے آثار اس کے چہرے پر عیاں ہو رہے تھے۔ پُرسوچ، قدرے پریشان اور تھوڑا مایوس چہرہ اس کے من کا احوال ظاہر کر رہا تھا۔

''شہزادہ معظم۔! آپ نے کچھ کہا۔'' خدمت گار رضا نے کہا تو وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔

''ہاں۔! میں نے کہا شہزادی گل بدن، جو اصفہان سے فقط میرے لیے آئی ہے۔''

''جی، اس کی آمد کا انداز شاہانہ تھا، بلکہ بہت شاندار۔'' رضا نے انتہائی ادب سے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو رضا۔! اس کا مقصد صرف مجھ سے شادی ہے، نہیں رضا، اس کے ساتھ سیاست، حکومت، مذہب اور ان کے اقدار بھی ہندوستان آئے ہیں۔ شہنشاہ ہند نے تو یہی کہا ہے کہ میری یہ شادی سیاسی حلیف بنانے کے لیے ہے۔

لیکن اس میں محبت کہیں نہیں جو دوسرے کو اپنا بنانے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے دو روحیں باہم ایک ہوتی ہیں۔ کاش حکمرانی میں محبت کو بھی ضروری خیال کیا جاتا۔'' خرم نے حسرت سے کہا تو رضا بولا۔

''حضور۔! ہوسکتا ہے وہ آپ کے لیے وفا شعار..................''

''نہیں رضا نہیں۔! رشتوں کی بنیاد میں اعتماد ہی ایسا طاقتور عنصر ہے جو تعلق کو پروان چڑھاتا ہے اور اعتماد صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب محبت ہو۔ محبت کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم محبت نہیں کرتے بلکہ محبت ہمیں تلاش کر لیتی ہے۔ بالکل ایسے کہ جیسے کسی کے سر پر ہما بیٹھ جائے۔''

''شہزادہ معظم۔! آپ کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔'' رضا نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں۔! میں ولی عہد سلطنت کا اعزاز پانے والا ہوں۔ مجھے خود پر عمائدین سلطنت کا اعتماد بحال رکھنا ہوگا۔ اس لیے محبت میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہی چیز مجھے یاد رکھنا چاہیے۔'' خرم نے حسرت سے کہا۔

شاید گفتگو مزید چلتی کہ بادشاہ کی طرف سے حکم آ گیا۔

''جہاں پناہ، شہنشاہ ہند کی یہ خواہش ہے کہ شہزادہ خرم ان کے حضور حاضر ہوں۔''

یہ بلاوا معمولی نوعیت کا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے سارے خیالات کو وہیں چھوڑا جو ایک محبت کرنے والا شہزادہ سوچ رہا تھا اور شہنشاہ کے حضور پیش ہونے کے لیے تیار ہونے لگا۔

شہنشاہ جہانگیر اپنے کمرہ خاص میں موجود تھا۔ دریائے جمنا کی جانب سے آنے والی ہواؤں سے حریری پردے دھیرے دھیرے لہرا رہے تھے۔ صندل کی خوشبو سے وہاں کا ماحول عطر بیز ہو رہا تھا۔ جہانگیر کے بائیں ہاتھ کی طرف طلائی صراحی اور جام دھرے ہوئے تھے۔ اگرچہ دمے کا مریض ہونے کے باعث جہانگیر کا چہرہ اکثر سرخ رو رہا کرتا تھا لیکن اس وقت اس کی طبیعت بحال تھی اور اس کے چہرے پر گھٹن کے آثار نہیں تھے۔ وہ خوش رو تھا۔ پہلی نگاہ پڑتے ہی شہزادے کو خوشگوار تاثر ملا۔ اس کا مطلب تھا کہ شہنشاہ کسی نزاعی مسئلے کے لیے بات نہیں کرے گا۔ اسے اپنا باپ اچھا لگا۔ اس کا سراپا، دستار اور زیورات میں ایک خاصی چمک دمک اور رعب و دبدبہ دکھائی دیا۔ وہ ایک ایسا شہنشاہ تھا جس کا حکم ہند کے کونے کونے پر لاگو ہو جاتا تھا۔ اس کا انصاف مشہور تھا۔ لیکن وہ اگر بے بس تھا تو صرف مہر النساء کے سامنے، جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ کیا محبت اور حکمرانی دو متضاد چیزیں ہیں؟ یہی سوچتے ہوئے وہ شہنشاہ کے حضور کورنش بجا لایا۔

''آؤ خرم۔! بیٹھو۔'' جہانگیر نے کمال شفقت سے اسے اپنے پاس مسند پر بیٹھنے کی اجازت دی۔ وہ بیٹھ گیا تو وہ بولا۔''شاہ ایران سے دوستانہ تعلق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''یہی کہ اگر دوستی ہو جاتی ہے تو دونوں مملکتوں کی سرحدوں پر امن ہو جائے گا۔ تجارت کو فروغ ملے گا اور رعایا سکون سے رہ سکے گی۔''

''بہت خوب۔! کیا تم نے شہزادی گل بدن کے ساتھ آئے ان گھوڑے اور گھوڑیوں کو دیکھا ہے۔''

''جی ہاں جہاں پناہ۔! وہ بہترین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''اور بلاشبہ تم گل بدن سے ملاقات کرنے کے لیے بھی بے تاب ہو گے۔ ہمارے بدخواہوں کی جانب سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ شاہ ایران کو اپنی بھتیجی کی بجائے اپنی بیٹی بھیجنا چاہیے تھی۔ مگر کیا دوستی کی شروعات کے لیے اتنا کافی نہیں ہے؟'' جہانگیر نے انتہائی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کر دیا۔

''جہاں پناہ۔! یہی وہ گفتگو طلب موضوع ہے جس پر میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' شہزادہ خرم کو وہ موقع مل گیا جس سے اس امید کا دیا روشن تھا کہ ہوسکتا ہے اس کی شادی شہزادی گل بدن سے نہ ہو پائے۔ اس ہلکی سی امید پر وہ مزاحمت کر سکتا تھا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' جہانگیر اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''جہاں پناہ۔! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ایران سے دوستی کے خواہاں ہیں اور پورے خلوص کے ساتھ ایسا چاہتے ہیں لیکن کیا شاہ ایران کی نیت بھی ایسی ہی ہے؟ کیا ہمیں آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لینا چاہیے؟ قندھار ایک ایسا تیر ہے جو اس کے دل میں پیوست ہے اور آپ بھی جانتے ہیں کہ اس کا خون اب تک رس رہا ہے۔ لال قلعے تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے سوائے شہزادی گل بدن کی صورت میں۔ اس نے اس کی بیٹی ہی کیوں منتخب کی جس نے قندھار میں اکبر کے نام کا سکہ چلایا تھا۔ شہزادی گل بدن سلطنت ہند کے لیے کسی عظیم وبا، طوفان یا قحط سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمارے اصطبل میں اس سے بھی زیادہ اچھے گھوڑے موجود ہیں۔''

''یہ تمہاری اپنی سوچ ہو سکتی ہے، ایک تاریک پہلو۔'' جہانگیر نے اس کی دلیلوں کو نرمی سے رد کر دیا۔

''میں شہزادہ خرم ہوں، اور آپ ہی نے مجھے اس سلطنت کے ولی عہد کا اہل تسلیم کیا ہے۔ اس سلطنت کا جو ایران

جتنی وسعت رکھتی ہے۔ کیا میری یہ اہمیت ہے کہ میں شاہ ایران کی بیٹی کی بجائے اس کی غیر اہم بھتیجی سے شادی کر کے اسے وہی مقام دے دوں۔ بلاشبہ اس شادی کی بنیاد میں سیاسی معاملات ہیں تو پھر انہیں اسی نگاہ سے دیکھیں۔ اکبر۔! اگر کسی راجپوت یا رانا سے سیاسی اتحاد چاہتا تھا تو ان کی بیٹی ہی بیاہ کر لاتا۔ نہ کہ غیر اہم بھتیجی یا بھانجی۔ کیا ہم شاہ ایران سے دب کر اس کی دوستی قبول کر لیں گے۔'' شہزادہ خرم نے اپنے لہجے کو انتہائی نرم رکھتے ہوئے بھرپور دلیلیں دیں۔ اس پر جہانگیر کے چہرے پر تفکر کے آثار ابھرے مگر لحہ بھر میں غائب ہو گئے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر پوری سنجیدگی سے بولا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔! مگر اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ کیونکہ میں اسے تمہاری دلہن کے طور پر قبول کر چکا ہوں۔ میں نے قول دیا ہے کہ اس کی شادی شہزادہ خرم سے ہوگی۔ اب اس کی کسی اور سے شادی کرنا بے اعتمادی کی دلیل ہوگی اور اسے واپس بھیج دینا اعلان جنگ ہوگا۔ اس کے پہلے ردعمل کے طور پر قندھار ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔''

''جہاں پناہ۔! آپ خوب سمجھتے ہیں کہ جب آپ نے قول دیا ہوگا تو اس کی تہہ میں کن لوگوں کے مشورے شامل ہوں گے۔ یہ وہی لوگ ہوں گے جو اب بھی ایران سے اپنا ذہنی و قلبی لگاؤ رکھتے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ نئے سرے سے اس سارے معاملے کا تجزیہ کریں تو بہت ساری نئی باتیں سامنے آ جائیں گی۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔!'' جہانگیر نے سنجیدگی سے کہا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں تم میرے پسندیدہ بیٹے ہو اور تم اس مشکل وقت کو اچھی طرح نباہ سکتے ہو۔ مملکت کے معاملات میں تمہاری دلچسپی نے مجھے متاثر کیا ہے۔ اب یہ وقت ایسا کہ ہمارا کوئی فیصلہ سلطنت کی تقدیر پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ بادشاہ ہمیشہ سازشوں میں گھرے رہتے ہیں اور اس حصار کو وفادار ہی توڑتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک تمہی ہو جو اس حصار کو توڑ سکتے ہو۔ ایران سے دوستی کے معاملے میں جس بات کا تم نے اشارہ کیا ہے اگر واقعتاً ایسا ہے تو تم ہی اپنی صلاحیتوں سے اس کو فرو کر سکتے ہو۔''

''جہاں پناہ۔! میں جانتا ہوں کہ شہزادہ گل بدن کے استقبال کے لیے کون کون لوگ پیش پیش تھے۔ اعتمادالدولہ اور مہرالنساء۔! میں نہیں سمجھتا کہ اعتمادالدولہ کی وفاداری پر آپ کو کوئی شک ہوگا۔ لیکن مہرالنساء۔!''

''وہ صرف میری محبت ہے۔ میں اگر اس عمر میں اسے اپنی بیوی بنا لیتا ہوں تو وہ بڑھاپے میں میری رفیق سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے۔ وہ نہ تو سلطنت کے معاملات میں مداخلت کر سکتی ہے اور نہ ہی وارث سلطنت کے بارے میں کوئی مداخلت کرنے کی مجاز ہے۔ میں نے تمہیں منتخب کر لیا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم میری توقعات پر پورا اترو گے۔'' جہانگیر کا لہجہ

مدافعانہ تھا۔اس میں جلال نہیں بلکہ شکوہ تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا ’’میں جانتا ہوں خرم۔!تم ارجمند سے محبت کرتے ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے میں مہر النساء سے محبت کرتا ہوں۔تم خوش قسمت ہو کہ میں تم سے تمہاری محبت ارجمند کو چھین نہیں رہا بلکہ اسے تمہاری زندگی میں آنے کی اجازت دے دی ہے۔ وہ تمہاری دوسری بیوی ہوگی۔شہزادوں کی قسمت نہیں ہوتی،انہیں شہنشاہوں کی اطاعت کرنا ہی پڑتی ہے۔ میں نے محبت کی لیکن اسے پا نہیں سکا۔شاید اکبر محبت کو نہیں سمجھتا تھا۔مگر میں سمجھتا ہوں اور تمہیں اجازت دیتا ہوں۔ میں نے اکبر کی اطاعت کی یہاں تک کہ میرے تمام تر معاملات میں اسی کا حکم چلتا تھا۔ مجھے تم سے بھی محبت ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم بھی کسی ایسے غمگین تجربے سے گذرو۔تم مہر النساء کی جانب سے پریشان مت ہونا۔ میں اب عمر کے آخری حصے میں ہوں اور اس عمر میں اپنی محبت پالینا چاہتا ہوں۔مگر تم امور مملکت کو نبھاؤ اپنی صلاحیتوں کو آزماؤ۔ یہاں تک کہ ثابت کردو کہ تمہی شہنشاہ بننے کے اہل ہو۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے شاہی دستار اتار دی۔قریب کھڑے غلام نے فوراً آگے بڑھ کر اسے تھام لیا اور انتہائی ادب سے طلائی میز پر رکھ دی۔ جہانگیر کے بالوں میں چاندی اتر آئی تھی۔ وہ ابھی چالیس سال کی عمر میں تھا۔شاید وہ جوان رعنا دکھائی دیتا رہتا مگر شراب نے اسے مار دیا تھا۔ جہانگیر اس کی طرف سے بے اعتناء ہوگیا تھا۔جس کا مطلب تھا کہ وہ اب مزید بات نہیں کرنا چاہتا اور اسے تخلیے کی ضرورت ہے۔شہزادہ خرم اٹھا اور کورنش بجالایا اور پھر مڑ کر وہاں سے چلا گیا۔

شہزادہ خرم اپنے کمرہ خاص میں تنہا تھا۔ رات ڈھل جانے کو بے تاب تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی رقص وسرور کی محفل ختم ہوئی تھی۔ جس کی بازگشت محل کی فضاؤں میں معلق تھی۔ تاہم ان پرسکون لمحات میں اسے اپنے باپ کی باتیں، اس کا انداز گفتگو اور شکستہ لہجہ یاد آرہا تھا۔اس مختصر سی گفتگو میں بہت کچھ پنہاں تھا۔ جسے فقط وہی سمجھ سکتا تھا۔ یہ شہنشاہ کی اپنی قسمت تھی کہ اس کو کیسا نصیب ملا تھا۔ یہ اس کی تقدیر تھی جو اس کے سامنے حالات کو لا رہی تھی۔ مہر النساء کی صورت میں اس نے خوشگوار خوشی کو پالیا تھا۔اس کی زندگی میں جن تجربات سے آشنائی ہوئی تھی۔ ان میں سے جو بے سکون اور تلخ یادیں تھیں ان سے وہ شہزادہ خرم کو بچانا چاہتا تھا۔

خرم نے سوچا۔!

مہر النساء کا وجود جہانگیر کے اعصاب پر حاوی تھا۔محبت اپنا آپ منوا لیتی ہے اور مہر النساء کا جادو چل چکا تھا۔ مہر النساء فطری طور پر ایران سے روابط کو ترجیح دیتی تھی۔ظاہر ہے سلطنت میں موجودہ وہ گروہ جو ایران سے دوستی کا میلان

رکھتا تھا ان کی رسائی مہر النساء تک ہونا تھی۔ ایسے وقت میں جبکہ شہزادہ خرم کی ولی عہدی کا باقاعدہ اعلان نہیں ہوا تھا۔ اس گروہ کی مخالفت اس کے تخت تک پہنچنے میں رکاوٹیں کھڑی کر سکتی تھی۔ اس کے باپ نے تو فقط اتنا کہا تھا کہ وہ اس کی آخری عمر کی رفیق ہو گی اور وہ امور سلطنت میں مداخلت کرنے والی نہیں۔ لیکن وہ جہانگیر کی کہی گئی ان نظموں کو پڑھ چکا تھا جو اس نے مہر النساء کی محبت میں کہیں تھیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر شہزادہ خرم خود کو لفاظی اور اظہار محبت میں بہت پیچھے محسوس کرتا کہ وہ ارجمند کے لیے کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔ لفظوں کی اپنی مہک ہوتی ہے اور جہانگیر کی نظموں میں محبت کی مہک نشہ طاری کر دینے والی تھی۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا کہ جیسے جہانگیر جب اپنی شاعری کرتا ہے تو مہر النساء کو اپنے سامنے بٹھا کر شعر ترتیب دیتا ہے۔ جب محبت میں اپنا سب کچھ اپنے محبوب کو سونپ دیا جائے تو باقی کچھ بھی نہیں بچتا۔ شہزادہ خرم آنے والے وقت میں اس محبت کی کافرمائیاں دیکھ رہا تھا۔ اس کی صورت کیسی ہو گی؟ اس کا وہ احساس نہ کر سکا۔

دوسری طرف خسرو کا وجود اس کے لیے خطرے کی علامت کے طور پر موجود تھا۔ خسرو۔! جو اپنی بغاوت کی وجہ سے شہنشاہ کا نہ صرف اعتماد کھو چکا تھا بلکہ مملکت کی تقدیر کے لیے خطرناک ثابت ہو چکا تھا۔ خرم اپنی طرف سے جہانگیر کے دل میں کوئی ایسی گرہ نہیں ڈالنا چاہتا تھا کہ وہ ضدی اور ہٹ دھرم کہلائے۔ اسے انتہائی صبر، دانشمندی اور تحمل کے ساتھ اپنے فیصلے کرنا تھے۔ تخت اور ارجمند کے حصول میں فقط گل بدن آ گئی تھی۔ ورنہ خسرو نے اپنے لالچ، پاگل پن اور غیر دانش مندانہ طرز عمل سے سب کچھ کھو دیا تھا۔ اس میں حسد کا جذبہ اس قدر طاقتور تھا کہ حسد کی آگ میں وہ خود ہی جل گیا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ ایسا نہ ہوتا مگر، اکبر کی غلطی تھی کہ اس میں حکمرانی کرنے کے جذبے کو اس نے خود پروان چڑھایا تھا۔ اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ بنجر زمین میں بیج ڈال کر اس کی آبیاری کر رہا ہے، جہاں ثمر آور پودا نہیں محض جھاڑ جھنکاڑ اگا۔ اس کے کانٹوں نے سلطنت کی تقدیر کو زہر آلود کرنے کی کوشش کی۔ اکبر نے بستر مرگ پر اپنا ارادہ تبدیل کیا تھا۔ انہی دنوں میں سلطنت نزاعی کیفیت میں آ گئی تھی۔ خسرو کی تخت نشینی کے لیے خان اعظم اور مان سنگھ نے بھرپور کوشش کی لیکن یہ کوشش بار آور نہ ہو سکی اور جہانگیر تخت نشین ہو گیا۔ خسرو کو چاہیے تھا کہ وہ خاموش ہو جاتا اور اپنی سرگرمیاں ختم کر دیتا مگر اس کے اندر کا حسد، جہانگیر کی معراج کو برداشت نہیں کر پایا تھا۔ اس نے محض پانچ ماہ اور چودہ دن بعد ارادۂ بغاوت سے قلعہ آگرہ چھوڑ دیا اس کا رخ پنجاب کی طرف تھا۔ جس کے لیے خود جہانگیر نے اس بغاوت کو ختم کرنے کی مہم میں حصہ لیا۔ آخر کار لاہور میں خسرو کو پابجولاں شہنشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ خسرو کی قسمت میں قید تھی مگر اس کے ساتھیوں عبدالرحیم کو گدھے کی اور حسن بیگ کو بیل کی کھال میں

زندہ بند کر دیا گیا۔ وہ اس میں بند کچھ گھڑیوں بعد مر گئے۔ دیگر کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ خسرو کو ہاتھی پر طوق ڈال کر بٹھایا گیا اور ان پھانسی پانے والوں کے درمیان سے انتہائی تکلیف دہ عمل سے گذارا گیا۔ مگر خسرو کی حاسدانہ روش نہ بدلی۔ بلکہ اس میں اب انتقام کا جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے حامیوں کے ساتھ زنداں سے بھی رابطہ رکھا۔ یہ روابط رنگ لائے اور جہانگیر کو قتل کرنے کا منصوبہ تشکیل پا گیا۔

شہنشاہ کا یہ قتل شکارگاہ میں اس وقت کیا جانا تھا جب قمرغہ میں ہلچل، جوش وخروش اور افراتفری اپنے عروج پر ہوتی۔ ایسے وقت میں اس پر خنجر سے وار کیا جانا تھا۔ اس سازش میں ملوث ایک خواجہ سرا اعتبار خاں پکڑا گیا۔ جس سے یہ منصوبہ دیوان خاص مملکت آصف خاں کو معلوم ہوا۔ اس نے شہزادہ خرم کو خبردار کر دیا۔ اگر چہ اس قتل سے خرم کے تخت تک پہنچنے کی راہ ہموار ہو سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ یہ سازش مغل اعظم تک پہنچا دی گئی۔ آخر خسرو پکڑا گیا۔ ساری سازش بے نقاب ہو گئی۔

اس دن دیوان عام میں غیر معمولی ہلچل تھی۔ ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا تھا۔ ماحول میں غم گھلا ہوا تھا۔ پردے کے پیچھے خواتین موجود تھیں۔ اس دن خسرو کو غداری کے الزام میں پیش کیا جانا تھا۔ خرم تخت کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ جگہ اس کے لیے مخصوص تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر وزیر اور امرائے سلطنت کھڑے تھے۔ انہیں ان گرز برداروں نے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا جن کے پاس طلائی عصائے شاہی تھا۔ ان سے ذرا آگے امراء سلطنت موجود تھے یہاں پر نقرئی عصائے شاہی کے ساتھ گرز بردار موجود تھے۔ ان سب کے درمیان خسرو پابجولاں کھڑا تھا۔ ایک دفعہ پھر وہ اسی طرح جہانگیر کے سامنے آنے والا تھا۔ اس کے پیچھے زنداں کے محافظ اور جلاد موجود تھے۔ خسرو کے چہرے پر کوئی ملال نہیں تھا۔ وہ پر سکون تھا اور اس کی آنکھوں میں طنز تھا۔

نقیب شاہی نے جہانگیر کے آنے کی صدا دی تو دیوان عام میں سناٹا چھا گیا۔ کچھ لمحوں میں جہانگیر تخت پر فروکش ہو گیا۔ شاہی محافظ ہر طرف ایستادہ ہو گئے۔ شاہی اہلکار اس مقدمہ کی کاروائی لکھنے کے لیے قلم تھام کر تیار ہو گئے۔ جہانگیر نے اشارہ کیا تو شاہی محافظوں نے خسرو کو آگے بڑھا دیا۔ چند قدم کے بعد اسے روک کر کھڑا کر لیا گیا اور ایک وزیر نے اس پر الزمات کی فہرست پڑھ کر سنائی۔

''خسرو۔!'' جہانگیر نے انتہائی جلال سے کہا۔ ''کیا تم اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی تردید کرتے ہو؟''

اس پر خسرو خاموش رہا۔ کچھ نہیں بولا بلکہ بہت غور سے جہانگیر کی طرف دیکھتا رہا۔

''تمہاری خاموشی، تمہارے غدار ہونے کی تصدیق کر رہی ہے۔ آخر تم کس بل بوتے پر بار بار بغاوت کا ارتکاب کر رہے ہو۔ اکبر اعظم ایسا نہیں کر سکتے کہ انہوں نے تمہیں ایسے کسی گھٹیا جرم کرنے کا سبق دیا ہو۔ اور یہ کہ تم اپنے باپ کو قتل کر دینے کے مرتکب ہو جاؤ۔''

''یہ اکبر اعظم ہی تھے جنہوں نے مجھے ولی عہد چنا تھا۔ یہ حق مجھے دیا گیا تھا۔ آپ نے میرا یہ حق چھینا ہے۔ کیا میں اپنے حق کو حاصل کرنے کی کوشش بھی نہ کروں؟''

''تم جس حق کی بات کر رہے ہو وہ مجھے عطا ہوا۔ میں اگر تخت نشین ہوں تو اسی حق کے ساتھ، تم اب اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ عمائدین سلطنت اس کے گواہ ہیں۔'' جہانگیر نے اسی لہجہ میں کہا اور پھر آگے کی طرف جھک کر بولا ''اگر تم حق کی بات کرتے ہو تو ہمایوں کی تلوار اور اکبر کی عطا کی ہوئی دستار میرے پاس ہے جو انہوں نے مجھے خود دی۔ انہوں نے ہی فیصلہ کیا تھا کہ تم تخت کے لیے قابل نہیں ہو اور سلطنت کا وارث مجھے قرار دیا گیا تھا۔ اب تمہیں اس سے انکار کیوں ہے؟''

''وہ اس لیے کہ............!'' خسرو کہتے کہتے رک گیا۔

''وہ اس لیے کہ تمہارے حسد، پاگل پن اور رقابت نے تمہیں مجبور کیا کہ تم سازش کر کے اپنے باپ کو قتل کر دو۔ تم خود ہی بتاؤ، تمہاری سزا کیا ہونی چاہیے؟'' جہانگیر نے تحمل سے کہا۔

''تخت یا تختہ۔!'' خسرو نے انتہائی بے پرواہی سے کہا تو اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے دیوان عام میں سرگوشی کی لہر سی اٹھی۔ اس میں حیرت، غم ناکی اور مایوسی کا اظہار پنہاں تھا۔ لمحہ بھر میں وہ لہر دم توڑ گئی اور پھر سے خاموشی کا راج ہو گیا۔

''تخت یا تختہ۔!'' جہانگیر مسکرا دیا۔ ''ضرور تم مغلیہ روایات کی پاسداری کر رہے ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ مغل یا تو صرف تخت حاصل کرتا ہیں یا پھر وہ اپنے لیے تختہ منتخب کرتے ہیں۔ کیا تمہیں یہ روایت یاد نہیں کہ تیموری اپنے رشتے داروں کو قتل نہیں کرتے، یہاں تک کہ انہیں اس پر مجبور نہ کر دیا جائے؟'' بادشاہ نے پر جلال انداز میں کہا تو ہر طرف خاموشی رہی، خسرو بھی نہیں بولا تو اس نے کہا۔ ''اگر تم تیموری روایات کی اب پاسداری کر رہے ہو، تو میں بھی اسی روایت کی پاسداری کروں گا، تمہیں قتل نہیں کروں گا۔''

بادشاہ نے کہا تو ایک دفعہ پھر دیوان عام میں سرگوشی کی لہر اٹھی۔اس میں کسی قدر خوشی اور اطمینان شامل تھا۔لمحہ بھر میں وہ بھی معدوم ہوگئی۔

''کیا تم یہ سمجھتے ہو میں تمہیں آزاد کردوں گا۔اور تم پھر سے کسی نئی سازش کو تیار کرو گے۔تم جلاوطن ہو کر سلطنت کے امن کو نقصان پہنچاؤ اور میں تمہاری حاسدانہ نگاہوں سے ہر دم پریشان رہوں۔تمہاری آنکھیں جن میں لالچ اور حسد ہمیشہ سلگتا ہے۔ان نگاہوں کی بینائی ہمیشہ کے لیے ختم کردی جائے۔میں حکم دیتا ہوں کہ تمہیں اندھا کرکے ہمیشہ کے لیے قید میں ڈال دیا جائے۔''

جہانگیر کی دھاڑ پر سرگوشی کی ایک لہر اٹھی جس میں افسوس ناکی نمایاں تھی۔جبکہ شہزادہ خرم کو ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔اسے معلوم تھا کہ شہنشاہ کی طرف سے خسرو کو غداری کی کیا سزا ملنے والی ہے۔اس کا فیصلہ رات ہی ہوگیا تھا۔خسرو کو بینائی سے محروم کردینے کا مشورہ مہابت نے دیا تھا۔اس مشورے میں دیوان مملکت خان آصف خان بھی شامل تھا۔سو بادشاہ نے دیوان عام میں جو حکم سنایا تھا۔اس میں یہ ذمے داری مہابت خاں کے سپرد کردی گئی تھی۔خسرو کے لیے یہ مکافات عمل تھی۔اس نے بھی جہانگیر کو قید کرکے اندھا کردینے کا فیصلہ کیا تھا مگر قدرت نے اس کے خلاف یہ فیصلہ دے دیا۔

لمحوں میں شاہی محافظوں نے خسرو کو قابو کرلیا۔کسی نے D بھی اس کے حق میں آواز بلند نہ کی۔اہلکاروں نے مقدمہ کی کارروائی کے کاغذات شہنشاہ کے سامنے پیش کردیئے تو اس نے شاہی مہر اس پر لگادی۔اب اس زمین پر اسے کوئی بھی نہیں بچا سکتا تھا۔

مہابت خاں دوررس نگاہ رکھنے والا امیر سلطنت تھا۔وہ تیموری انداز حکمرانی کو خوب سمجھتا تھا۔جیسے ہی خسرو کو قید خانے میں پہنچا دیا گیا۔اس پر مختلف حوالوں سے اور خصوصاً محل سرا کے حرم میں موجود بیگمات کی طرف سے بہت زیادہ دباؤ آ گیا۔دباؤ اس قدر تھا کہ وہ خسرو کو اندھا کردینے کے بارے میں سوچنے لگا کہ شاہی فرمان پر عمل درآمد کرے یا نہیں۔مگر شاہی فرمان سے مفر نہیں تھا۔

خسرو کو شاہی جلادوں نے زمین پر لٹا دیا۔اس کے پاؤں باندھ دیئے گئے۔دو جلادوں نے اس کے بازو پکڑے ہوئے تھے۔آخر میں ایک جلاد اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔قید خانے کے ایک کونے میں بھٹی گرم تھی اور اس میں نوکیلی سلائیاں گرم کی جارہی تھی۔جیسے ہی وہ سرخ ہوئیں تو جلادوں نے وہ نکال لیں۔ایک نے خسرو کی آنکھ کھولی اور اس میں پھیر

دی۔ دفعتاً دوسری آنکھ میں بھی گرم سلائی پھیر دی گئی۔ خسرو کی چیخ بلند ہوئی، جیسے اس کی آنکھوں میں چھرا گھونپ دیا گیا ہو۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے کیچڑ نما مواد نکل رہا تھا جس میں خون اور آنسو بھی شامل تھے۔ لمحوں میں اس کی آنکھیں صاف کر کے مرہم لگا دیا گیا۔ مہابت خاں نے اس عمل سے پہلے اطباء سے مشورہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

شہزادہ خرم اپنے باپ کو ایسے حکم پر کوئی الزام نہیں دے سکتا تھا۔ اور نہ ہی اپنے بھائی خسرو سے کچھ کہہ سکتا تھا کہ یہ ان دونوں کی قسمت تھی۔ شہزادہ خرم کے لیے اصل شے یہی تھی کہ خسرو ابھی تک زندہ تھا۔ یہ سایہ کسی بھی وقت بھوت بن کر اس کی زندگی پر چھا سکتا تھا۔

......☆......

وہ موسم سرما کے ابتدائی دنوں کی ایک تاریک رات تھی۔ سردی اتنی زیادہ نہیں تھی مگر رات کا دوسرا پہر ڈھل جانے کے بعد ٹھنڈ میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ چاند نکلنے کا ابھی کوئی امکان نہیں تھا۔ اماوس کی اس شب میں خرم کے محل سے دو گھڑ سوار برآمد ہوئے۔ گھوڑوں کی رفتار دھیمی تھی تا کہ زیادہ آواز نہ پیدا ہو سکے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ امر سنگھ دروازے پر پہنچ گئے۔ وہاں مشعلیں روشن تھیں اور دروازے پر پہرے دار موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ دو گھڑ سوار محل کی طرف سے ان کے پاس پہنچنے ہی والے ہیں۔ یہ خلاف معمول بات تھی۔ اس سے پہلے کہ وہاں کے محافظ دوسروں کو خبردار کرتے ایک گھڑ سوار نے اپنے منہ سے نقاب اتار دیا۔ وہ شہزادہ خرم تھا اور اس کے ساتھ اس کا خدمت گار خاص رضا تھا۔

''خیریت شہزادہ معظم۔!'' پہرے دار نے انتہائی حیرت سے کہا۔

''دروازہ کھولو اور کوئی سوال مت کرو۔ کسی کو خبر نہ ہو کہ ہم قلعہ سے باہر گئے ہیں۔'' خدمت گار رضا نے انتہائی سختی سے کہا۔ پہرے داروں نے دروازہ کھول دیا تو شہزادہ خرم آگے بڑھ گیا۔

''حضور۔! اپنے ساتھ کچھ محافظ لے لیں۔'' پہرے دار نے انتہائی ادب سے کہا تو رضا نے جواباً کہا

''وہ موجود ہیں۔ لیکن خیال رہے کہ ہماری واپسی تک کسی کو خبر نہ ہو۔''

یہ کہہ کر دونوں آگے بڑھ گئے۔ قلعے کے باہر محافظوں کا ایک مختصر سا قافلہ موجود تھا۔ ان دونوں کے پہنچتے ہی وہ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس قافلے میں شہزادہ خرم کا جانثار دوست سعد اللہ خاں تھا۔ وہ خاموشی سے چلتے ہوئے آگے بڑھ

گئے ۔ان کا رخ شہر کی جانب تھا۔ جہاں آگرہ روشن تھا۔

وہ قافلہ غیاث بیگ کی حویلی سے ذرا دور ٹھہر گیا۔سعد اللہ خاں نے محافظوں کو ارد گرد پھیلایا تو خرم اور رضا آگے چل دیئے۔ جہاں ارجمند کا خواجہ سرا عیسیٰ موجود تھا۔

''آیئے شہزادہ معظم ۔! میں آپ کو لیئے چلتا ہوں۔''

''کیا ارجمند بانو میرے انتظار میں ہے۔''

''جی شہزادہ معظم ۔!وہ آپ کی راہ تک رہی ہیں، مگر آپ کے پاس اس ملاقات کے لیے بہت مختصر سا وقت ہو گا۔''

''میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

خرم نے کہا اور اس کے ساتھ پیدل ہی چل پڑا۔اس کا گھوڑا رضا نے پکڑ لیا تھا۔

اس کمرے میں قندیل روشن تھی مگر وہ نسوانی ہیولا اس سے ہٹ کر قدرے تاریکی میں کھڑا تھا۔وہ ارجمند تھی۔اس کی یہ ملاقات اس دن طے ہوئی تھی۔شہزادہ خرم کی خواہش پر خدمت گار رضا نے کنیزوں کی مدد سے ارجمند تک یہ خواہش پہنچائی تھی۔ جسے اس نے دیوان جی بیگم کی اجازت سے مان کر ملاقات کی اجازت دے دی تھی۔اس کے لیے زیادہ خطرہ مہرالنساء ہی کی طرف سے ہو سکتا تھا لیکن وہ ان دنوں جہانگیر کی منہ بولی ماں سلیمہ بیگم کے پاس تھی۔شہزادہ خرم نے اس کا ہیولا دیکھا اور ادھر بڑھ گیا۔ وہ دونوں آمنے سامنے تھے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔اس خاموشی کو ارجمند نے توڑا۔

''کیسے ہیں آپ؟''

''کل میری شادی ہو رہی ہے۔'' خرم نے یوں کہا جیسے وہ خیالوں میں کھویا ہوا ہو اور اس نے ارجمند کی بات ہی نہیں سنی۔شاید شہزادے وہی کچھ سننا پسند کرتے ہیں جو بہت ہی خاص ہو۔

''میں جانتی ہوں۔'' ارجمند نے انتہائی تحمل سے کہا۔

''مگر میری کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں یہ سب نہیں چاہتا......ایران...... میں خوش نہیں ہوں بلکہ اس شادی نے مجھے غم زدہ کر دیا ہے۔لیکن الجھن یہی ہے کہ شہزادوں کو ناخوش دکھائی نہیں دینا چاہیے۔میری زندگی میں ہر شے میسر ہے۔ سوائے تمہارے، کیا تم میری بات سن رہی ہو ارجمند۔؟'' وہ اپنی دھن میں کہے چلا جا رہا تھا۔

''جی حضور۔! میں سن رہی ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''کوئی بھی عورت، چاہے وہ جیسی بھی ہو مجھے متاثر نہیں کرسکتی۔ مگر صرف تم...... تم نے مجھے متاثر ہی نہیں کیا بلکہ اپنی محبت کے سحر میں گرفتار کرلیا ہے۔ تم حیران مت ہونا کہ میں یہ باتیں تم سے کیوں کررہا ہوں، لیکن میری محبت، میں اور کس سے کہوں، کون ہے جو میرے احساسات تک رسائی پاسکتا ہو، میرے لفظوں میں موجود محبت کو محسوس کرسکتا ہو۔ حکمران محبت کو نہیں سمجھتے اور نہ ہی انہیں اس کی عظمت کا اندازہ ہے۔ وہ تو صرف وہی فیصلے کرتے ہیں جن سے ان کی حکمرانی کو تقویت ہو، کیا تم اس فیصلے سے غم زدہ نہیں ہو؟''

''نہیں حضور۔! میں غم زدہ نہیں ہوں۔''

''کیوں، تم کیوں غمگین نہیں ہو، میں تو روتا ہوں۔ تم کیوں غمگین نہیں ہو، میں تو غمگین ہوں۔ تم کیوں ہنس رہی ہو۔'' شہزادہ بے محابا کہتا چلا گیا جیسے وہ اپنے آپ میں نہ رہا ہو۔

''حضور۔! میں اس لیے غم زدہ نہیں ہوں کہ میری محبت میرے پاس ہے، مجھے پورا یقین ہے کہ خرم میرے سوا کسی اور سے محبت نہیں کرتا۔ محبت میں یہی یقین غم زدہ نہیں ہونے دیتا اور پھر آپ بے وفا تو نہیں ہوئے۔''

''ہاں ارجمند تمہارا یقین سچا ہے۔ میں بے وفا نہیں، مجبور محض ہوں۔''

''محبت اگر سچی ہو تو وہ زنگ آلود نہیں ہوتی ہمیشہ تروتازہ رہتی ہے کہ دوام فقط محبت کو ہے۔

''ہاں۔! لیکن ارجمند۔! تم کھو تو نہیں جاؤ گی۔ اگر تم کسی اور کی ہوگئی تو میں سب کچھ کھودوں گا۔ شاید زندہ بھی نہ رہوں۔''

''خدا نہ کرے۔'' ارجمند نے فوراً اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ تبھی شہزادے نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

''میں نے بہت کوشش کی ہے۔ لیکن میں اپنے باپ کو قائل نہیں کرسکا۔ اس کا فرمان مجھ تک آ پہنچا ہے اور تعمیل حکم اگر نہ کی تو تجھے پانے کی موہوم سی امید بھی دم توڑ جائے گی۔'' شہزادہ خرم نے سرد آہ کھینچے ہوئے کہا۔

''میں آپ کا انتظار کروں گی، یہاں تک کہ موت ہی مجھے آپ سے جدا کرسکتی ہے۔'' وہ نثار لہجے میں بولی

''ہاں۔! میں کہ جو ولی عہد سلطنت بن جانے والا ہوں۔ جس کی صلاحیتوں کا اعتراف عمائدین سلطنت کرتے

ہیں۔ہم شہزادے دور ہی سے خوش قسمت اور خوش حال دکھائی دیتے ہیں لیکن اندر سے دکھ بھرے،میرے اندر کے اس دکھ کا مداوا گل بدن نہیں ارجمند ہے۔‘‘

’’میں آپ ہی کی ہوں اور ہمیشہ آپ کی رہوں گی شہزادہ معظم۔آپ اپنے من پر کوئی بوجھ مت رکھیں بلکہ میری طرف سے بے نیاز ہو کر اپنے فرائض سرانجام دیں۔آپ مجھے ہمیشہ اپنے نزدیک پائیں گے۔آپ میری دعاؤں میں شامل ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہم ضرور ملیں گے۔‘‘ارجمند نے اس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے حوصلہ مند لہجے میں کہا۔

تبھی عیسی کی لاٹھی زور سے بجی۔یہ ملاقات ختم ہونے کا اشارہ تھا۔

’’اپنا خیال رکھنا ارجمند۔‘‘اس نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔چند قدم کے فاصلے پر عیسیٰ ہیولے کی طرح اس پر ظاہر ہوا۔وہ اس کی راہنمائی میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔یہاں تک کہ وہ سعد اللہ خاں تک جا پہنچا۔رضا اس کے پاس ہی موجود تھا۔عیسیٰ واپس پلٹا تو وہ گھوڑے پر سوار ہو گئے۔کچھ دیر بعد آگرے کی وہ گلیاں دوبارہ خاموش اور سنسان ہو گئیں جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔لال قلعے کے دروازے امر سنگھ پر وہی پہرے دار متعین تھے۔ انہیں باسلامت واپس دیکھ کر پرسکون ہو گئے۔رضا نے چاندی کے سکوں کی ایک تھیلی ان کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

’’انہیں آپس میں بانٹ لو اور بھول جاؤ کہ ہم یہاں آئے تھے۔‘‘

ایک پہرے دار نے وہ تھیلی اچک لی تو وہ محل کی جانب چل دیئے۔

......☆......

شاہی نقارہ بج اٹھا تھا۔خرم نے اپنے بستر پر بے چینی سے پہلو بدلا۔طلوع صبح کا وقت ہو گیا تھا۔شہنشاہ جھروکہ درشن میں ظاہر ہونے کے بعد اس کے محل میں آنے والا تھا۔پچھلی رات کا رتجگا اس کی آنکھوں میں تھا۔ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں اسے اپنی محبت چھن جانے کا احساس دے رہی تھیں۔اسے بستر سے جدا ہونا ہی تھا۔وہ اٹھ گیا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ سرمگیں روشنی پھیل رہی تھی۔ایسی روشنی جس میں پاکیزگی اور لطافت تھی۔جو انسان کی روح تک کو سرشار کر دیتی ہے۔ایک پرندہ کھڑکی کے آگے سے اڑتا ہوا چلا گیا۔کس قدر آزاد ہوتے ہیں یہ پنچھی۔!اس نے سوچا اور پلٹ آنا چاہا۔تبھی کنیزیں اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔وہ اسے جگانے آئی تھیں لیکن اسے بیدار دیکھ کر ایک لمحہ کو ٹھٹک گئیں۔

خرم تیار ہو چکا تھا۔اس موقع کے لیے خصوصی طور پر تیار کیا گیا لباس فاخرہ زیب تن تھا۔جس پر سونے کے تاروں سے کڑھائی کی ہوئی تھی اور اس لباس کو زیادہ مرصع بنانے کے لیے ہیرے، جواہرات اور موتی ٹانکے ہوئے تھے۔اس کی ریشمی دستار میں بڑا سا یاقوت تیسری آنکھوں کی مانند چمک رہا تھا۔طلائی کمر بند، قیمتی پتھروں سے مزین بازو بند، طلائی انگوٹھیاں جن میں نایاب پتھر جڑے ہوئے تھے۔گلے میں سچے موتیوں کا تین لڑی ہار، پیروں میں زربفت جوتا۔اس سج دھج کے ساتھ وہ اپنے کمرہ خاص سے برآمد ہوا اور دیوان عام میں پہنچا۔ جہاں پر عمائدین سلطنت، امراء، شرفاء اور شہزادہ خرم کے خاص دوست سندر داس، شکر اللہ، دلاور خان، کشن سنگھ، حسام الدین اور سعد اللہ خاں کے علاوہ بے شمار لوگ تھے۔ وہ مسند خاص پر بیٹھ گیا۔کچھ ہی دیر میں شہنشاہ کی آمد کا اعلان ہو گیا۔

خرم ایک اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر سوار تھا۔اس کے ساتھ شہنشاہ جہانگیر کی سواری تھی۔مغلیہ شان وشوکت کا آئینہ دار مرصع گھوڑے کی گدی، لگامیں، رکاب سب طلائی تھیں۔اس کے علاوہ غلاموں نے ایک طلائی چھتری تانی ہوئی تھی۔ بارات بڑھی تو شہنشاہ، ڈھول تاشے اور ناقوس بجنے کا ایک شور بلند ہوا جو بارات کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتا ہی گیا۔دورویہ راستے پر لوگوں کا ہجوم تھا، جو پر جوش انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔غلام شہنشاہ اور شہزادے پر گلاب کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے جبکہ جہانگیر طلائی ونقرئی سکے لٹا رہا تھا۔رقاصائیں بارات کے آگے ناچ رہی تھیں۔شان وشوکت کے ساتھ بارات حرم سرا میں پہنچی۔بارات کے ساتھ آئے بے شمار لوگ شاہی محل کے باغ میں لگے شامیانے میں ٹھہر گئے اور شہزادہ خرم، شہنشاہ اور چند قریبی عزیزوں کے ساتھ حرم میں جا پہنچے۔ جہاں پر سلیمہ بیگم نے ان کا استقبال نہایت تزک واحتشام سے کیا۔شہزادہ خرم کے لیے طلائی جلوہ گاہ بنائی گئی تھی جہاں اسے بٹھایا گیا۔مختصر سی تواضع کے بعد خرم اور گل بدن کا نکاح پڑھا دیا گیا۔اس کے بعد شہزادی گل بدن کو شہزادے خرم کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔اس کے بعد ترک اور ہند کی رسمیں ادا کی گئیں۔حرم سرا میں ہر جانب خوشیاں ہی خوشیاں دکھائی دے رہی تھیں جبکہ شہزادہ خرم کا دل انتہائی غمگین تھا۔اس کی دلہن کا چہرہ آنچل میں ڈھکا ہوا تھا مگر اسے دیکھنے کا کوئی تجسس نہیں تھا۔

وہ دن سلطنت مغلیہ کے لیے تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔رقص وشادمانی اور عظیم ضیافت کا دن، جس میں غرباء کو طلائی ونقرئی سکے تقسیم کیے گئے۔اسے تحائف دینے کے لیے بے شمار لوگ تھے۔ان تحائف میں سونے کے تاج، موتی جواہرات، ہیرے، گھوڑے، ہاتھی، شیر اور غلام تھے۔سیاسی اتحاد کے لیے کی گئی یہ شادی بہت سارے لوگوں کی جیت تھی، سوائے شہزادہ

خرم کے۔

حجلہ عروسی میں شہزادی گل بدن یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے وہ مراقبے میں ہو۔ محبت کے بغیر تعلق کیسا ہوتا ہے اس دن خرم کو تجربہ ہوا۔ لیکن اسے تعلق نبھانا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ طلوع صبح کے وقت عورتیں آ کر اس کے سہاگ کے بستر کو ٹٹولیں گی۔

ارجمند بانو کے گھر میں چند دنوں سے غیر معمولی چہل پہل تھی۔ وہ اس آمد و رفت کے بارے میں خوب جانتی تھی۔ دیوان جی بیگم اسی دن نا اُمید ہو گئی تھی جب شہزادہ خرم کی شادی گل بدن سے ہو گئی تھی۔ اسے ارجمند کے مستقبل کی فکر لاحق تھی۔ اس کی عمر بھی سولہ سال ہو گئی تھی۔ مگر شاہی خاندان کی طرف سے کوئی نامہ یا پیغام نہیں آیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے جہانگیر انہیں بھول چکا ہے۔ اس پر غیاث بیگ کا خاندان کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، نہ کوئی شکوہ اور نہ کوئی احتجاج، وہ صرف خاموش رہ سکتے تھے۔ ارجمند کی شادی کی تمام تر ذمہ داری دیوان جی بیگم کے ذمہ تھی اور وہ اس کی بڑھتی ہوئی عمر سے خائف تھی۔ اسے خوف تھا کہ اگر شاہی خاندان کی طرف سے اسی طرح خاموشی رہی اور چند سال مزید نکل گئے تو پھر ارجمند سے کون شادی کرے گا۔ وہ مایوس ہو چکی تھی۔ اس لیے ایک ایرانی خاندان ہی کے لڑکے پر اس کی نگاہ ٹک گئی تھی۔ غیاث بیگ کے اس خاندان پر بہت احسان تھے۔ وہ لڑکا شاہی ملازمت میں اعلیٰ عہدے پر اسی کی وجہ سے فائز ہوا تھا۔ دیوان جی بیگم نے جب اپنی خواہش کا ذرا سا اظہار کیا تو وہ خاندان ارجمند کی خواستگاری کے لیے بیتاب ہو گیا۔ ان کی آمد و رفت اسی ضمن میں تھی اور دیوان جی بیگم انہیں بھرپور پذیرائی دے رہی تھی۔ ارجمند یہ سارے معاملات دیکھتے ہوئے خاموش تھی۔ وہ اس وقت کا انتظار کر رہی تھی جب کوئی اس سے بات کرتا۔ تب ہی وہ اپنی رائے یا رضامندی کے بارے میں کوئی بات کہہ سکتی تھی۔

اصل میں ان ذی حیثیت عمائدین کی شادیاں اور رشتے ناطوں میں دولت، اثر و رسوخ اور سیاسی اتحاد ہی دیکھے جاتے تھے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی کہ کوئی کسی سے محبت بھی کرتا ہے یا نہیں۔ محبت کوئی مادی وجود نہیں رکھتی کہ

کسی کو کچھ دکھائی دے اور معلوم ہو کہ وہ کتنی ہے؟ یہ تو ایک طلسم ہے جو انسانی من پر طاری ہوتا ہے۔اس کا اظہار تو رویئے ہی ہوتے ہیں۔سبھی جانتے تھے کہ شہزادہ خرم کی منگنی ارجمند سے ہو چکی ہے۔جس طرح یہ خبر سب کو پتہ تھی اسی طرح انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ارجمند بھی شہزادہ خرم سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔محبت میں حصے داری نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔اس کا ہونے والا شوہر یہ کیسے برداشت کر پائے گا کہ اس کے خوابوں پر خرم کا پہرہ ہے۔وہ بھی اپنے خوابوں کو نوچ کر پھینک نہیں سکتی تھی۔وہ اسے رفاقت تو دے سکتا تھا لیکن محبت کا خالص پن نہیں اور وہ بھی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔دو خاندانوں کو جوڑے رکھنے کے لیے وہ اپنا آپ قربان ہی کر سکتی تھی،اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

ایک دن جبکہ وہ اپنی گود میں شاعری کی کتاب رکھے،اس کے شعروں میں مگن تھی کہ اس کی ماں آ گئی۔ارجمند کو معلوم تھا کہ وہ کیا بات کہنے کے لیے آئی ہے۔

’’تم بہت زیادہ شاعری پڑھتی ہو۔کیا اس سے تم اکتاتی نہیں ہو؟‘‘

’’نہیں ماں جی۔!ان شعروں میں انسانی کیفیات کی عکاسی ہوتی ہے۔یہ آئینہ ہے اور میں اس آئینے میں انسان کو دیکھتی رہتی ہوں۔‘‘

’’کبھی خود کو بھی دیکھا ہے؟‘‘ دیوان جی بیگم نے مسکراتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

’’جی ہاں ماں جی۔!خود کو دیکھنے ہی کے لیے تو آئینہ دیکھا جاتا ہے تاکہ اپنا آپ سنوارا جائے۔میں اکثر خود کو پڑھتی رہتی ہوں۔‘‘ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

’’خود کو پڑھنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان اپنے ماحول سے کٹ کر خود میں گم ہو جائے۔‘‘

’’یہی تو محبت کا عطیہ ہے میری ماں جی......!اور میں اپنے ماحول سے کب کٹی ہوں؟‘‘ اس نے شاعری کی کتاب بند کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

’’پھر بھی،تمہاری عمر کی لڑکیاں شادی کر کے اپنا گھر بسا چکی ہیں۔کیا تمہیں احساس نہیں کہ تمہاری جوانی کے بہترین دن زوال پذیر ہیں۔‘‘

’’مگر محبت کے ساتھ تو ساری عمر گذاری جا سکتی ہے۔‘‘ اس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

’’خالی خولی محبت کچھ بھی نہیں دیتی اور شہزادوں کی محبت ایسے ہی ہوتی ہے۔تم اس کے انتظار میں اپنی زندگی مت

ضائع کرو۔‘‘

’’نہیں وہ مجھے بھول نہیں سکتا۔میرے محبت تازہ پھول کی طرح اس کے من میں مہک رہی ہے۔‘‘

’’تم یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ وہ شہزادہ ہے اور پھر اسے ولی عہد سلطنت بھی بننا ہے۔اس کے تمام تر فیصلوں کا انحصار شہنشاہ کی مرضی پر ہے۔جس طرح اس کی شادی گل بدن سے ہوگئی ہے۔تم ہی نے تو کہا تھا کہ اسے یہ شادی دل سے قبول نہیں مگر پھر بھی اسے شہنشاہ کی اطاعت کرنا پڑی۔‘‘

’’لیکن اس کی محبت تو میرے لیے ہی ہے نا۔اسے صرف میں ہی جانتی ہوں اور مجھے اس کا یقین ہے۔‘‘

’’لیکن ہم لوگوں کی مزید باتیں نہیں سن سکتے۔ہم نے تمہارے لیے ایک لڑکا دیکھ لیا ہے۔اس کا خاندان اصفہان سے ہندوستان آیا ہے۔ہم ان کے آباءاجداد کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔‘‘دیوان جی بیگم نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

’’لیکن میں خرم کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کروں گی۔‘‘ارجمند دھیرے سے بولی۔

’’تمہارا یہ فیصلہ ہمارے لیے بہت سارے مسائل پیدا کر دے گا۔جگ ہنسائی کے علاوہ ہمارے وقار کے لیے بہت ضروری ہے کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔‘‘وہ تقریباً چیخ پڑی۔

’’مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔‘‘ارجمند نے حتمی انداز میں کہا۔

’’تمہیں ایسا کرنا ہوگا کیونکہ اگر تم شادی نہیں کرو گی تو تمہاری شادی بھی خرم سے نہیں ہوگی۔وہ حسن فیروز کی عطا کردہ جاگیر پر حکمرانی کر رہا ہے اس کی بیوی شہزادی گل بدن اس کے ساتھ ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ اس کی ایک بیٹی بھی پیدا ہو چکی ہے جس کا نام شہنشاہ نے پرہنر بیگم رکھا ہے اور وہ شہنشاہ کی والدہ کے پاس ہے۔وہ اس کی فرزندی میں دے دی گئی ہے۔وہ اپنی دنیا میں گم ہے اور تم محض خیالوں کی دنیا میں بھٹک رہی ہو۔تم جو کچھ بھی سوچ رہی ہو اس کا حاصل کچھ بھی نہیں۔‘‘

’’مگر میری محبت تو میرے پاس ہے۔‘‘وہ اطمینان سے بولی۔

’’محبت،محبت،محبت۔!کس قدر ظالم شے ہے یہ،جو اپنے ماں باپ کو بھی بھلا دینے کی وجہ بن گئی ہے،تم حقیقت کا سامنا کرو اور وقت کو سمجھو میری بیٹی۔میں نہیں چاہتی کہ تم ایک اذیت ناک قسمت کے ساتھ اپنی زندگی گزارو۔خدا کے لیے میری بات پر غور کرو۔‘‘

''ماں جی۔! میرا ایک ہی فیصلہ ہے میں اگر شادی کروں گی تو صرف شہزادہ خرم سے ورنہ نہیں۔ یہی میرا حتمی فیصلہ ہے۔'' ارجمند اسی سکون سے بولی تو دیوان جی بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے اپنی بیٹی کا مستقبل تاریک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔ ماحول میں خاصی گھٹن اتر آئی تھی۔ ارجمند نے شاعری کی کتاب ایک طرف پڑی تپائی پر رکھی اور خیالوں میں گم ہو گئی۔ ایک سوال اس کے سامنے آ موجود ہوا تھا۔ اگر اس کی شادی شہزادہ خرم سے نہ ہوئی تو............؟ اس سوال کے پس منظر میں بہت سارے حالات تھے۔ ایسے حالات جو اس کی زندگی پر مہیب بادلوں کی طرح چھپائے ہوئے تھے۔ ارجمند انہیں سوچتی رہی لیکن ایک اعتماد تھا جس نے اسے پراگندہ خیال نہیں ہونے دیا۔ اسے شہزادہ خرم کی محبت پر یقین تھا۔

......☆......

حسن فیروز کی جاگیر سینکڑوں کوس میں پھیلی ہوئی تھی۔ لاہور سے دہلی اور اس سے بھی آگے یہ جاگیر ولی عہد شہزادے کو عطا ہوئی تھی۔ ان دنوں شہزادہ خرم بارہ ہزاری کے منصب پر فائز تھا اور لاہور میں تھا۔ لاہور۔! جو ہمیشہ سے زندہ دلان کا شہر رہا ہے۔ وہاں سب کچھ تھا، خوبصورت سرسبز باغ، شاندار عمارتیں، صلاحیتوں سے بھرے لوگ، جاذب نظر منظر اور شاندار موسم۔ وہاں کی سالانہ آمدنی لاکھوں میں تھی۔ وہ وہاں پر اگر کوئی کمی محسوس کرتا تھا تو صرف آگرہ سے دوری تھی، وہ آگرہ جہاں اس کی ارجمند تھی۔ اس کی اس کمی کو شہزادی گل بدن نہ سمجھی اور ایک بیٹی ہو جانے کے باوجود ان میں صدیوں کا فاصلہ تھا۔ اس کا مزاج تلخ، شک بھرا اور مغرورانہ تھا۔ جس طرح ان کی رفاقت میں دنوں کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا اسی طرح ان میں رؤیوں اور تعلق میں دوریاں آتی چلی جا رہی تھی۔ گل بدن کو یہ زعم تھا کہ وہ ایک شہزادی ہے۔ اس کے خاندان کے مغلیہ خاندان پر بہت زیادہ احسان ہیں اور وہ بذات خود ہندوستان اور ایران کے درمیان وجۂ دوستی ہے۔ شہزادی گل بدن کے پاس سب کچھ تھا بس ایک محبت کی کمی تھی جسے وہ بیوی ہوتے ہوئے بھی نبھا نہیں رہی تھی۔

شہزادہ خرم کی حکمرانی حسن فیرزو کی جاگیر سے شروع ہو چکی تھی۔ یہاں کے امراء عمائدین، تاجر اور زمیندار سبھی اس کی اطاعت کر رہے تھے۔ زمام کار بطریق احسن چل رہا تھا اور حالات بھی سازگار تھے۔ لیکن اک کمی شہزادے کو بے چین رکھتی تھی اور وہ تھی محبت کی کمی۔ شہزادی گل بدن اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی اسے محبت نہیں دے پا رہی تھی اور ارجمند اس سے سینکڑوں کوس دور آگرے میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان جب بھی وہ اپنا تجزیہ کرتا، اسے ارجمند

بہت اعلیٰ درجے پر محسوس ہوتی۔ آگرہ سے برابر خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ شہزادے کے آنکھ اور کان فقط دربار میں ہی نہیں، محل میں بھی تھے اور بہت حد تک ان کی رسائیاں حرم تک تھیں۔ لاہور اور آگرہ کو جوڑنے والا واسطہ خدمت گار رضا تھا۔ کوئی بھی ایسا معمولی سے معمولی واقعہ جو کسی بھی حوالے سے شہزادہ خرم سے تعلق رکھتا تھا، وہ اس تک پہنچ رہا تھا۔ بہت ساری خبروں کے دوران اسے یہ خبر بھی موصول ہو چکی تھی کہ ارجمند کی خواستگاری کے لیے ایرانی خاندان حد درجہ دلچسپی لے رہا ہے اور چاہتا ہے کہ جلد از جلد وہ ان کی بہو بن جائے۔ اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ارجمند کا اس پر کیا ردعمل ہے۔ وہ بے چین تھا اور سوچ رہا تھا کہ جس طرح وہ شہنشاہ کی وجہ سے شہزادی گل بدن کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہو گیا تھا، ارجمند کے لیے بھی ایسی کوئی نہ کوئی مجبوری ہو سکتی تھی۔ سب سے بڑی وجہ اس کا خاندان تھا جو ان کی برابری کا نہ تھا۔ شہنشاہ اپنے خیالات اس پر پہلے ہی ظاہر کر چکا تھا کہ ارجمند کے ساتھ کیا ہے۔ مال و دولت، سیاسی رتبہ یا کوئی سیاسی اتحاد کچھ بھی نہیں، فقط محبت کو حکمران تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس وقت جہانگیر نے ارجمند کی منگنی صرف اس لیے کر دی ہو کہ خسرو کی بغاوت کا قضیہ چل رہا تھا، شہزادے خرم کی ضد تھی، وہ محض اس کی ہٹ دھرمی کو دیکھ کر اور حالات کے مطابق اس نے یہ بات مان لی تھی۔ اور جس طرح ارجمند کی منگنی کو اتنے سال ہو گئے تھے۔ اس سے یہی گمان کیا جا سکتا تھا کہ شہنشاہ نے محض وقت اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہی ایسا کیا تھا۔ ورنہ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ وقت اپنے آپ کو اس کے لیے نہ دہرائے۔ اکبر نے جہانگیر کو مہرالنساء سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دی تھی اور اب جہانگیر ہی شہزادہ خرم کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ جہانگیر نے شہزادہ خرم سے یہ کہا تھا کہ وہ ارجمند کو دوسری بیوی بنانے کی اجازت دے دیتا ہے مگر کب؟ یہ اس نے نہیں کہا تھا۔ شیر افگن قتل ہو چکا تھا اور اس کی بیوی مہرالنساء اب سلیمہ بیگم کے پاس تھی۔ جہانگیر اس سے شادی کا خواہاں تھا۔ تو کیا ارجمند سے اس کی شادی کی کوئی صورت نہ بن پائے گی؟ آگرہ سے آنے والی خبریں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ صرف ایک موہوم سی اُمید تھی کہ ارجمند اس کا انتظار کر رہی ہے۔

ارجمند۔! جس کے انتظار نے اس کے وجود میں انتہائی کشش بھر دی تھی۔ یہی خیال کہ وہ اس کی محبت میں اس کا انتظار کر رہی ہے، خرم کے لیے وجد آفریں تھا۔ اس سوچ کا خمار زندگی بخش تھا۔ یوں جیسے صحرا میں چلنے والے شخص کو یہ امید ہو کہ اسے نخلستان ضرور ملے گا۔ ارجمند کو شہنشاہ کے خیالات معلوم ہو جانے کے بعد بھی صرف خرم کے کہے گئے لفظوں کا بھروسہ تھا۔ وہ ایک عورت ہو کر اس کے لفظوں کو احترام دیئے بیٹھی تھی جبکہ وہ خرم ہو کر اس کو اہمیت نہیں دے سکتا تھا؟ اور یہ

اہمیت اسے پوری دنیا سے فزوں تر تھی، ایک وہی تو تھی جو اس کی خالص محبت کو اپنے من میں بسائے محو انتظار تھی۔ خرم اس سے محبت کرتا ہے، اسی ایک احساس کے ساتھ وہ اپنا جیون بتائے چلی جا رہی تھی۔ شہزادی گل بدن۔! اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس سے دور تھی۔ اسے زعم تھا کہ وہ شہزادی ہے اور ایران و ہندوستان کے درمیان دوستی کی وجہ۔ اسے یہ پوری طرح احساس تھا کہ شہزادہ خرم اسے طلاق نہیں دے سکتا اور نہ ہی اس کی اہمیت کو کسی طور پر کم کر سکتا ہے۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ ان دونوں کے درمیان تلخیاں اپنا رنگ جما چکی تھیں۔ ایک بیٹی کی پیدائش بھی انہیں قریب نہیں لا سکی تھی۔ اس کی وجہ شہزادہ خرم کے رویئے میں سرد مہری کے علاوہ گل بدن کا غرور بھی تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اس کی قیام گاہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جب بھی کہیں سفر کے لیے نکلتی، پورے تزک و احتشام کے ساتھ۔ اس کے ساتھ اس کے ایران سے آئے ہوئے مشیر، غلام اور کنیزیں چلتیں۔ وہ مختصر سی فوج جو اسلحہ سے لیس ہوتی۔ وہ ہندوستانی شہزادہ خرم کی بیوی ہوتے ہوئے بھی اپنا رنگ ڈھنگ، اپنے طور طریقے اور انداز ایرانی اپنائے ہوئے تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ بہت اہم ہے۔ اسے دو بادشاہوں کی تائید حاصل تھی، ایک شاہ ایران اور دوسرا شہنشاہ ہندوستان۔ دو بڑی طاقتیں غیر محسوس انداز میں خرم اور ارجمند کے درمیان حائل تھیں۔

......☆......

وہ سلیمہ بیگم کی رہائش گاہ میں سے ایک کمرہ تھا جو مہر النساء بیگم کو دیا گیا تھا۔ پورے لوازمات اور سہولیات کے ساتھ۔ اس نے اب تک پہلے اس طرح کی رہائش میں تکلفات نہیں دیکھے تھے۔ وہ شاہی مہمان ہونے کے علاوہ جہانگیر کی محبت تھی۔ دریائے جمنا کی طرف سے آنے والی ہوائیں قلعہ آگرہ میں موجود محل کی بڑی راز داں تھیں۔ اک وہی ہوائیں تھیں جو بلا روک ٹوک کے ان در و بام میں آجاتیں تھیں ورنہ محل اور پھر حرم سرا کے پہرے اس طرح تھے کہ ان میں اجازت کے بغیر پنچھی بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ سلیمہ بیگم کے ہاں سے گل بدن کی وداعی محل سرا میں ابھی تک بازگشت کی صورت میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ جہانگیر کی مہر النساء میں حد درجہ دلچسپی کی سرگوشیاں بھی گردش کر رہی تھیں۔ محل میں کنیزیں، ملازمائیں، اور مشاطائیں بھی اپنے اپنے آقاؤں کی وفاداری میں تقسیم تھیں۔ انہیں اس وفاداری کا باقاعدہ انعام ملا کرتا تھا۔ وہ ان سرگوشیوں کے تعاقب میں رہا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ ان کی نگاہ کسی اہم ترین واقعہ تک جا پہنچتیں۔ وہی واقعہ ان کی قسمت میں خوشی بھر دیتا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ سلیمہ بیگم کے ہاں مہر النساء بیگم کا ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی،

یہ اہمیت کسی اہم واقعہ کا پیش منظر تھا۔ان سب کی نظر سلیمہ بیگم کی رہائش گاہ پر تھی۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مہرالنساء بیگم صرف شیر افگن کی بیوہ ہی نہیں جہانگیر کی برسوں پرانی محبوبہ بھی تھی۔شہنشاہ کا غیر معمولی التفات بھی انہیں چوکنا کیئے ہوئے تھا۔

سہ پہر ڈھل چکی تھی۔مہرالنساء بیگم ابھی تک اپنے کمرے میں موجود تھی۔دریائے جمنا کی ہوائیں مسرور کن انداز میں محوخرام تھیں۔وہ اپنے بستر پر پڑی کسی کتاب میں محو تھی کہ کنیز حاضر ہوئی اوراس نے انتہائی ادب سے کہا۔

''حضور۔!شہنشاہ جہانگیر حرم سرامیں تشریف لا چکے ہیں اور وہ آپ کو یاد فرمارہے ہیں۔''

اس کا دل خوشی سے بھر گیا لیکن چہرے پر حزن وملال کے ساتھ قدرے تلخی بھی درآئی۔یہ نقاب تھا جو ان دنوں وہ پہنے ہوئے تھی۔اس نے حیرت سے کنیز کی طرف دیکھا چند لمحے خاموش رہی اور پھر کہا

''تم جاؤ۔!میں آرہی ہوں۔''

''حضور۔!شہنشاہ معظم پائیں باغ میں تشریف فرما ہیں،اگر اجازت ہوتو میں آپ ہی کے ساتھ چلتی ہوں۔''

''تم ٹھہرو۔!میں چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر مہرالنساء بستر سے اتر آئی۔

شہنشاہ جہانگیر باغ کی معطر فضاؤں میں مسند پر براجمان تھا۔سرسبز وشاداب باغ نے ماحول کو شاندار بنادیا تھا۔ہواؤں میں دھیمی دھیمی ٹھنڈ اتری ہوئی تھی۔جس سے ماحول میں پرسکون کیفیت رچی ہوئی تھی جبکہ جہانگیر کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔اس نے مہرالنساء کو آخری باران دنوں دیکھا تھا جب شیر افگن قتل ہو گیا تھا اوراس نے اسے سلیمہ بیگم کے حوالے کیا تھا۔وہ سوگوار حسن اب بھی اس کی نگاہوں میں محفوظ تھا۔پتہ نہیں وہ اب کیسی ہوگی؟اسی سوال کا جواب ہی اسے مضطرب کررہا تھا۔کچھ ہی دیر بعد محل کی طرف سے غلام گردش کے ستونوں کے درمیان میں سے مہرالنساء چند کنیزوں کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دی۔وہ دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔بالکل کسی نئی نویلی دلہن کی طرح،لباس کے معاملے میں وہ خود تخلیق کار تھی۔اس لیے نہ صرف وہ اپنے بدن کے خطوط کو سمجھتی تھی بلکہ اسے لباس کو جاذب نظر بنانے کا فن بھی آتا تھا۔جہانگیر اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔وہ لمحہ بہ لمحہ اس کے نزدیک آتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ شہنشاہ کے حضور کورنش بجالائی۔وہ اس وقت تک جھکی رہی جب تک جہانگیر اسے اوپر اٹھنے کی اجازت نہیں دے دی۔مہرالنساء سیدھے کھڑی ہوگئی۔اس کی نگاہیں جھکی ہوئیں تھی لیکن چہرہ جہانگیر کی طرف تھا۔وہ اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔چند لمحوں کی محویت کے بعد اس نے ذراسا ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''تخلیہ۔!''

اس کا حکم پاتے ہی وہاں موجود سبھی کنیزیں اور ملازمائیں واپسی کے لیے مڑ گئیں۔ انہیں زیادہ دور نہیں جانا نہیں، صرف ایک آواز کی دوری پر تھیں۔ انہیں کسی بھی لمحے بلایا جاسکتا تھا۔

''مہرالنساء۔! بیٹھو۔!'' جہانگیر نے کہا تو وہ انتہائی نزاکت سے دوسری مسند پر بیٹھ گئی۔

''والدہ محترمہ کے پاس آپ کا وقت کیسا گذر رہا ہے؟''

''آپ کے خیال میں میرا وقت کیسا گذرنا چاہیے جہاں پناہ؟''

''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔'' جہانگیر نے اس کے چہرے پر نگاہوں کا طواف کرتے ہوئے پوچھا

''تو جہاں پناہ، جب وقت ہی گذارنا ہے تو کیسا بھی گذرے، اسے تو نبھایا جاتا ہے۔'' مہرالنساء نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا

''کیا آپ یہاں پر خوش نہیں ہو؟'' جہانگیر کے لہجے میں حیرت گھلی ہوئی تھی۔

''کیا مجھے خوش رہنا چاہیے جبکہ میرا شوہر قتل کر دیا گیا ہے اور میں بیوہ ہو چکی ہوں۔'' اس نے کمال بے اعتنائی سے کہا۔

''نہیں مہرالنساء بیگم نہیں۔! ایسا نہیں ہے۔ اسے قتل نہیں کیا گیا، وہ باغی تھا۔ ہم نے سلطنت کی حفاظت کے لیے باغی کی سرکوبی کی ہے۔ اس مہم میں میرا دودھ شریک بھائی کوکہ بھی جنت سدھار گیا۔ آپ خود بتاؤ۔! کیا باغی سلطنت کے لیے خطرہ نہیں ہوتے؟ کیا ان کی سرکوبی ضروری نہیں ہوتی؟''

''جہاں پناہ۔! میرے شوہر پر بغاوت کا محض الزام تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ رقابت میں مارا گیا ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''جو ہونا تھا وہ ہو چکا مہرالنساء بیگم۔!'' وہ مکدر لہجے میں بولا، عشق نہیں چاہتا تھا کہ حسن اس سے اس طرح بے رخی سے ہم کلام ہو۔ مگر وہ تو نجانے کیا سوچے بیٹھی تھی۔

''اس کا فیصلہ تو شاہی عدالت عظمیٰ ہی کر سکتی ہے۔ میں اپنے شوہر کے قتل کا مقدمہ ضرور دائر کروں گی مگر مجھے تو محصور کر لیا گیا ہے۔''

’’کیا اس سلطنت میں کوئی ایسی عدالت ہے جو ہماری منشاء کے خلاف فیصلہ دے دے۔‘‘

’’میں شہنشاہ کی عدالت میں مقدمہ دائر کروں گی اور اس کے ضمیر، قوت ایمانی اور عدل وانصاف کو پرکھوں گی۔‘‘

’’آپ بھول رہی ہو کہ میں ہی شہنشاہ ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو ٹھہرا اور پھر بولا۔’’سنو۔! بقول تمہارے کہ تم اپنے شوہر کے قتل کا مقدمہ دائر کروں گی لیکن ثبوت کہاں سے لاؤ گی۔‘‘ یہ کہہ کر وہ قدرے مسکرایا اس کے ان الفاظ کا اثر مہرالنساء پر پڑا۔ وہ چند لمحے ساکت سی بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر قدرے مسکراتے ہوئے بولی۔ اس کی نگاہ جہانگیر کی ریشمی قبا کے سرخ تکموں پر تھی۔

ترانہ تکمۂ لعل است برقبائے حریر
شدہ است قطرۂ خوں منت گریبان گیر

(آپ کے ریشمی لباس پر سرخ تکمے نہیں ہیں بلکہ یہ میرے شوہر کے خون کے قطرے ہیں۔ آپ اس خون سے بری الذمہ قرار نہیں دیئے جاسکتے۔)

شہنشاہ اس فی البدیہ شعر پر بہت مسرور ہوا اور اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور آنکھوں سے پیار امنڈ رہا تھا۔ انہی لمحوں میں اس نے کہا۔

’’مہرالنساء۔! بقول تمہارے کہ میں نے تمہارے شوہر کو قتل کرا دیا تو کیا میں اتنی قوت نہیں رکھتا کہ جبر سے تمہیں اپنی شریک حیات بنالوں۔ مگر نہیں، میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ماضی کو بھول کر تم میری وہی مہرالنساء بن جاؤ، پورے دل سے میری ہو جاؤ۔‘‘

’’ہاں۔ مگر اس شرط پر کہ میرے شوہر کا مقدمہ............‘‘

’’میں ابھی فیصلہ کیے دیتا ہوں کہ اس کے عوض میں تمہارا ہوتا ہوں۔‘‘ جہانگیر نے کہا تو مہرالنساء کے چہرے پر گلال اتر آیا۔ وہ شرمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ شہنشاہ نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اس نے کمال نزاکت سے تھام لیا۔ اور پھر خزاں رسید پتے کی مانند اس کی آغوش میں آ گری۔ سلطنت ہند کی تاریخ میں ایک نیا موڑ رقم ہو رہا تھا۔ دریائے جمنا کی ہواؤں نے یہ سرگوشی پورے محل میں پھیلا دی۔ کنیزوں کا شک یقین میں بدل گیا۔ رات گئے تک اس واقعہ پر سینکڑوں تبصرے ہو چکے تھے۔

......☆......

لاہور کی سرزمین پر سورج کی کرنیں پھیل جانے کو بے تاب تھیں۔ افق نارنجی رنگ کا ہو رہا تھا، جس پر سرمئی بادل پھیلے ہوئے تھے۔ شہزادہ خرم قلعہ لاہور میں چہل قدمی کے لیے نکل آیا تھا۔ اسی وقت اسے آگرہ سے آنے والے ایک خبر رساں کے بارے میں بتایا گیا۔ ایسے خبر رسانوں کے لیے شہزادے نے حکم دے رکھا تھا کہ انہیں فوراً ملوا دیا جائے۔ شہزادے نے محافظ کو اشارہ کیا تا کہ اسے پیش کیا جائے اور خود بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک شخص کو شہزادے کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ جھک کر کورنش بجالایا اور اگلے ہی لمحے خبر رساں نے ایک خط نکال کر شہزادے کو پیش کیا۔

''خدمت گار رضا کی جانب سے شہزادہ خرم کے لیے۔''

بلاشبہ وہ خط بہت اہم رہا ہوگا۔ شہزادہ خرم نے وہ خط لیا اور اس کی مہر توڑ کر متن پڑھنے لگا۔ اس میں شہنشاہ جہانگیر اور مہرالنساء کی ملاقات اور اس میں ہونے والی گفتگو کے بارے میں درج تھا۔ ان کی آنکھوں اور کانوں نے محل میں ہونے والے واقعات کو دیکھا اور اس تک پہنچا دیا۔ خط پڑھتے ہی شہزادہ خرم کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اور چند لمحوں کے لیے تو وہ خوابوں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ ہوش آنے پر اس نے اشارے سے تخلیے کا اشارہ کیا تو وہ تعظیم سے جھک کر چلے گئے۔

کیا قدرت اس کی اور ارجمند کی شادی کے لیے راہیں ہموار کر رہی ہے؟ خرم نے بڑی دلچسپی سے سوچا۔ جس سے نئی نئی سوچیں سر اٹھانے لگیں۔ کیا شہنشاہ نے صرف اس خاندان سے قرابت داری کے لیے اس کی منگنی کی تھی؟ کیا اس کی محبت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی؟ اسے یہ معلوم تو تھا کہ اس کا باپ مہرالنساء کو چاہتا ہے اور اس کی چاہت کا زخم ابھی تک ہرا ہے۔ تو کیا اس کی منگنی جسے شہنشاہ کر کے بھول چکا تھا اور شیر افگن کی موت، ایک ہی سلسلہ کی دو مختلف کڑیاں ہیں؟ کیا اب اس کی شادی اس صورت میں ممکن ہے کہ بادشاہ سلامت کی شادی مہرالنساء سے ہو جائے گی؟ یہ اندازہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس تک جو خبریں پہنچی تھیں۔ اس میں یہی کچھ تھا کہ جہانگیر نے مہرالنساء سے شادی کی درخواست کی ہے۔ بلاشبہ اس شادی کے لیے اس کے خاندان کے لوگ بھی شامل ہوں گے۔ ارجمند کا معاملہ جو اب تک دبا چلا آ رہا تھا۔ پھر سے سامنے آ جائے گا۔

دربار میں جانے سے پہلے وہ کاغذ اور قلم سنبھال کر بیٹھ گیا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر دو خط لکھے۔ ایک خدمت گار خاں رضا کے نام اور دوسرا ارجمند بانو کے لیے۔ دوپہر ہو جانے تک اس نے دونوں خط مکمل کر لیے اور ایک تازہ دم خبر رساں

کو آگرہ کی طرف بھیج دیا۔

......☆......

ارجمند تک پوری تفصیل سے یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ مہر النساء نے آخر کار جہانگیر سے شادی کرنے کے لیے ہاں کر دی ہے اور اب محل میں اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ صرف اسے ہی نہیں پورے گھر میں اس واقعہ کو دلچسپی سے لیا جا رہا تھا۔ مہر النساء سے متعلق ذرا ذرا سی بات اس تک پہنچ رہی تھی۔ یہاں تک اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بادشاہ جب بھی کوئی نیا شعر یا غزل کہتا ہے تو اس کے ہرکارے اسے لے کر فوراً مہر النساء تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان اشعار میں جہانگیر کی بے تابی اور دلی کیفیات پنہاں ہوتی تھیں جو مہر النساء کے لیے تھیں۔

دن گذرتے چلے جا رہے تھے کہ ایک دن عیسیٰ نے آ کر اسے بتایا۔

''آقا زادی۔! خدمت گار رضا کی طرف سے آپ کے لیے پیغام ہے۔''

''کیا ہے وہ پیغام۔؟''

''آپ کے لیے شہزادہ خرم نے لاہور سے خط بھجوایا تھا جو آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی اچک لیا گیا ہے۔ اس میں شہزادے نے آپ کے لیے کچھ باتیں لکھیں تھیں۔''

''احمق۔! ظاہر ہے جب میرے لیے ہو گا تو اس میں میرے متعلق ہی باتیں ہوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''لیکن وہ خط...... کس نے چھینا اور کیوں......؟''

''اصل میں رضا کا پیغام یہی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ خط مہر النساء کے پاس ہے کیونکہ اس مہر بند خط کے ساتھ کچھ تحائف بھی تھے جو مہر النساء بیگم کے پاس دیکھے گئے ہیں۔''

''مہر النساء بیگم۔!'' ارجمند نے حیرت سے کہا۔ ''وہ کیوں......؟''

''میں اس سے متعلق کچھ نہیں جانتا۔'' عیسیٰ نے بے چارگی سے کہا اور خاموش باادب کھڑا رہا۔

ارجمند سوچ میں پڑ گئی کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔ اسے کیوں میرے معاملات میں دلچسپی ہے؟ اسے کیسے پتہ چلا کہ میرے کے لیے شہزدہ خرم نے لاہور سے خط بھجوایا ہے؟ یہ اور ایسے کئی سوال اس کے ذہن میں آتے چلے گئے لیکن ان تمام سوالوں کا جواب مہر النساء کے پاس تھا اور وہ محل میں سلیمہ بیگم کے پاس تھی۔

ارجمند، محل میں مہرالنساء بیگم کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے وہاں آئے کافی وقت ہو گیا تھا لیکن وہ اس سے بات نہیں کر پائی تھی۔ انہیں تنہائی میسر ہی نہیں آئی تھی۔ مہرالنساء بیگم بہت زیادہ مصروف تھی۔ ارجمند یہ سب کچھ بغور دیکھ رہی تھی۔ اس نے آتے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس کی پھوپھی کے چہرے پر سے بیوگی کا نقاب اتر گیا ہے۔ ایک جوان بیٹی ہونے کے باوجود اس کا انداز یوں تھا جیسے کنواریوں کے بیاہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شادی کی تیاریوں میں پوری طرح جذب تھی۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنا ماضی بھول چکی ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں موجود چمک اس کے خوابوں کی تکمیل کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ گماں یہی تھا کہ اسے جہانگیر سے نہیں بلکہ اس کے مضبوط تخت سے محبت تھی۔ وہ اپنا تخلیق کردہ لباس خود تیار کروا رہی تھی۔ طلائی تاروں سے کڑھا ہوا گھاگھرا، چوڑی دار پاجامہ اور بلاوز جس پر سرخ آنچل۔ اس پر کڑھائی کا نمونہ خود اس نے بنایا تھا اور ماہر کاریگر عورتیں وہ لباس تیار کر رہی تھیں۔ یہیں پر اس نے اس زیور کی بھی نمائش کی تھی جو اس نے اپنی شادی والے دن پہننا تھا۔ طلائی کنگن جس میں زمرد جڑے ہوئے تھے۔ موتیوں کا ہار جس میں انگور دانوں کے برابر موتی تھے۔ جھمکے۔! جن میں ہیرے تھے اور ان کی جسامت سنگ ریزوں جتنی تھی۔ پازیب جو طلائی تھی اور اس میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے دانوں جیسے گھنگھرو تھے۔ ہیرا جڑی گل میخ جو اس کے ناک کے لیے تھی، انگوٹھیوں کا شمار نہیں تھا، اس کے علاوہ بہت سا زیور، یہ سارا زیور اس کے پہننے کے لیے تھا لیکن ارجمند کو اس سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ اسے اپنے محبوب کی طرف سے بھیجے گئے ان لفظوں کی طلب تھی جو فقط اس کے لیے تھے اور اب مہرالنساء کے پاس تھے۔

''آپ نے میرا خط کیوں روک لیا تھا؟'' تخلیہ میسر آتے ہی ارجمند نے اپنی پھوپھو سے پہلا سوال ہی یہی کیا۔
مہرالنساء نے تحمل اور سرد مہری سے کہا۔

''یہ شہنشاہ کا حکم تھا۔''

''لیکن کیوں۔؟ شہنشاہ کو اس میں کیا دلچسپی تھی؟''

''تم مجھ پر شک کر رہی ہو ارجمند۔! مگر تمہارا ایسا سوچنا فضول ہے۔ تم میرے ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ میں تو چاہوں گی کہ تمہارا اور خرم کا ملن ہو جائے، اس سے ہمارے ہی خاندان کو تقویت ملے گی۔ جہانگیر سے شادی کے بعد میں ملکہ ہندوستان کہلانے والی ہوں۔ اور میری ترجیح یہی کہ آئندہ بھی کوئی ملکہ میرے ہی خاندان سے ہو۔

اس نے پر خلوص انداز میں کہا لیکن ارجمند بچپن سے وہ لہجہ سنتی آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے انداز میں لہجہ

خالص نہیں ہے۔

''لیکن میرا سوال ہنوز وہی ہے کہ شہنشاہ کو اس خط میں کیا دلچسپی تھی؟''

''یہ مملکت کے معاملات ہیں میری بھتیجی۔!'' مہرالنساء نے کندھے اچکاتے ہوئے بے خبری سے کہا۔لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اشارے میں کہہ دیا'' گل بدن یہاں رہ کر خوش نہیں ہے۔اس نے شاہ ایران کو خط لکھا ہے اور اس خط میں یہاں کے سارے معاملات لکھ دیئے ہیں۔شہنشاہ نہیں چاہتا کہ اب..........''

''آپ یہ سب کیسے جانتی ہیں؟'' ارجمند نے تیزی سے پوچھا۔

''شہنشاہ نے یہ مجھے خود بتایا تھا۔گل بدن کا لکھا ہوا خط راستے ہی میں روک لیا گیا تھا۔شاہ ایران تک یہ ساری معلومات کا پہنچ جانا نئے مسائل پیدا کرنے والی بات ہوگی۔شہنشاہ فطری طور پر خرم سے محبت کرتا ہے لیکن حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ تمہارے اور خرم کے معاملات کو آگے بڑھنے دیا جائے اور یہ ایک قضیے کے طور پر سامنے آجائے۔''

''لیکن میرا خط آپ کے پاس کیوں ہے؟''

''اس لیے کہ وہ خط میں ہی سنبھال سکتی ہوں۔'' مہرالنساء نے کہا۔اس کی آنکھوں میں اک نئی طرح کی چمک ابھر آئی تھی۔''میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں وہ خط نہیں پڑھوں گی اور جب بھی مناسب موقع آیا ہیں وہ خط تمہیں دے دوں گی۔اس سے متعلق شہنشاہ کا خصوصی حکم ہے اور میں اس حکم کی تعمیل کروں گی۔''

مہرالنساء نے صاف انداز میں کہا اور اس سے رخ پھیر لیا۔

ارجمند کے لیے مہرالنساء کا رویہ الجھنیں پیدا کررہا تھا۔وہ اس سے ہمدردی کا اظہار بھی کررہی تھی اور اس کا عمل کہے گئے لفظوں سے الٹ تھا۔حالات ایسے تھے کہ وہ مضبوط تخت کے نزدیک تھی۔ایسے وقت میں ارجمند کے لیے وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔کیونکہ اسے زیادہ تقویت شہزادی گل بدن دے سکتی تھی۔اگرچہ ان دونوں کے درمیان ابھی تک باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن ایران سے تعلق اور محبت کی بنیاد سے ان کی درمیان میں بہترین روابط پیدا ہو چکے تھے۔مہرالنساء کے چہرے پر سکون تھا اور حاکمیت کے جذبہ کو تسکین ملنے والی تھی۔اس نے انتہائی تحمل سے ارجمند کو قائل کرتے ہوئے کہا۔''تم گھبراؤ مت۔!میں شہنشاہ سے بات کروں گی۔''

لیکن ارجمند کو امید نہیں تھی۔

......☆......

اس شب قلعہ آگرہ کا محل بقعہ نور بنا ہوا تھا۔شاہی باغ میں ایک عظیم الشان ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لاتعداد مہمان شریک تھے۔ وہ دن اور پھر آنے والی رات مغلیہ تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ ''شہزادہ سلیم'' کے دل میں جس محبت کا بیج پڑا تھا اور پھر وقت کے ساتھ وہ ایک تنا آور درخت بن گیا تھا۔اس کے ثمر کا دن تھا۔ جہانگیر کا عشق بار آور ہوا تھا۔ہجر ختم ہوا تھا اور وہ وصال کی گھڑیاں تھیں۔ مہر النساء اس کے عقد میں آ گئی تھی۔ جس وقت شاہی باغ میں وہ عظیم الشان ضیافت چل رہی تھی۔ اس وقت شہنشاہ حرم سرا کے اس رہائشی حصے میں موجود تھا جہاں سلیمہ بیگم رہتی تھیں۔ مہر النساء اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی اور مغلیہ خاندان کے افراد نے انہیں گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

'' آج سے مہر النساء بیگم......نور محل کے لقب سے منقلب ہوئیں۔'' جہانگیر نے یوں کہا جیسے کوئی انمول شے اس کے عظیم خزانے میں آ گئی ہو۔اس کی آنکھوں کی چمک سے یوں عیاں تھا جیسے کہ کائنات کی کوئی عالی شان چیز وہی نور محل ہو جس کا سایہ پورے جہاں پر پڑ رہا ہو۔ ''یہ میری نور جہاں ہے۔''

شہنشاہ کے اعلان کے ساتھ ہی وہاں ہلچل ہوئی اور رسوم کی ابتداء ہوگئی جو شاہی خاندان کے شایان شان تھیں۔ اک ہنگامہ تھا جو محل میں برپا تھا۔

ارجمند اس ہنگامے سے بے نیاز صرف شہزادہ خرم میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر اس پر جا ٹھہرتیں تھیں۔ بہت عرصے بعد دو دل آمنے سامنے ہوئے تھے مگر ایک لفظ بھی ایک دوسرے کو نہیں کہہ پائے تھے۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں نجانے کتنے پیغام وہ ایک دوسرے کو دے چکے تھے لیکن لفظ تو من میں اتر جایا کرتے ہیں۔ وہی نہیں کہہ پائے تھے۔

سرد ہواؤں نے آگرہ شہر کو خنک کر دیا تھا۔سنہری دھوپ شفاف طلائی چادر کی مانند پھیلی ہوئی تھی۔صبح کی چہل پہل میں ٹھہراؤ آ چکا تھا۔ارجمند بانو تیار ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔اس کے چہرے پر پراسرار درخشندگی تھی

جس میں تنہائی پسندی اور حسرت کا غم گھلا ہوا تھا۔ امید کی روشنی اس کے چہرے پر رقصاں تھی۔ اس نے اپنے آپ کو مصروفیت میں ڈبو لیا تھا۔ شاعری قصہ پارینہ بن گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس شفاخانے کے دورے پر جانے کے لیے تیار تھی جو اس نے بنوایا تھا۔ چاندی کے اس زیور کے عوض شہزادہ خرم نے جو اسے طلائی سکوں سے نوازا تھا وہ اس نے خود اسی شفاخانے کی تعمیر میں صرف کر دیئے تھے جہاں پر غریبوں کا مفت علاج ہوتا تھا۔

شفاخانے کے باہر اس کی پالکی رکی تو اس کے ساتھ آئے غلام اور کنیزیں بھی رک گئیں۔ اس گلی میں بھکاریوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ انہیں یہ آس تھی کہ اس دن انہیں یہاں سے پیٹ بھر کے کھانا ملے گا۔ ارجمند نے ایک نگاہ ان پر ڈالی اور شفاخانے میں داخل ہو گئی۔ اس کا چہرہ نقاب میں پوشیدہ تھا۔ اس شفاخانے میں بہت سارے لوگ زیر علاج تھے۔ ان کی خدمت پر کافی زیادہ عملہ مامور تھا۔ اطباء بڑی محنت سے ان کا علاج کر رہے تھے۔ ارجمند نے خاص طور پر یہ ہدایات دے رکھی تھی کہ بے آسرا خواتین کا سب سے زیادہ خیال رکھا جائے۔ وہ ہر مریض کے پاس جاتی، اس کی ضرورت پوچھتی اور پھر ان میں پھل تقسیم کرتی رہی۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔

وہ شفاخانے سے باہر آ گئی۔ جہاں بھکاری بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اب وہ ایک ہجوم کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ لیکن اس کے ماتھے پر کبھی بھی شکن نمودار نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ان بھکاریوں میں کھانا تقسیم کیا کرتی تھی۔

اس وقت وہ کھانا تقسیم کرنے کے لیے بڑھی تھی کہ ایک نوجوان اس کے سامنے آ کر ادب سے جھکا اور پھر نگاہیں نیچی کیے بڑے ادب سے بولا۔ ''میرا نام خدمت گار خاں رضا ہے۔''

اس کے یوں کہنے پر ارجمند کی آنکھوں میں ایک چمک اتر آئی۔ اس نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے نام کے ساتھ ایک اعتماد ضرور بندھا ہوا تھا جو شہزادہ خرم نے بخشا تھا۔

''رضا۔! کیسے آنا ہوا؟'' ارجمند نے پوچھا تو اس نے طلائی سکوں کی تھیلی بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تھوڑی سی رقم قبول کیجئے جو آپ کے شفاخانے کے لیے ہے۔''

ارجمند کے اشارے پر ایک کنیز نے وہ تھیلی پکڑ لی اور ارجمند کو دے دی۔ اس نے تھیلی پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تھیلی کس نے بھیجی ہے؟''

''شہزادہ معظم خرم نے۔'' یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا اور پھر بولا'' یہ بہت ضروری ہے کہ ان دنوں آپ اپنی پھوپھو ملکہ نور جہاں سے ضرور ملاقات کریں۔ کیونکہ محل میں ہواؤں کا رخ بہت حد تک تبدیل ہو رہا ہے۔شہزادہ خسرو کی آمد محل میں ہونے لگی ہے۔''

''ہاں۔! میں ضرور اپنی پھوپھو سے ملنے جاؤں گی۔'' ارجمند نے پرخیال انداز میں کہا اور چند لمحے خاموش رہی۔ پھر رضا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔''اور کچھ رضا۔؟''

''نہیں بیگم صاحبہ۔! مزید کچھ نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا'' آپ کے اس شفاخانے اور غریب خانے کا خرچ تو بہت بڑھ گیا ہوگا۔''

''ہاں۔! لیکن اس کے ساتھ جو سکون نصیب ہوتا ہے وہ قیمت دے کر بھی نہیں ملتا۔ان غریبوں کی مدد کون کرے گا؟ ہمیں ہی ان کی مدد کرنا ہوگی۔''

''جی بیگم صاحبہ۔! اگر چہ یہ بادشاہ کے فرائض میں شامل ہے؟''

''مگر وہ انہیں نہیں دیکھ پا رہے۔کیا اس صورت حال میں ہم انہیں اکیلا چھوڑ دیں۔''

''بے شک نہیں۔'' رضا نے کہا

''تم یہاں رہو رضا اور دیکھو کہ انہیں ہماری محبت اور دیکھ بھال کی کس قدر ضرورت ہے۔'' ارجمند نے کہا اور اس جگہ پر جا پہنچی جہاں تقسیم کرنے کے لیے کھانا پڑا ہوا تھا۔ بھکاری قطار میں کھڑے تھے۔وہ اپنی باری پر آتے اور اپنی بھوک سے بڑھ کر کھانا پا کر آگے بڑھ جاتے۔ان میں ہر طرح کے لوگ تھے۔نہ مذہب کی تخصیص تھی اور نہ ان کی ظاہری حالت پر کوئی شکن اس کے ماتھے پر نمودار ہوئی تھی۔ وہ ان بدبودار غریبوں کے درمیان، ایک وجد کے ساتھ کھانا تقسیم کرتی رہی اور سورج اس کا تماشائی رہا۔

سارا دن غریبوں میں ہمدردی تقسیم کرتے رہنے کے بعد جب وہ تھکے ہوئے بدن کے ساتھ واپس اپنے گھر لوٹی تو اس کی سوچیں بھی تقسیم ہو رہی تھیں۔ پہلے جب بھی وہ واپس اپنے گھر آیا کرتی تھی تب اس کے ذہن میں انہی سے متعلق سوچیں ہوتی تھیں۔کہ ان کے لیے مزید کیا کیا جائے؟ ان کے لیے خرچ کی رقم کہاں سے آئے گی؟ لیکن اس دن رضا نے اشارے میں جو کچھ کہا تھا، اسے مزید بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔اس نے ملکہ نور جہاں اور شہزادہ خسرو کی جانب اشارہ

کیا تھا۔کیا یہی دو کردار اس کی قسمت کے کھیل میں کوئی نیا موڑ لانے والے ہیں؟ کیا شہزادہ خرم کے ہاتھوں سے بھی تقدیر پھسل رہی ہے؟

......☆......

ملکہ نور جہاں، قلعہ آگرہ کے محل میں موجود سب سے زیادہ شاندار رہائشی حصے میں مقیم تھی۔ وہاں سے دریائے جمنا کا نظارہ انتہائی خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ دھیرے دھیرے چلنے والی خوشگوار ہوا جالیوں سے چھن کر آتی اور ان کاغذات کو پھڑ پھڑانے لگتی جو کمرہ خاص کے قالین اور میزوں پر دھرے رہتے تھے۔ اس کمرہ میں بیش قیمت اشیاء دھری ہوئیں تھیں۔ ملکہ نور جہاں کے لیے تحائف کی بہتات یوں تھی جیسے بارش ہوتی ہے۔ عمائدین سلطنت، وزراء، امراء اور جاگیردار یہ سمجھتے تھے کہ شہنشاہ تک رسائی کا واحد راستہ اب یہی ہے۔ نور جہاں کی سرگوشیاں انتہائی قیمتی تھیں۔ اس لیے اس کا رہائشی حصہ قیمتی اشیاء سے بھرتا چلا جا رہا تھا۔ سب سے زیادہ قیمتی طلائی میز پر دھری خالص سونے سے بنی وہ مہر تھی جسے شاہی مہر (مہر اوزاک) کہا جاتا تھا۔ ارجمند نے پہلے کبھی شاہی مہر نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس کے قریب چلی گئی اور اسے اٹھا کر دیکھا۔ اس کے ابھار کا پھیلاؤ محرابی تھا۔ وہ ٹھوس سونے سے بنی ہوئی تھی۔ اس کی دستی پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس پر فارسی زبان میں چند لفظ کندہ تھے۔ اس کو اسی نمونے سے بنایا گیا تھا جب پہلی مغلیہ سلطنت قائم ہوتے ہی پہلی شاہی مہر بنائی گئی تھی۔ وہ خاصی بھاری مہر تھی۔ اس نے ایک کاغذ پر اسے لگایا تو مغلیہ نشان ''شیر'' کے ساتھ فقط ''جہانگیر'' کندہ تھا۔ وہ مہر جس کا تعلق امور سلطنت سے تھا ملکہ نور جہاں کے کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔

''یہ کھلونا نہیں ہے ارجمند، اسے رکھ دو۔'' نور جہاں نے مسکراتے ہوئے قدرے طنز سے کہا تو ارجمند نے مہر واپس رکھ دی اور اپنی پھوپھی کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''تم خوش ہو ارجمند۔!'' نور جہاں نے پوچھا

''بالکل۔!''

''کمال صبر ہے تمہارا۔ تقریباً پانچ سال ہو گئے ہیں لیکن تم نے کوئی کوشش نہیں دکھائی۔ تمہیں خرم تک پہنچنے کے لیے کوئی نہ کوئی جدوجہد تو کرنی چاہیے تھی۔''

''جی پھوپھو۔! میں شاید آپ کی طرح نہیں۔ میں محبت کے معاملے میں جدوجہد سے زیادہ یقین کی قائل ہوں۔''

''لیکن اگر تم کوشش بھی کرو تو یہ بے فائدہ ہوگی۔ دراصل معاملہ دو سلطنتوں کا آ گیا ہے۔ جب تک یہ معاملہ اپنے منطقی انجام تک نہیں پہنچ جاتا۔ خرم کے بارے میں کوئی اور فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ شہنشاہ کا یہ خیال ہے کہ وہ ایران سے اپنے دوستانہ تعلقات قائم رکھے کیونکہ اسی میں نہ صرف مغلیہ خاندان کی بلکہ ہندوستان کی خوشی اور خیر و عافیت مضمر ہے۔ اب گل بدن کو واپس ایران نہیں بھجوایا جا سکتا اور نہ ہی اسے طلاق دی جا سکتی ہے۔ اس کے درمیان کوئی راستہ تلاش کرنے کی فکر ہو رہی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ اپنے ساتھ کس قدر بیش قیمت تحائف لائی ہے۔''

''آپ اس سلسلے میں کیا کر رہی ہیں؟'' ارجمند نے انتہائی تحمل سے پوچھا

''یہی کہ کوئی راستہ نکل آئے۔ میں نے خرم کے ساتھ اس معاملہ پر گفتگو کی تھی۔ لیکن وہ کوئی حل پیش نہیں کر سکا۔ تم سمجھ رہی ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔''

''جی۔!''

''ارجمند۔! شادی صرف خواہشوں اور توقعات کی وجہ سے نہیں ہوتی۔''

''میں سمجھتی ہوں۔'' ارجمند نے پرخیال لہجے میں کہا اور پھر یہ موضوع ہی بدل دیا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ نور جہاں کے خیالات کیا ہیں اب اسے کیا کرنا ہے۔

......☆......

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ ارجمند اپنے گھر واپس آنے کے لیے تیار تھی۔ وہ محل سے واپس جانے کے لیے اپنی کنیزوں کے ساتھ غلام گردش سے آگے بڑھی تھی کہ شہزادہ خسرو کی آمد کا غلغلہ مچا۔ وہ رک گئی۔ اس کی زبردست خواہش تھی کہ وہ خسرو سے ملے۔ بحیثیت انسان اسے خسرو سے ہمدردی تھی۔ جہانگیر نے بھی عجیب طبیعت پائی تھی۔ بغاوت کے جرم میں اسے قید کر دیا گیا تھا اور اسے یہ سزا دی تھی کہ اس کی آنکھوں کا نور چھین لیا گیا تھا۔ مگر جب اس نے ملکہ نور جہاں سے شادی کی تھی تب سے اس کی قید میں بڑی حد تک نرمی دے دی گئی تھی۔ وہ محل میں جب چاہے آ جا سکتا تھا۔ جہانگیر کے ان احکامات میں حرم سرا کی بیگمات کی بہت حد تک خواہش اور دباؤ تھا۔ شہزادہ خسرو بہر حال قیدی اور سزا یافتہ تھا۔ محل میں اس کی آمد بھی ایک قیدی کی طرح ہوتی تھی۔ ارجمند ٹھہر گئی اور شہزادہ خسرو کو آتا دیکھنے لگی جس کے ایک ہاتھ میں طلائی زنجیر پڑی ہوئی تھی اور اس کا دوسرا سرا محافظ کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں روشنی نہیں تھی۔ یوں اس کا محافظ اس کا راہنما بھی تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے آ

گئے۔ارجمند رک گئی تو اس نے پوچھا ''کون ہے؟''

''ارجمند بانو بیگم۔!'' محافظ نے ادب سے کہا تو خسرو کے سپاٹ چہرے پر خوشی کا دیا روشن ہو گیا۔

''کہاں ہے؟'' اس نے فضا میں اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو ارجمند نے تھام لیا۔

''میں آپ کے پاس ہوں شہزادہ معظم۔!''

''آہ۔! ارجمند۔! میرے چھوٹے بھائی کی محبت، میں نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا لیکن تمہارے حسن کے بارے میں بہت سنا ہے، اس قدر سنا ہے ارجمند کہ تمہیں دیکھنے کی شدید خواہش تھی مجھے۔لیکن اب۔! اب میں تمہیں نہیں دیکھ پاؤں گا۔ اب یہ خواہش حسرت ہی تو ہے۔''

''قسمت۔! شہزادہ معظم قسمت۔!'' ارجمند نے نہایت ہمدردی سے کہا۔''اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات انسان اپنی خوش قسمتی، اطمینان اور سکون کو خود اپنے ہاتھوں مٹا دیتا ہے۔''

''ہاں۔! جس طرح شیر افگن نے اس ایرانی رنڈی سے شادی کر کے اپنی قسمت پر لکیر پھیر دی تھی اور اب میرا باپ اس کے ساتھ اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے کے لیے شادی کر چکا ہے۔مگر وہ بھی نہیں جانتا کہ وہ بھی اپنی قسمت کی بری گھڑی کو قریب لا چکا ہے۔؟

''شہزادہ معظم۔! یہ ظلم ہے کہ آپ ایسے لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ وہ میری پھوپھی ہیں۔'' ارجمند نے دبے دبے احتجاج سے کہا۔

''ہاں ظلم۔! میں شاید ظلم کے بارے میں نہیں جانتا، لیکن تم میری آنکھوں پر نگاہ ڈال کر ظلم دیکھ سکتی ہو۔ کیا میں یہ کہوں کہ بادشاہ بہت رحم دل ہے کہ اس نے مجھے قتل نہیں کیا، محض اندھا کر دیا ہے۔''

''یہ ہر اس حکمران کا ردعمل ہوتا ہے جو حکمرانی کرتا ہے اور جو کوئی اس کا تخت چھیننے کی کوشش کرے۔''

''اب یہ بحث فضول ہے کہ کس نے کس سے تخت چھینا تھا اور کون اپنے حق کے لیے لڑا تھا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے تخت نشینی کے لیے چنا گیا تھا۔ شاید مجھ پر یہ ظلم تھا۔ اکبر نے میرے دماغ میں وہ خواب بھر دیا تھا جس نے میری آنکھوں کی روشنی چھین لی۔ کیا میں اس سے نفرت بھی نہ کروں جسے میرا باپ کہا جاتا ہے۔ میرے دادا کی آغوش میرے لیے زوال کا باعث ہے۔ میرے دادا نے مجھے خواب ہی اس قدر توانا دیا تھا کہ میں اس سے کسی طور کم پر راضی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں جہانگیر

کی اطاعت قبول کر کے اب بھی کسی صوبے کا صوبہ دار بن سکتا ہوں لیکن میں اب بھیک نہیں مانگوں گا۔ تمہیں شاید پتہ نہیں عظیم مغل یا تو تخت پر بیٹھتے ہیں یا پھر تختہ قبول کر لیتے ہیں۔"

"خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں شہزادہ معظم۔ ان کے پیچھے بھاگنے والوں کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔"

"ارجمند بانو بیگم۔! تم اب بھی نہیں سمجھ سکتی کہ یہ ایسا خواب تھا جس کی جڑیں حقیقت میں تھیں۔ آؤ۔ میں تمہیں بھی وہ خواب دکھاؤں، جس کی پراسراریت نے مجھے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے قدم بڑھا دیا۔ ارجمند اسے منع ہی نہ کر سکی۔ اس لیے وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔

وہ چلتے ہوئے محل کے اندر پہنچ گئے۔ غلام اور کنیزیں جھک جھک کر اسے تعظیم دے رہی تھیں۔ وہ ان روشن غلام گردشوں میں بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ محل کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں محافظوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ سب انہیں دیکھ کر چوکنا ہو گئے۔ خسرو ان کے قریب پہنچ گیا اور ان کے سربراہ سے بات کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ وہ اسے دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئے۔ خسرو آگے بڑھتا چلا گیا۔ اور ارجمند بھی اس کے ساتھ قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی۔ وہ تینوں محافظوں کے درمیان سے گذرتے چلے جا رہے تھے۔ راہ میں کئی چوکیاں آئیں جہاں ان تینوں کے نام لکھے جاتے رہے، آخر ایک بڑے سے دروازے سے کچھ پہلے ہتھیار بند محافظوں کے سامنے جا کر رک گئے۔ وہاں انہیں روک کر محافظوں نے خسرو کی تلاشی لی۔ اس کے پاس مرصع خنجر تھا۔ اس کے علاوہ کمر بند اور طلائی بازو بند اور انگھوٹیاں اتار دیں۔ ارجمند بانو کا سارا زیور وہاں اتار دیا گیا۔

"یہ سلطنت کا دل ہے۔" خسرو نے ایک بڑے پھاٹک کو ہاتھ سے کھولتے ہوئے کہا۔ "ہندوستان میں چند لوگوں کے علاوہ اسے کوئی بھی نہیں کھول سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے محافظ کو اشارہ کیا۔ اس نے زنجیر کھول دی۔ تب خسرو نے اندر قدم رکھا۔ اس کے ساتھ ارجمند تھی۔ اندر جامد خاموشی تھی۔ بے روح ماحول جس میں زندگی نہیں ہوتی۔ تبھی اسے روشن دِیّا تھما دیا گیا۔ جیسے ہی وہ دِیّا اندر آیا تو ہزاروں شعلے کوند گئے۔ ایک شعلے کا عکس ہزاروں میں تبدیل ہو گیا اور کمرہ بقعۂ نور بن گیا۔

"کیسا لگ رہا ہے؟" خسرو نے پوچھا

"خوف۔!" ارجمند نے کپکپاتے ہوئے کہا

"ہاں۔! میں نے بھی پہلی بار ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ یہاں خوف کے لیے کئی ساری وجوہات ہیں، ایک تو شہنشاہ کی

روح ہے جو یہاں ہر وقت سایہ فگن رہتی ہے۔ یوں جیسے سانپ یا کوئی بڑا اژدھا۔ دوسرا یہاں کا منظر ہمارے اندر لالچ بھر دیتا ہے۔ اس قدر لالچ کہ اس سے زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور بولا'' یہاں پر دو کتابیں پڑی ہوں گی۔ وہ اٹھا کر مجھے دو۔''

ارجمند نے دیکھا ایک کونے میں چاندی کی میز پڑی ہوئی تھی اور اس پر دو بڑی کتابیں رکھی ہوئیں تھیں جن کی جلدیں چمڑے سے بنی ہوئیں تھیں۔ ارجمند نے ان میں سے ایک اٹھائی اور اسے خسرو کی جانب بڑھائی۔ اس نے کتاب نہیں پکڑی بلکہ یونہی ساکت کھڑا رہا اور بولا۔

''میں تو اندھا ہوں۔ میں پڑھ نہیں سکتا۔ تم پڑھو۔ کوئی سا بھی صفحہ کھول کر پڑھو۔!''

ارجمند نے یونہی کتاب کھولی اور پڑھنے لگی۔'' سات سو پچاس سیر موتی، پچھتر سیر جواہرات، تین سیر ہیرے......
ارجمند نے گھبرا کر سر اٹھایا تو خسرو تاریک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

''گھبرا گئیں۔! چلو کوئی اور صفحہ پڑھو۔''

ارجمند نے کتاب بند کر کے دوبارہ کھولی اور پڑھا۔'' دو سو طلائی خنجر، تین سو طلائی خنجر مرصع مع ہیرے جواہرات، ایک ہزار طلائی سجاوٹی پتریاں، دو طلائی تخت، تین چاندی کے پچی کاری والے تخت............''

ارجمند نے پڑھنا بند کر دیا۔ اس نے کتاب وہیں رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی۔ کتاب رکھنے کی آواز کی وجہ سے خسرو نے پوچھا۔

''کتاب کیوں رکھ دی۔''

''محض کتاب پڑھنے سے یہ معمہ کس طرح حل ہو جائے گا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟'' اس نے الجھتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا اور پھر بولا۔

''آؤ۔!'' یہ کہہ کر اس نے قدم بڑھا دیئے۔ وہ جس کمرے میں آئے وہ بہت بڑا تھا۔'' دِیّا اونچا کرو۔'' ارجمند نے دِیّا اوپر کیا تو وہاں بھی ویسی ہی روشنی ہو گئی۔ ہزاروں دیئے لمحہ بھر میں روشن ہو گئے۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا ہر طرف خزانہ پڑا ہوا تھا۔

سنگ سلیمان، اوپل، فیروزہ، یاقوت، لعل، زمرد سے بھرے بڑے بڑے طشت پڑے ہوئے تھے۔ چاندی کے قندیل دان، طلائی جام، طشتریاں، آئینے پکھراج، نیلم، زمرد مرجان کے کئی لڑی ہار، سونے کی ڈلیاں،......

''دیکھا تم نے ارجمند بانو۔! یہاں کتنا خزانہ ہے۔ یہ ابھی ہم صرف ایک کمرے تک آئے ہیں۔''

''شہزادہ معظم، یہاں سے چلیں۔''

''ہاں۔! تمہیں یہاں پر حبس محسوس ہو رہا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہاں پر سانس تک رک جاتا ہے اور تم محسوس کرو اس وقت کو جب میں دس سال کا تھا اور میرے دادا اکبر مجھے یہ سب دکھانے کے لیے یہاں لے آئے تھے۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ ایک دن یہ سب میرا ہوگا۔ تم خود سوچو ارجمند۔! میں کیوں نا خواب دیکھوں۔ میں کیوں نا اس تخت کے حصول کے لیے اپنی جان لڑا دوں جس کے لیے مجھے چنا گیا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکا اور پھر بولا ''اس سے اگلے کمرے میں ظروف پڑے ہیں، طلائی ظروف اور اس سے آگے...........''

''میں اب جانا چاہوں گی شہزادہ معظم۔!''

''ہاں۔! لیکن وہ ایرانی رنڈی...... وہ اس پر قابض ہو جائے گی، محض میرے باپ کی بے وقوفی کی وجہ سے۔''

اس پر ارجمند کچھ نہیں بولی بلکہ واپسی کے لیے چل دی۔ اس نے خسرو کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''یہاں ہر شے روزانہ گنی جاتی ہے۔ اس حساب کتاب کو کئی بار ملایا جاتا ہے۔''

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔'' اس نے کہا اور واپس دروازے تک آ گئی۔ وہ دوبارہ انہی مراحل سے گذرتے ہوئے غلام گردشوں سے واپس ہو گئے۔

''یہ ایک سونے کا قید خانہ ہے، جہاں زندگی نہیں موت رہتی ہے جس کے سپنے دیکھ کر انسان اپنی آنکھوں کی تاریکی کھو دیتا ہے۔ اگر اسے دل میں بسا لیا جائے تو کیا حال ہو۔ صرف محبت انسان کو بے پایاں بناتی ہے، ایک ایسی سلطنت جس کا کوئی کنارہ نہیں، اس کی وسعت کائنات جیسی ہوتی ہے۔'' خسرو یہ کہہ کر چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ''ارجمند۔! کیا تم بھی اس ایرانی رنڈی کی طرح خرم سے محبت کرتی ہو کہ وہ اس سلطنت کا ولی عہد بن جانے والا ہے۔'' اچانک خسرو نے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کہا تو ارجمند آہستہ سے ہنس دی۔

''آپ نے کچھ نیا نہیں سوچا شہزادہ معظم۔! سبھی ایسا ہی سوچتے ہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ آپ کچھ منفرد سوچتے ہوں

گے۔''

''ہاں ارجمند۔! لیکن پھر بھی۔؟''

''اگر وہ شہزادہ نہ بھی رہے تو میں اس سے محبت کرتی رہوں گی۔''

ارجمند نے کہا تو وہ کتنے لمحوں تک یونہی خاموش کھڑا رہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا

''چہرے جھوٹ بول سکتے ہیں مگر آواز جھوٹ نہیں بول سکتی۔ مجھے تم پر یقین ہے۔ کیا تمہارے اردگرد کوئی کھڑا ہے۔

''نہیں۔!''

''میرا محافظ۔!''

''وہ ہم سے بہت پیچھے پیچھے آ رہا ہے مگر اس کی نگاہ آپ پر ہی ہے۔''

''تو پھر میری بات غور سے سنو۔!'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لیے خاموش ہوا۔ ''تمہاری پھوپھی اور میرے احمق باپ کی بیوی، وہ ایرانی رنڈی۔! بے وقوف شہنشاہ کے کانوں میں ارجمند کے نام کی سرگوشی کرنے کی بجائے، اسے تیار کر رہی ہے کہ شہزادہ خرم کی شادی لاڈلی سے کر دی جائے۔ وہی لاڈلی۔! جو شیر افگن کی بیٹی ہے۔ تاکہ اس کا اقتدار ہندوستان پر اور زیادہ مضبوط ہو جائے۔ تم ارجمند۔! مجھے تم پر ترس آتا ہے۔''

خسرو کی بے نور آنکھوں میں اداسی اتری ہوئی تھی جو قندیل کی روشنی میں اور گہری ہو گئی تھی۔

......☆......

رات ابھی اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ صاف آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ ارجمند اپنے کمرے کی کھڑکی سے ان ستاروں کو دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ بھی کسی کی قسمت کے ستارے ہوں گے؟ کیا انسان کی تقدیر ان کے ساتھ بندھی ہوئی ہے جو خود ساکت ہیں اور کشش کے مرہون منت ہیں؟ یہ کشش انہیں جس جانب چاہے موڑ کر لے جائے؟ اسے اپنی قسمت بنانے کے لیے کچھ تو کرنا چاہیے۔ شہزادہ خرم اگر دو طاقتوں کا بوجھ اپنے کاندھے پر سہارے ہوئے ہے تو کیا وہ بھی کسی کی قیدی ہے؟ نہیں۔! مجھے کوشش کرنی چاہیے ورنہ شہنشاہ کے کانوں میں پڑنے والی نور جہاں کی سرگوشیاں اس سے خرم کو چھین لیں گی، وہ شہنشاہ جو پہلے ہی اس سے متنفر ہے۔ جو اسے صاف اس لیے قبول نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کی بہو کے پاس نہ مال و دولت ہے، نہ رتبہ نہ کوئی سیاسی اتحاد۔ اس کا باپ ویسے تو یمین الدولہ آصف خاں ہے اور اس کا دادا اعتماد الدولہ غیاث بیگ،

مملکت کے بڑے بڑے مسائل کو حل کرنا ہی ان کے فرائض میں شامل تھا۔لیکن ان کے ہی گھر میں ایک ٹوٹے ہوئے دل والی لڑکی پر ان کی نگاہ ہی نہیں پڑی تھی جو ہاں اور ناں کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ جسے اس کی ماں دیوان جی بیگم نے ضدی اور سرکش کا'' خطاب'' دے کر نظر انداز کر دیا تھا اور اس کے لیے بوجھ بنی ہوئی تھی۔ وہ شاید اپنے آپ کو تقدیر کے ہاتھوں میں سونپ کر انتظار کرتی لیکن اس کے خلاف سازش کی جا رہی تھی۔ وہ قسمت سے تو لڑ سکتی تھی کہ یہ معاملہ بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے لیکن سازشیں تو لوگ کرتے ہیں اور اس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ ان کا جواب دے سکے۔

اس وقت اس کے دادا غیاث بیگ اور باپ آصف خاں دیوان خاص میں بیٹھے ہوئے تھے۔ان کے درمیان امور مملکت کا کوئی پیچیدہ مسئلہ زیر بحث تھا۔دونوں کی گفتگو پیچ در پیچ مراحل سے گذر رہی تھی کہ ارجمند کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ دونوں گاؤ تکیہ لگائے آمنے سامنے مسندوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔دونوں کی ایک ساتھ نگاہ ارجمند پر پڑی تھی۔

'' آؤ ارجمند۔!'' آصف خاں نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ارجمند سر پر آنچل رکھے دھیرے دھیرے قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس آ کھڑی ہوئی تو آصف نے کہا'' آؤ۔! میرے پاس بیٹھو۔''

غیاث بیگ کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ وہ غور سے ارجمند کو دیکھ رہے تھے۔ وہ چند لمحوں تک انہیں دیکھتی رہی۔ایک طرف تجربہ تھا اور دوسری جانب طاقت۔تب اس نے پوری ہمت سے کہا۔

'' آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی گفتگو میں کیوں مخل ہوئی ہوں؟'' ارجمند نے اپنے باپ کی جانب دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا جس میں ادب حد درجہ موجود تھا۔

''نہیں تو۔!تم بتا دو۔'' آصف خاں نے لاڈ سے کہا

'' آپ نے میری منگنی شہزادہ خرم سے کی اور اس کا نام میرے نام کے ساتھ جڑ گیا۔اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اس سے۔شہنشاہ نے اس کی شادی گل بدن سے کر دی، مجھے کوئی افسوس نہیں ہے لیکن ....''

''لیکن کیا۔''غیاث بیگ نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا

''لیکن اگر ہمارے خاندان ہی کا کوئی فرد اس تعلق کو توڑنے کے درپے ہو جائے تو کیا اس میں ہمارے خاندان کا وقار ہے؟''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''میری شادی اگر خرم سے نہیں ہوتی تو یہ ایک الگ بات ہے لیکن اگر میری ہی پھوپھی اپنی بیٹی لاڈلی کی شادی خرم سے کرنا چاہے تو یہ ہمارے لیے............''

''تمہیں کس نے بتایا؟'' غیاث بیگ نے حیرت سے کہا

''شہزادہ خسرو نے۔'' ارجمند نے دھیرے سے کہا

''تیز۔! بہت تیز، اس کے کان بہت تیز ہیں آصف خان۔ دیکھو۔! وہ تمہاری نگرانی میں ہے اور اس کے ہرکارے کہاں کہاں کی خبریں لاکر اسے دے رہے ہیں۔ تمہاری نگرانی میں کوئی گڑبڑ ہے یا تم ہی اس اہل نہیں رہے ہو۔'' غیاث بیگ نے تیزی سے کہا۔

''یہ معاملہ ہم بعد میں طے کرلیں گے لیکن اس وقت ارجمند نے جو سوال کیا ہے اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔'' آصف خاں نے تحمل سے کہا تو غیاث بیگ نے ارجمند کی طرف دیکھا اور پیار سے کہا

''ایسا نہیں ہوگا۔''

''اور لاڈلی۔؟'' ارجمند نے پوچھا

''مجھے یقین ہے کہ اس کے لیے بہت ہی اچھا شوہر تلاش کرلیا جائے گا۔ اب یہ تمہارا مسئلہ نہیں رہا۔ ہم اسے دیکھیں گے۔'' غیاث بیگ نے حتمی طور پر کہا تو وہ اجازت پا کر وہاں سے اٹھ گئی۔ اس کے آنے کے بعد چند کنیزوں کی صورت میں وہ اپنے کان اور آنکھیں وہیں چھوڑ آئی۔ جو رات گئے تک جالی کی درزوں میں سے ان کی گفتگو سنتی رہیں۔ اگلے دن طلوع صبح کے ساتھ ہی اسے کامیابی کی نوید ملی۔ اگرچہ ارجمند کا مسئلہ سیاسی صورت اختیار کر گیا تھا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ اسے اپنا مقصد چاہیے تھا۔

......☆......

اعتمادالدولہ غیاث بیگ کی حویلی کا وہ شاندار باغ جو کسی زمانے میں اجڑا ہوا تھا پھر سے سرسبز و شاداب ہو چکا تھا۔ وہ شاہی باغ کی طرز پر تعمیر ہوا تھا اور اب اسی کی طرح بہار دکھا رہا تھا۔ اسی باغ میں وہ پنڈال بنایا جا رہا تھا جس کے لیے آصف خاں نے حکم دیا تھا کہ اس قدر خوبصورت ہو کہ دنیا دیکھے۔ کیونکہ وہ پنڈال کسی معمولی آدمی کے لیے نہیں بنایا جا رہا تھا۔ ان

کے ہاں شہزادہ خرم دولہا بن کر اترنے والا تھا۔اس کے ساتھ زبردست شنید یہی تھی کہ شہنشاہ ہند بھی آنے والا ہے۔اگرچہ آصف خان بھی دادودہش کا قائل تھا تاہم اس شادی میں اس قدر دھوم دھام دکھانا چاہتا تھا کہ شہنشاہ ہند کو یہ احساس ہو کہ اس نے اپنا بیٹا کسی معمولی شخص کے ہاں نہیں بیاہا۔طلوع صبح کے ساتھ اس پنڈال کی تیاری شروع ہوگئی تھی۔ایک جم غفیر تھا جو انتظامات میں لگا ہوا تھا۔اس باغ سے لے کر آگرہ شہر کی گلیوں تک میں اس کا احساس پھیلا ہوا تھا۔

ارجمند اپنے کمرے میں موجود تھی۔دوپہر کے بعد غلغلہ مچا کہ ملکہ نورجہاں آگئیں ہیں۔وہ سیدھی ارجمند کے پاس آ گئی۔اس کے چہرے پر کہیں سے بھی یہ ہویدا نہیں تھا کہ وہ ارجمند کے بارے میں کوئی سازش کر چکی ہے۔اس کے چہرے پر تو محبت اور خلوص کا نقاب تھا جہاں مسکراہٹ اور خوشی تھی۔

''دیکھو۔! یہ تمہارا عروسی جوڑا ہے۔اسے میں نے خود تیار کروا ہے۔'' نورجہاں نے کنیزوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے وہ عروسی جوڑا اس کے سامنے پھیلا دیا۔وہ شاندار سلک کا چوڑی دار پاجامہ، اس پر اسی سنہری رنگ کا گھاگھرا تھا، ایک بڑا سا آنچل، اگرچہ سلک بہت ہلکی پھلکی تھی لیکن سونے کی تاروں سے کی گئی کڑھائی سے وہ بہت بھاری ہو رہا تھا۔کڑھائی کا نمونہ کسی نے بھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔وہ منفرد اور جاذب نظر تھا۔

''اس عروسی جوڑے میں دیکھ کر تو مرد دیوانے ہو جائیں گے۔'' نورجہاں نے بڑے چاؤ سے کہا تو ارجمند تیزی سے نرم لہجے میں بولی

''شہزادہ خرم۔! صرف میرے لیے شہزادہ خرم۔''

نورجہاں نے محض ایک لمحہ کو ارجمند کی طرف دیکھا، پھر اپنی حیرت کو اپنے نقاب تلے دبا کر جلدی سے کہا

''اور ہاں۔! یہ زیور بھی۔'' اس نے ایک صندوقچے کو کھولا، جس میں زمردیں ہار، ماتھے کا ٹیکہ جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔سنہری اور سرخ یاقوت جڑے جھمکے ہار، سونے کی چوڑیاں، کنگن اور پازیب، جس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ان گنت گیندیں تھیں۔جسے چھوتے ہی وہ بج اٹھتی تھیں۔

ارجمند اس کی طرف دیکھتی رہی اور وہ تحائف کا ڈھیر اس کے سامنے لگاتی رہی۔وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی سبھی چیزیں اسے دے چکی تو تھوڑی دیر اس کے ساتھ بیٹھ رہی پھر اپنی ماں کے پاس دیوان عام میں چلے گئی مگر لاڈلی اس کے قریب بیٹھی رہی۔ارجمند نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں تنہائی، حسرت اور غم نا کی چھلک رہی تھی۔ارجمند نے سوچا کہ

اس کی ایسی کیفیات میں کسی کا بھی کوئی دوش نہیں ہے سوائے اس کی ماں کے۔ وہ ایک ایسا گھنا درخت ہے جس کے نیچے کوئی پودا پنپ نہیں سکتا۔ ارجمند کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کی لہر اٹھی جس کا اظہار اس کے چہرے سے عیاں ہو گیا۔ تبھی لاڈلی آگے بڑھی اور اس نے دھیرے سے ارجمند کا ہاتھ تھام لیا۔ چند لمحے اسی کیفیت میں گذر گئے تو اس نے کہا

''ارجمند۔! میں خوش ہوں کہ تم نے اپنی بہادری، صبر اور تحمل سے اپنا مقصد پا لیا۔ میں اگر تمہاری جگہ ہوتی تو ایسا نہیں کر سکتی تھی۔''

''ہاں لاڈلی۔! ایسا وہی کر سکتا ہے جسے محبت ہو۔ محبت کے بغیر منزل نہیں ملا کرتی۔''

''شاید میرے جیسی لڑکیاں محبت نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ مجھے تو اپنی ماں کا حکم ہر حال میں ماننا ہے۔ میں اگر اس کے حکم سے انحراف کروں گی تو اس کے پاس ایسے ہتھکنڈے ہیں کہ مجھے مجبور کر کے رکھ دے گی۔ تو کیوں نا میں اپنا آپ اس کی خواہشوں کے تابع کر دوں۔ میرا باپ نہیں رہا تو میں کس پر اپنا مان رکھوں۔ میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔'' اس نے غم سے بوجھل لہجے میں، خوف سے لپٹے ہوئے لفظ کہے تو ارجمند کو اس پر بہت ترس آیا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اس نے کیا کرنا ہے، اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ دردِ محبت کیا ہوتا ہے۔ ''ہم دونوں پھر سے پہلے کی طرح سہیلیاں بن جائیں، کیا ایسا ممکن ہے ارجمند؟۔''

''کیوں نہیں۔'' ارجمند نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ''تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''یہی تو مصیبت ہے کہ الزام کسی پر نہیں۔ حکمرانی کی سازشوں میں یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ محبت بھی کسی طاقتور جذبے کا نام ہے۔ یہ میری ماں کا منصوبہ ہی تھا کہ میں خرم سے بیاہ دی جاؤں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتی تھی، اس میں اس کا مقصد کیا تھا؟''

''اگر ممکن ہو جاتا تو وہ کسی طور پر بھی اپنے منصوبے سے دستبردار نہ ہوتی۔'' اس نے پرخیال لہجے میں کہا اور پھر تیزی سے بولی۔ ''خیر۔! تم پریشان مت ہونا لاڈلی، ہم پہلے کی طرح سہیلیاں ہیں۔''

''شاید۔! میں تم سے یہ تعلق بھی نبھا پاؤں گی یا نہیں۔ میری ماں میں جو حاکمیت کی فطرت ہے نا، ملکہ نور جہاں بن جانے سے وہ اور زیادہ پختہ کار ہو گئی ہے۔ وہ خواتین کی محفلوں میں بیٹھتی ہی نہیں اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو دوسری خواتین اسے پسند نہیں کرتی، اس کی باتیں ہی وہ نہیں رہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کوئی جنگجو ہو اور ہر وقت اسے دوسروں کو قابو کر لینے

کی فکر ہوتی ہے۔اور میں تو اس کی بیٹی ہوں،اس کے حکم کی تابع۔'' لاڈلی نے دور کہیں خلاؤں میں گھورتے ہوئے اپنا غم کہہ دیا۔

''کیا وہ مجھ سے خوش ہے؟'' ارجمند نے دھیرے سے پوچھا

''اُوہاں۔!لیکن ارجمند تمہیں اس سے کیا۔وہ خوش رہے یا ناخوش۔تم اپنی زندگی خوشگوار بناؤ۔اور دیکھنا ایک دن تم بھی ملکہ بن جاؤ گی۔''

''انشاءاللہ۔!'' ارجمند نے زیرلب کہا اور اونچی آواز میں بولی۔'' تب اس دن ملکہ نور جہاں کا رویہ میرے ساتھ کیا ہوگا یہ سوچا تم نے؟۔''

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب ابھی تک مستقبل کی تاریکیوں میں دفن تھا۔اس کا جواب لاڈلی کیا دے سکتی تھی لہٰذا خاموش رہی۔

۹ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ، بمطابق ۲۷ اپریل ۱۶۱۲ء جمعہ کی سہ پہر شہزدہ خرم کی بارات شاہی شان وشوکت سے غیاث بیگ کی حویلی کی جانب رواں دواں تھی۔شہنشاہ جہانگیر پورے تزک واحتشام سے بارات کے آگے تھا۔وہ اپنے پسندیدہ ہاتھی کے ہودج میں بیٹھا طلائی اور نقرئی سکے اس ہجوم پر نچھاور کررہا تھا جو ان کی بارات کے راستے میں کھڑے تھے۔مرصع ہاتھی پر وہ پورے وقار سے جلوہ افروز تھا۔اس کے پیچھے شہزادہ خرم بھی ہاتھی پر سوار تھا۔اس نے قرمزی رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا جو سونے کی تاروں سے کڑھا تھا اور اس پر ہیرے، جواہرات اور موتیوں کو خوبصورت انداز میں جڑا ہوا تھا۔ نیلے رنگ کی دستار میں ہیرے جواہرات کی لڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ایک بڑے سے سرخ یاقوت کے ساتھ سفید پر ہوا میں لہرا رہا تھا۔ گلے میں زمردیں ست لڑی ہار، طلائی کمر بند اور بازو بند سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔وہ اپنے آگے چلتے ہوئے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا جو پورے جوش وجذبے کے ساتھ ہجوم پر طلائی ونقرئی سکے نچھاور کررہا تھا۔ایک وقت تھا کہ وہی اسے ارجمند کو بھول جانے کا کہتا تھا اور اب جبکہ بارات روانہ ہونے والی تھی تو خود آگے بڑھ کر موتیوں سے مرصع سہرا خرم کے باندھا اور بارات کے ساتھ شامل ہوکر چل رہا تھا۔یہ شہزادہ خرم ہی جانتا تھا کہ وہ کس قدر سیاسی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اس کی بارات لے کر چلا تھا۔شہنشاہ نے اس شادی پر دل کھول کر خرچ کیا تھا۔اس دن چشم فلک نے آگرہ کی گلیوں میں بہتے ہوئے انسانوں کا ہجوم دیکھا جو خرم کی بارات کے ساتھ تھا۔بارات پنڈال تک پہنچی تو شاہی نقارہ، ناقوس اور موسیقی بند ہو

گئی۔ ہر طرف سکون چھا گیا۔شہزادہ اپنے عزیز رشتہ داروں کے ساتھ غیاث بیگ کی حویلی کے دیوان عام میں جا پہنچا جہاں اس کے اور شہزادہ خرم کے لیے خصوصی مسندیں بنائیں گئیں تھیں۔ان کے بیٹھتے ہی تواضع شروع ہوگئی تمام عزیزوں اور رشتہ داروں کے درمیان شہزادہ خرم جلوہ افروز تھا۔جلد ہی نکاح کا اہتمام ہوااور ارجمند بانو بیگم کو اس کے پہلو میں لا بٹھایا گیا۔

ارجمند بانو بیگم کی زندگی میں آنے والی تاریک رات میں سورج طلوع ہو گیا رسمیں شروع ہو گئیں۔جن میں ہندوانہ رسمیں بھی تھیں، ترکانہ بھی اور کسی قدر ایرانی۔

رات گئے بارات واپس ہوئی۔ارجمند بانو کی پالکی شہزادہ خرم کے محل میں اتری۔اسے یہ سارا منظر خواب ناک لگ رہا تھا۔ وہ محبت میں مستقل مزاج رہی تھی اور اس میں انتظار کی لچک حد درجہ تھی۔ پھر اس نے اپنی محبت کو پا لیا۔ وہ رات خوشبوؤں میں بھیگی ہوئی رات تھی۔ اسی رات اس کی امیدوں کے پھول کھلے تھے۔خواہشوں اور ریاضتوں کے رنگ اور گہرے ہو گئے تھے۔ وہ حجلہ عروسی میں پہنچا دی گئی۔اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس رات کے بعد اگلی صبح تک سارے غم دور ہو چکے ہوں گے۔ وہ پرسکون ہو گی۔ وہ اپنے حسن سے زیادہ اپنی محبت پر نازاں تھی۔اسے پورا اعتماد تھا کہ شہزادہ خرم بھی اپنے دل میں اس کے لیے محبت کا دریا رکھتا ہو گا۔

اگلی صبح جب وہ بیدار ہوئی تو وہ مسرور تھی۔شہزادہ خرم نے اپنی چاہتوں اور شدتوں کا اظہار بڑے خوبصورت انداز میں کیا تھا۔محل کی بزرگ خواتین اس کے حجلہ عروسی میں آئیں اور مطمئن و مسرور ہو کر واپس چلی گئیں۔

......☆......

شہزادہ خرم اور ارجمند بانو کی شادی میں دل کھول کر دولت لٹائی گئی تھی۔اگر جہانگیر نے شہنشاہ ہند ہونے کی حیثیت سے شاہی وقار اور بیٹے کی محبت میں فیاضی کے دریا بہائے تھے تو ادھر آصف خاں بھی شان و شوکت کے اظہار کا دلدادہ تھا۔ سارے شہر میں چہل پہل کے علاوہ دھوم دھام ہوئی۔ارجمند بانو کا مہر پانچ لاکھ باندھا گیا۔طرفین نے ایک دوسرے کی عزت افزائی کے لیے پوری کوشش کی۔مگر شاید شہنشاہ ہند کا دل سیر نہیں ہوا تھا۔اس نے از سر نو جشن منانے کا حکم دے دیا۔ جہانگیر اپنی تمام تر بیگمات اور حرم سرا کی خواتین کے ساتھ شہزادہ خرم کے محل میں چلا گیا۔

......☆......

وہ ایک بھیگی ہوئی شام تھی۔خرم کا محل چراغوں کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔دیوان عام میں رسوم کی ادائیگی اور جشن کی

شروعات کا اہتمام ہو چکا تھا۔خرم اور ارجمند پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے گرد جہانگیر سمیت حرم سرا کی خواتین اور بیگمات موجود تھیں۔ملکہ نور جہاں اپنے رشتے داروں کے ساتھ دیوان جی بیگم کے ساتھ بیٹھی ہوئیں تھیں۔رنگ ونور کا ایک سیلاب تھا جو اس وقت بہہ رہا تھا۔تبھی جہانگیر نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو ہر جانب خاموشی ہو گئی۔اتنی خاموشی کہ دریائے جمنا کی طرف سے آنے والی ہوا کی سرسراہٹ با آسانی سنی جا سکتی تھی۔ہر کوئی بادشاہ کی طرف متوجہ تھا۔

''میں اپنی بہو کی آداب دانی، مزاج شناسی اور خدمت گذاری سے بہت خوش ہوں۔اور توقع کرتا ہوں کہ وہ اپنی انفرادیت یونہی بحال رکھے گی۔شاہی وقار کے ساتھ خاندان مغلیہ کی وفادار رہے گی۔میں اسے ممتاز محل کے لقب سے موسوم کرتا ہوں۔''

ممتاز محل۔!

لقب ملتے ہی عزیز رشتے داروں میں خوشی کی لہر اٹھی اور اس کے ساتھ ہی جشن کی شروعات ہو گئیں۔نغمہ وسرور، عیش وعشرت اور ایک دوسرے کی عزت افزائی۔بادشاہ اس جشن میں ایک رات اور ایک دن شامل رہا۔یہ شہزادہ خرم کی انتہائی عزت افزائی تھی۔کیونکہ شہنشاہ کو نہ صرف اس سے محبت تھی بلکہ وہی اس کا ہونے والا ولی عہد بھی تھا۔

مغلیہ سلطنت پر حسن قابض ہو گیا تھا۔

اس وقت ساری مملکت کا دل شہنشاہ جہانگیر ہی تھا، جس کا دل ملکہ نور جہاں کے لیے ہمکتا تھا۔وہ مہر النساء تھی لیکن بادشاہ وقت کی منظور نظر محبوبہ تھی۔اس کا حسن بادشاہ کے حواسوں پر چھا گیا تو نور محل کا لقب پا کر ملکہ نور جہاں بن گئی تھی۔

دوسرا شہزادہ خرم تھا جس کے ولی عہد سلطنت بننے کے لیے محض اعلان کا انتظار تھا۔ورنہ اس کا عہدہ، رتبہ اور بادشاہ کا منظور نظر ہونا ہی اس کے حق میں فیصلہ دے چکا تھا۔وہ خود بھی اس رتبہ کے لیے اہل تھا۔عمائدین سلطنت سے لے کر عام امراء کی نگاہ اس پر تھی اور اس کی نگاہ میں ارجمند بانو سما چکی تھی۔ارجمند کے حسن نے اسے گرویدہ کر دیا تھا۔وہ محبت جس کی اسے طلب تھی، ارجمند بانو کی صورت میں اسے میسر آ گئی تھی۔وہ ایک عام سی لڑکی ارجمند بانو، ممتاز محل کے لقب سے شاہی

محل میں جلوہ گر تھی اور شہزادی ممتاز الزمانی کہلاتی تھی۔

دونوں ہی حسین و جمیل تھیں اور ان کا حسن بے مثال سمجھا جاتا تھا۔

دونوں ہی ایرانی تھیں۔

دونوں پر ان کے شوہر عاشق ہوئے تھے۔

اور وہ دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جو اعتماد الدولہ غیاث بیگ کا خاندان تھا اور جس کے افراد غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔

ایک ہی جیسی مماثلت رکھنے کے باوجود ملکہ نور جہاں اور ارجمند بانو میں بہت زیادہ فرق تھا۔

ملکہ نور جہاں میں فطرتی طور پر حاکمیت پسندی تھی اور جہانگیر اس کی فراست اور حسن سے اس قدر گرویدہ ہو گیا تھا کہ اس نے اپنا سب کچھ اسے سونپ دیا تھا۔ جس کا نور جہاں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ دھیرے دھیرے امور سلطنت میں دخیل ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ بعض فرمان اس کے حسب منشاء جاری ہوئے تو اسے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ یہ حاکمیت پسندی کی تسکین تھی اور اقتدار پسند مزاج کے لیے اطمینان۔ وہ اقتدار پر مکمل اختیار چاہتی تھی جس کے لیے اس نے بساطِ سیاست مہرے ایستادہ کر دیئے تھے۔ شہزادہ خرم سے اسے شکست ہو چکی تھی۔ اس نے بہت سوچ کر لاڈلی بیگم کی شادی اس سے کرنا چاہی تھی۔ لیکن وہ سازش کا حصار کاٹ کر ارجمند بانو کا ہاتھ تھام چکا تھا۔ بساط سیاست پر یہ بہت اہم چال تھی جو خرم کی محبت نے ناکام بنا دی۔ نور جہاں جو اقتدار کی خواہاں تھی، جہانگیر کے پردے میں خود حکمران بن چکی تھی۔ اس کے لیے یہ شکست ایک زخم کی مانند تھی جس کی ٹیس اس کے من میں ہنوز تھی۔ اس نے خرم کی بجائے اپنے اس داماد کے تخت تک پہنچنے کی راہیں ہموار کرنا شروع کر دیں جس کا ابھی وجود ہی نہیں تھا۔

شہزادی ممتاز محل۔! ایک طویل انتظار کے بعد جس نے اپنی محبت کو پایا تھا۔ وہ اقتدار کی ہوس نہیں رکھتی تھی۔ محل میں آنے کے بعد اس نے سیاسی یا امور سلطنت میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ اپنے شوہر کو برسر اقتدار دیکھنا چاہتی تھی۔ جس طرح ہر بیوی اپنے شوہر کے بارے میں ہونے والی باتوں سے باخبر رہتی ہے۔ ممتاز محل بھی محلاتی سازشوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ ممتاز محل محض حسن میں یکتا نہیں تھی بلکہ اس میں بلا کی نسوانی خودداری، عزت نفس، دقیقہ رسی، معاملہ فہمی، دور اندیشی، مدبر اور صائب الرائے خاتون ہونے کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اگرچہ وہ فطری طور پر قناعت پسند تھی لیکن شاہی مزاج کو

خوب سمجھتی تھی۔ ایک طرف اگر عمدہ کردار یا ادب شناسی، اعلیٰ ظرفی، خدمت گزاری اور داد و دہش کے باعث محل کے طبقہ نسواں میں ممتاز مقام حاصل کر چکی تھی تو دوسری جانب وہ اپنی دانشوری امور سلطنت کی معاملہ فہمی، سیاسی اتار چڑھاؤ میں دور اندیشی اور محلاتی سازشوں کی سمجھ بوجھ سے شہزادہ خرم کے دل پر ہی نہیں دماغ پر بھی چھا گئی تھی۔ اسے یہ پوری طرح احساس تھا کہ شہزادہ خرم کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو وہ ملکہ نور جہاں ہوگی۔ کیونکہ وہ اسے بچپن ہی سے دیکھتی چلی آ رہی تھی اور پورے محل میں وہی اس کی مزاج آشنا تھی۔

اس وقت سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ شہزادی ممتاز محل اپنے کمرہ خاص میں بیٹھی جھروکے میں سے دریائے جمنا کا نظارہ کر رہی تھی۔ جو سورج کی کرنوں کے باعث یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس میں سونا بہہ رہا ہو۔ انہی لمحات میں خانگی امور کی نگران ستّی النساء بیگم چہل قدمی کے انداز سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ ادب سے تعظیم کے لیے جھکی اور بولی۔

''حضور۔! ان حالات میں آپ کا زیادہ دیر تک بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔''

ممتاز محل جو نجانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی خیالوں کے بھنور سے نکلی، جیسے ہی اس نے ستی النساء کی بات کا مفہوم سمجھا تو دھیرے سے مسکرا دی۔ اس کے چہرے پر ممتا کا الوہی جذبہ روشن تھا۔ اس نے خوشگوار نگاہوں سے ستی النساء کی طرف دیکھا۔ تبھی وہ آگے بڑھی اور ممتاز محل کو مسند پر لٹا دیا۔

''کیا ہر عورت جو ماں بنتی ہے، اسے اتنا ہی سکھ نصیب ہوتا ہوگا؟'' ممتاز محل نے دھیرے سے کہا۔

''یہ تو نصیب کی بات ہے کہ کسے دکھ ملتا ہے اور کسے سکھ، لیکن جو ماں کا رتبہ ہوتا ہے جو سبھی کو ایک جیسا ہی ملتا ہے، وہ ماں چاہے شاہی محل میں رہتی ہو یا کسی غریب کی کٹیا میں، پروردگار کا یہی تو انصاف ہے۔'' ستی النساء نے ادب سے کہا۔

''ماں۔! کتنی مٹھاس ہے اس لفظ میں۔''

''یہی تو ایک رشتہ ہے شہزادی معظم۔! جو بناء لالچ کے اپنی اولاد سے پیار کرتا ہے، اس کے لیے دکھ جھیلتا ہے۔''

''زندگی، تخلیق اور عورت۔! کس قدر مماثلت ہے ان سب لفظوں میں۔''

''ہاں۔! انہیں کوئی سمجھے تو، ورنہ ہمارے سامنے آئے دن ایسے منظر بھی آتے ہیں کہ عورت اپنے آپ کو اس اعلیٰ رتبے سے گرا لیتی ہے۔ بظاہر وہ اعلیٰ خاندان، اعلیٰ رتبہ اور اعلیٰ حیثیت میں ہوتی ہیں۔''

''تو اصل کیا ہے ستی النساء۔؟''

''انسانیت۔! کچھ بھی کرنے سے پہلے ایک لمحہ کو رک کر یہ سوچ لیں کہ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں؟'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکی اور پھر جھجکتے ہوئے بولی''اگر آپ اسے گستاخی نہ سمجھیں تو عرض کروں۔''

''بولو ستی النساء۔!'' ممتاز محل نے قدرے حیرت سے کہا

'' آپ اور ملکہ نور جہاں ایک ہی خاندان سے ہیں اور مجھے اس محل میں خدمات سرانجام دیتے ہوئے عرصہ بیت گیا ہے۔میں نے آپ میں اور ملکہ میں بہت فرق دیکھا ہے۔''

''کیسا فرق ہے۔!''

''یہی کہ آپ اس وقت، اعلیٰ جذبوں کی بات کر رہی ہیں، زندگی، تخلیق اور عورت پر سوچ رہی ہیں، لیکن ان لمحات میں ملکہ نور جہاں اقتدار اور امور مملکت کی سنگلاخ گفتگو میں مصروف ہیں۔''

''میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہو مگر ہمیں اس سے غرض نہیں ہمیں اپنی زندگی جینا ہے۔''

''مگر شہزادی معظم۔! سرگوشیاں ابھی غیر واضح ہیں لیکن جیسے ہی یہ دھواں چھٹے گا تو کوئی خاص واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کا تعلق براہ راست آپ کی ذات سے ہو۔''

''میں محسوس تو کر رہی ہوں لیکن کیا ہونے والا ہے، اس کی مجھے خبر نہیں۔ اتنا یقین ضرور ہے ستی النساء کہ اس وقت اگر کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہوتا ہے اور اس کا منبع یہی محل سرا ہوا تو اس کے پیچھے ملکہ نور جہاں ہوگی۔ ہوسکتا ہے وہ اس وقت شہنشاہ ہند کے پاس اس سازش کے تار بن رہی ہو۔''

ممتاز محل نے کسی قدر خوشگوار انداز میں کہا اور مسکرا دی، اس کی مسکراہٹ میں اعتماد تھا۔

......☆......

شہنشاہ ہند اپنی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کمرے میں سہ پہر کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں جانب ملکہ نور جہاں مرصع نشست پر براجمان تھی۔ شہنشاہ کی دستار طلائی میز پر پڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی طلائی صراحی اور جام پڑا ہوا تھا۔ دونوں میں خاموشی کافی طویل ہو چکی تھی۔ تبھی جہانگیر نے اشارہ کیا تو نور جہاں نے اپنا ہاتھ صراحی کی طرف بڑھا دیا۔ جام بھرتے ہوئے وہ بولی

''شہنشاہ ذی وقار۔! آپ بہت پی چکے ہیں۔ اطباء نے کہا ہے کہ ایک حد سے..........''

''جب میں نے کہا ہے تو اطباء کا کہنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔''

''جی ہاں جہاں پناہ۔! مگر میں چاہتی ہوں کہ آپ کی رفاقت میں بہت طویل عرصہ گزاروں، کیا آپ میری خواہش پوری نہیں کریں گے۔''

''تو چلو۔ یہ جام۔! آپ کی رفاقت کے نام۔'' جہانگیر نے جام پکڑتے ہوئے کہا اور مسکرا کر اس سے چند گھونٹ لے لیے۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''نور محل۔! میں خسرو کی شادی کر دینا چاہتا ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، آخر وہ آپ کا بیٹا ہے، اگر اس نے کچھ غلطیاں کی ہیں تو وہ اس کی سزا پا چکا ہے۔ تاریخ میں جہانگیر اگر انصاف پسند بادشاہ کے طور پر پہچانا جائے گا، تو دوسری طرف وہ ایک شفیق باپ کے طور پر بھی جانا جائے گا۔ لیکن وہ آنکھوں سے..................''

''ہاں۔! مہابت خاں نے اس وقت دور اندیشی یہ کی تھی کہ اسے یوں اندھا کیا تھا کہ اس کی آنکھیں قابل علاج ہوں۔ میں نے اسی کے ذمے یہ فرض سونپا ہے وہ سلطنت کے عظیم اطباء کو اکٹھا کرے اور خسرو کی آنکھوں کا علاج کرے۔''

''مجھے یقین ہے کہ اس کی بینائی واپس آ جائے گی۔''

''ہاں۔! اس نے یہ یقین تو دلایا ہے۔''

جہانگیر نے کہا اور جام سے چند گھونٹ اور لے کر سوچوں میں گم ہو گیا۔ جبکہ نور جہاں اپنی جگہ سوچوں میں گم ہو گئی۔ اسے ایک نئی اُمید دکھائی دی تھی جس کے لیے اس کے ذہن میں منصوبہ بندی اترنے لگی۔

......☆......

۲۸ صفر ۱۰۲۲ھ۔ (۱۶۱۳ء)

رات کا آخری پہر ختم ہونے میں ابھی وقت تھا۔ شفاف آسمان پر ستارے بتا رہے تھے کہ طلوع صبح میں ابھی کافی وقت ہے تاہم ایسے وقت میں ممتاز محل کی خواب گاہ روشن تھی اور ستی النساء کے ساتھ کافی ساری کنیزیں موجود تھی۔ ممتاز محل ان نازک لمحوں میں درد کی اذیت سے گذر رہی تھی جب کوئی ماں تخلیق کے آخری مرحلے پر ہوتی ہے۔ لمحہ بہ لمحہ گذرتی رات کے ساتھ ممتاز محل بھی کرب میں بہتی چلی جا رہی تھی۔ انتظار تھا کہ جس میں لمحے بھی گھڑیوں جیسے ہو جاتے ہیں۔ آخر یہ طویل صبر

آزما انتظار ختم ہوا اور ممتاز محل کی خواب گاہ میں ننھی سی چیخ بلند ہوئی۔اس کے ساتھ ہی مبارک سلامت کی صدائیں ابھریں۔ شہزادہ خرم دیوان خاص میں بیٹھا اسی خبر کا منتظر تھا۔ستی النساء نمودار ہوئی اور ادب سے جھکی۔

''شہزادہ معظم۔! مبارک ہو، خدا نے آپ کو بیٹی سے نوازا ہے۔''

یہ سنتے ہی شہزادے کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ آ گئی۔ پھر دھیرے سے پوچھا

''شہزادی ممتاز محل کیسی ہیں؟''

''دونوں ہی ٹھیک ہیں۔آپ اگر چاہیں تو انہیں دیکھ سکتے ہیں۔'' ستی النساء نے کہا

''تم چلو، میں آتا ہوں۔'' شہزادے نے کہا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

اگلی شام شہزادہ خرم کا محل جشن کے لیے سجا دیا گیا تھا۔محل میں چہل پہل تھی۔اس شام شہنشاہ ہند بذات خود اس محل میں آنے والے تھے اور ان کے ہمراہ حرام سرا کی چنیدہ بیگمات، جن میں ملکہ نور جہاں بھی شامل تھی۔ سر شام شہنشاہ ہند آ گئے۔ان کے ساتھ شاہی بیگمات تھیں رسم کے مطابق نومولود کو بادشاہ کی گود میں دے دیا گیا۔ جہانگیر نے چند لمحے اس کی طرف غور سے دیکھا، سبھی منتظر تھے کہ شہنشاہ اس بچی کو کیا نام دیتے ہیں۔تبھی اس نے سر اٹھایا اور بولا

''ہم اس خوش رو پوتی کو حور النساء بیگم کا نام دیتے ہیں۔'' اس کے کہنے پر ایک سرگوشی اٹھی، سبھی نے بچی کے چہرے اور نام میں مماثلت محسوس کی اور اپنی زبانوں سے بھی ادا کیا'' اور............اس حور النساء بیگم کو ہم اپنی فرزندی میں لیتے ہیں۔''

جہانگیر کے اس حکم کے ساتھ ہی دستور شاہی کے مطابق بچی کو لے لیا گیا۔شہزادہ خرم نے بادشاہ کی خدمت میں تحائف پیش کیے۔ پھر وہ رات جشن طرب میں گذرتی چلے گئی۔

......☆......

اطباء کی سر توڑ کوششوں سے خسرو کی بینائی واپس آ گئی۔ یوں اس کی تاریک زندگی میں روشنی آ گئی۔ وہ دیکھ سکتا تھا مگر ایک آنکھ سے، دوسری آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ اب دیکھ سکتا تھا۔اس کے چاہنے والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جہانگیر کے لیے یہ خبر بہت اہم تھی۔شاید وہ اپنے بیٹے کو اندھا کر دینے کی سزا دے کر پچھتا رہا تھا۔ایک باپ کی حیثیت سے وہ بے چین تھا۔اس نے موہوم امید کے سہارے کوشش کی جو بار آور ثابت ہوئی۔ حرا سرا کی بیگمات میں یہ خبر انتہائی

مسرت کے ساتھ سنی گئی۔ان کے من میں جو خواہش حسرت بن کر دفن ہونے کو تھی اس میں نئے سرے سے زندگی آ گئی۔وہ خواہش تھی خسرو کی شادی کر دینے کی۔وہ کیسا تھا، معتوب تھا، قیدی تھا یا بینائی سے محروم تھا لیکن اس کی حیثیت بہرحال ایک شہزادے کی تھی۔اس کے لیے رشتہ حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔وہ اندھا بھی ہوتا تو اس کی شادی کی جا سکتی تھی مگر وہ جہانگیر سے سزا یافتہ تھا۔لیکن اب جبکہ جہانگیر ہی نے کوشش کی تو بیگمات کی خواہشات نے انگڑیاں لینا شروع کر دیں۔ہوسکتا تھا ان دنوں ملکہ نور جہاں بیگم اپنی بیٹی کا نام دے دیتی مگر حرم سرا میں اس کی وہ اہمیت نہیں تھی جو جہانگیر کے ہاں تھی۔بادشاہ نے بھی یہ معاملہ حرم کی بیگمات کے سپرد کر دیا تھا۔وہ خاموش تھا اور اس کی مرضی کے مطابق سب معاملہ چل رہا تھا۔

اور پھر خسرو کی شادی ہو گئی۔

وہ اپنی بیگم کے ساتھ راجپوت سردار انی رائے کی نگرانی میں قید رہا۔وہ خوش قسمت تھا کہ اسے بیوی وفادار ملی تھی۔

......☆......

''تم میرے ساتھ نہیں جا سکتی۔''

شہزادہ خرم نے محبت بھرے لہجے میں دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو ممتاز محل نے اپنی شرمگیں نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا ان آنکھوں میں حیرت تھی یوں جیسے اس نے انہونی بات کہہ دی ہو۔پھر جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں عزم گھلا ہوا تھا۔

''میں جاؤں گی۔اور مجھے جانا ہی ہوگا۔کیونکہ میرے محبوب............ہمارے درمیان یہ طے ہے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔یہ آپ نے وعدہ کیا تھا۔اب آپ وعدہ خلافی کیسے کر سکتے ہیں؟'' ممتاز محل نے کہا تو ماحول میں اداسی تیرنے لگی۔

رات کا پہلا پہر بیت گیا تھا۔اجمیر کی فضاؤں میں وہ شاہی قیام گاہ میں موجود باغ کے ایک جھولے پر بیٹھے ہوئے تھے۔چاندنی نے ہر شے کو پراسرار بنا دیا ہوا تھا اور اس کی نیلگوں روشنی میں وہ دونوں سائے کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ان دونوں میں وہی رومانوی سحر انگیزی موجود تھی جس نے پہلے دن سے انہیں خمار آلود کیا ہوا تھا۔ایسے ہی لمحات میں ممتاز محل کے دل سے یہی دعا نکلا کرتی تھی کہ اسے کچھ نہیں چاہیے سوائے خرم کی ایسی محبت سے جو اسے سرشار کر کے رکھ دیا کرتی تھی۔

''آپ میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ کیوں توڑ رہے ہیں؟'' ممتاز محل نے خمار آلود لہجے میں خرم کے چہرے پر دیکھتے

ہوئے کہا

''میں نے اپنا وعدہ نہیں توڑا۔تم آگرہ سے یہاں اجمیر تک میرے ساتھ آگئی ہو۔لیکن میں اب نہیں سمجھتا کہ تم مزید سفر کر پاؤ گی۔''

''کیوں۔!میں کیوں نہیں سفر کر پاؤں گی؟''اس نے حیرت سے پوچھا

''اپنی طرف دیکھو۔!''خرم نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔جس پر ممتاز محل شرما گئی۔''تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ تم ایک لمبی اور دشوار ترین مہم پر میرے ساتھ جا سکو۔میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''

''یہ ہم دونوں کے درمیان حائل نہیں ہوگا۔یہ کوئی اجنبی نہیں ہمارے پیار کی نشانی ہے۔یہ بھی تو ہمارے ساتھ ہو گا۔''

''دیکھو!تمہیں شاید جنگی مہمات کے سفر کا اندازہ نہیں،ایک عام سفر میں اور............''

''مجھے معلوم ہے کہ ہمیں شاید ایک دن بھی آرام کرنے کو نہ ملے گا،مگر میں آپ کے ساتھ رہوں گی اور میں نے آپ ہی کے ساتھ جانا ہے۔مجھے یہ بالکل پروا نہیں کہ یہ مہم دشوار ترین ہے۔''

دیکو ممتاز محل......ہمارے یہ پیار کی نشانی،اس سفر میں............''

''کچھ نہیں ہوگا۔''ممتاز محل نے خرم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اپنا سر اس کے کاندھے پر ٹکا دیا۔''ہم اس جنگ میں ہی اکٹھے نہیں رہیں گے بلکہ زندگی کے ہر سفر میں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گے،اب میں دوبارہ انتظار جیسی اذیت برداشت نہیں کر پاؤں گی۔''

''وہ وقت اور تھا ارجمند۔!تمہاری ایک بیٹی ہے تم میری بیوی ہو۔تم ایک خاندان رکھتی ہو۔تمہاری ایک حیثیت ہے،ایک رتبہ ہے۔تم فوج کے ساتھ سفر کرو گی......''

''میرے محبوب۔!انتظار تو انتظار ہی ہوتا ہے نا۔میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔میں مانتی ہوں کہ میں حورالنساء کی ماں ہوں اور اسے شہنشاہ نے اپنی فرزندی میں لے لیا۔میں اس کی طرف سے مطمئن ہوں۔میرا خاندان،تمام رشتے،تمام تعلق اب آپ ہیں،اس لیے میں ان کے درمیان نہیں رہنا چاہوں گی۔اور میرا رتبہ جو بھی ہے آپ ہی کی وجہ سے ہے۔میرا سب سے بڑا اعزاز ہی یہی ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔میں نہیں چاہتی کہ آپ میدان کارزار کی مصیبتیں جھیلیں اور میں

محل کی آسائشوں میں رہوں۔ایسا نہیں ہوسکتا۔بس مجھے آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے،سفر ہو یا حضر۔!''

''تم بے وقوف ہو۔!'' شہزادہ خرم قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔اس کے قہقہے میں حیرت اور محبت کا فخر گھلا ہوا تھا پھر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ خار آلود تھا۔''میری جان۔!تم نہیں جانتی کہ یہ مہم کس قدر خطرناک ہے اور اس میں کتنی مشکلات درپیش ہوں گی۔ یہ وحشیانہ جنگ ہوگی۔ ہماری لڑائی میواڑ کے راجپوتوں سے ہے اور ہمارا وہ دشمن کمزور نہیں ہے۔اکبر اعظم بھی انہیں شکست نہیں دے پایا تھا۔ ہوسکتا ہے مجھے بھی اس مہم میں کامیابی نہ ملے۔'' یہ کہتے ہوئے خرم کی آنکھوں میں اندیشے لہرائے۔

پورے چاند کی چاندنی نے ہر شے کو نقرئی بنا دیا تھا۔ممتاز محل نے اپنے شوہر کو اندیشوں میں مبتلا دیکھا تو تڑپ گئی۔ اس نے خرم کا ہاتھ مزید مضبوطی سے پکڑتے ہوئے انتہائی اعتماد سے کہا

''میرا دل یہ کہتا ہے کہ آپ اس مہم میں ضرور کامیاب ہوں گے۔آپ شہزادہ خرم ہیں اور آپ ہی میواڑ کے ان راجپوتوں کو شکست دے سکتے ہیں۔''

اس کے یوں کہنے پر خرم دھیرے سے مسکرا دیا لیکن اندیشے ہنوز اس کی آنکھوں میں لہراتے رہتے تھے۔وہ کبھی ایسی بے یقینی والی کیفیت میں دکھائی نہیں دیا تھا۔

''کیا آپ نے یہ سوچا کہ آپ ہی کو مغلیہ فوج کی سربراہی کیوں سونپی گئی ہے؟''

''اس لیے میری جان کہ میں ہی ولی عہد سلطنت کا اہل ہوں، بہت جلد اس رتبہ پر فائز ہو جاؤں گا۔اور پھر شہنشاہ کی بھی یہی خواہش ہے کہ میں ایسی جنگی مہمات پر جاؤں۔''

''میرے نزدیک اس کی دو وجوہات ہیں، ایک تو یہ کہ آپ ایسی مشکل اور دشوار ترین مہمات کو سر کرنے کی صلاحیتیں رکھتے ہیں، اسی لیے آپ کا انتخاب کیا گیا۔سلطان پرویز، مہابت خان، عبداللہ خان، فیروز جنگ اور راجہ باسو۔! یہ سب عظیم لشکر رکھنے کے باوجود اس مہم کو سر نہیں کر سکے۔ایسے وقت میں اگر آپ کا انتخاب کیا گیا ہے تو یہ فیصلہ محض یونہی نہیں کر دیا گیا۔''

''اور دوسری وجہ۔!''

''مہرالنساء۔؟ یعنی ملکہ نور جہاں، میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔حرم سرا میں پھیلی افواہوں اور سرگوشیوں

میں بہت کچھ پوشیدہ ہوتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ دکھائی نہ دے سکیں۔ وہ شہنشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کی بھی یہی خواہش ہے کہ آپ اس مہم پر جائیں۔‘‘

’’اس کی یہ خواہش کیوں؟‘‘

’’ہماری شادی، اس کی بہت بڑی شکست ہے۔ مگر وہ طویل جنگ لڑنے کی عادی ہے۔ وہ اس وقت تک سامنے نہیں آتی جب تک اسے اپنی فتح کا پورا یقین نہ ہو جائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ مسلسل لڑ رہی ہے اور ہمارے اردگرد جو اس نے طاقتیں لگا دی ہیں میں ان سے بھی واقف ہوں۔ اس نے آپ کو مغل فوج کا سربراہ بنانے کی خواہش کا اظہار اس لیے کیا ہے کہ وہ آپ کو دربار سے دور رکھ سکے۔ آپ کو دیکھ سکے کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔ آپ کو مہابت خاں پر فوقیت دلا سکے۔ اکبر اعظم اگر میواڑ والوں کو شکست نہ دے سکے تو یہ پرانی بات ہے۔ اب کیا ہے یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ جنگ صلاحیتوں سے اور اعتماد سے لڑی جاتی ہے۔‘‘

’’وہ جتنی بھی طاقتور ہو جائے میرا راستہ نہیں کاٹ سکتی۔‘‘

آپ کا نہیں، ہمارا۔! اگر ہم شکست کھا گئے تو نور جہاں کی طاقت بہت بڑھ جائے گی۔ اگر آپ جیت گئے تو اس میں نور جہاں کو اپنی منصوبہ بندی کرنے میں بہت زیادہ آسانی ہو گی۔ وہ بساط سیاست پر مہرے چلانے کی ماہر ہے۔ وہ صرف آپ کے متعلق سب سے زیادہ محتاط ہو کر سوچتی ہے۔ کیونکہ پوری سلطنت میں ایک آپ ہی تو ہو جس سے نہ صرف وہ شکست کھا چکی ہے بلکہ آپ ہی اس کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔‘‘

’’تم ٹھیک سوچ رہی ہو ممتاز محل۔!‘‘ خرم نے خیال آگہیں لہجے میں کہا اور پھر چند لمحوں بعد مسکراتے ہوئے بولا ’’مگر اتنا سب کچھ تم کیسے سوچ لیتی ہو؟‘‘

’’میں شہزادہ خرم کی بیوی ہوں، صرف مجھے ہی آپ کے تحفظات کی پرواہ ہونی چاہیے۔ وہ شہزادہ جسے ولی عہد بننا ہے۔ جسے فقط دل ہی سے نہیں، دماغ سے بھی سوچنا ہے۔ امور سلطنت سے لے کر رموز جنگ تک جس کے ہم رکاب ہیں، اپنے اور بیگانے دشمنوں کی کثیر تعداد ہے، جسے سازشوں کا سامنا ہے۔ کیا میں ایسے وقت میں اپنی آنکھیں کھول کر نہ رکھوں، میں بڑھ کر کسی پر وار نہیں کرتی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنا دفاع بھی نہ کروں۔‘‘

’’ہاں۔! ہاں ممتاز محل تمہیں ایسا کرنا چاہیے۔ تم میری بہترین مشیر ثابت ہو سکتی ہو۔‘‘ شہزادہ خرم نے اسے اپنی

بانہوں میں بھرتے ہوئے خوشی سے کہا تو ممتاز محل شرم سے اس کی بانہوں میں سمٹ گئی۔

......☆......

۱۴ ذی قعدہ ۱۰۲۲ ہجری (۲۸ دسمبر ۱۶۱۳ء) کو اجمیر سے میواڑ کے راجپوتوں کی سرکوبی کے لیے روزانہ ہونے والی فوج رواں دواں تھی۔ دشمن کا علاقہ نزدیک آتا چلا جارہا تھا۔ مغلیہ فوج پہلی بار اتنی بڑی تعداد میں شہزادہ خرم کی سربراہی میں بڑھتی چلی جارہی تھی۔ شہزادہ خرم فتح گنج نامی ہاتھی پر سوار تھا جو اسے اس مہم کی روانگی پر شہنشاہ کی طرف سے عنائت ہوا تھا۔ اس وقت وہ بارہ ہزاری ذات، چھ ہزار سوار دہ اسپہ کے منصب پر فائز تھا۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ مغلیہ فوج کی سربراہی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ راجہ سورج سنگھ، سیف خاں بارہہ، تربیت خاں، نوازش خاں، کشن سنگھ، رانا سکھ راؤ، ابوالفتح دکنی، دوست بیگ وغیرہ تقریباً بیس ہزار راجپوت، مغل، جاٹ اور ڈوگرے امراء وسوار ہم رکاب تھے۔ جن کی بہادری اور دلیری کے قصے مشہور تھے۔ ایک لاکھ فوج، جن میں سپاہی، بندوق بردار، اور توپچی اس کے علاوہ تھے۔ اس جنگجو فوج کے ساتھ امدادی سرگرمیوں کے لیے بے شمار جانور، چھکڑے اور لوگ شامل تھے۔ فوج کا کوچ انتہائی پرامن تھا۔ وہ فاتح حکمرانوں کی طرح راستے میں آنے والے مال ومتاع کو نقصان نہیں پہنچارہے تھے بلکہ اگر کہیں نقصان ہوجاتا تو اس کا معاوضہ ادا کرکے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جارہے تھے۔ اک شور تھا، کمانداروں کی تیز چیختی ہوئی آوازیں، شاہی نقارہ، سنکھ بجنے کی آوازیں۔ چھکڑوں اور گاڑیوں کے چلنے اور پہیوں کی چڑ چڑاہٹ، کوڑوں اور چابک برسانے کی آوازیں، مویشیوں اور جانوروں کی ہنہناہٹ، چنگاڑیں۔ خرم کے ہراول میں علم، توغ اور تومان اٹھائے ہاتھی چل رہے تھے۔ فتح گنج ہاتھی کے ساتھ خرم کا پسندیدہ گھوڑا ابھی چل رہا تھا جس کی لگام سائیس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے عقب میں ممتاز محل کی رتھ تھی جس میں وہ شاہی دائی ستی النساء کے ساتھ سفر کررہی تھی۔ اس کے ساتھ عقب میں حکیم وزیر خاں کی رتھ تھی۔ وہ ارجمند کی نگہبانی کے لیے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ کنیزوں، خادموں اور غلاموں کی خاصی تعداد تھی جو صرف انہی کے لیے مخصوص تھی۔ خرم کے ساتھ ممتاز محل تھی اور اسے اس پر بے حد پیار آرہا تھا۔ اسے ممتاز محل کی بہادری، وفاداری اور محبت پر فخر تھا۔ کوئی دوسری عورت ہوتی تو محلوں کے عیش وآرام میں، محل کی کسی ایک بالکنی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی۔ مہم پر روانگی سے قبل اسے ممتاز محل کی اہمیت کا اندازہ ہوا تھا وہ اس کی اچھی مشیر ثابت ہوسکتی تھی۔

مغلیہ فوج رواں دواں تھی۔

......☆......

مشرقی افق نارنجی ہو رہا تھا۔طلوع صبح کے آثار کے ساتھ ہی شہزادہ خرم بارگاہ میں آیا تو ممتاز محل بیدار ہو چکی تھی اور عبادت میں مصروف تھی۔خرم بہت تھک چکا تھا۔ساری رات وہ جہانگیر کے نویں جلوس کے شاندار جشن میں مصروف رہا تھا۔ اس محفل میں اس نے اپنی کامیابی اور کامرانی کی امراء کو داد دی تھی۔ممتاز محل عبادت میں مصروف تھی جبکہ اس کی آنکھوں میں رتجگا اتر ہوا تھا۔وہ نیند لینے کا خواہش مند تھا لیکن وہ ممتاز محل سے باتیں بھی کرنا چاہتا تھا۔وہ اس کی عبادت میں مخل نہیں ہوا بلکہ انتظار کرتا رہا۔وہ اس کی طرف دیکھتا رہا اور اس رُو پہلی رات کو یاد کرتا رہا جب مہم پر جانے سے قبل اسے اندیشوں نے گھیرا ہوا تھا۔یہی اس کی بیوی تھی جس نے اعتماد بھری باتیں کر کے اس کے اندر ایک ایسا جذبہ بھر دیا تھا جس کے بل بوتے پر کامیابیاں اس کے قدم چومتی رہیں۔اتنی بڑی کامیابی جو کہ اس کی توقع سے بھی بڑھ کر تھی۔

''شہزادہ معظم۔! کامیابی اور نواں جہانگیری جلوس مبارک ہو۔'' ممتاز محل نے کہا تو وہ چونک اٹھا،نجانے وہ کب اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی جبکہ وہ اپنی مہم کی یادوں میں کہیں کھو گیا تھا۔

''تمہیں بھی مبارک ہو ممتاز محل۔؟'' شہزادہ خرم نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔''میں نے مال غنیمت کے ساتھ عالم کمان ہاتھی کے ہمراہ مزید سترہ ہاتھی شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیئے ہیں۔''

''کیا آگرہ سے کوئی خبر آئی ہے؟'' ممتاز محل نے پوچھا۔

''کیسی خبر۔؟''

''خسرو سے متعلق کوئی خبر۔! کیونکہ پچھلی بار پتہ چلا تھا کہ خسرو کے رشتہ دار خان اعظم کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا ہے اس پر کوئی ردعمل۔؟''

''فی الحال تو کوئی خبر نہیں آئی۔میں خدمت پرست خاں رضا بہادر پر اعتماد کرتا ہوں۔جب بھی ایسی کوئی خبر سامنے آئی وہ مجھے مطلع کر دے گا۔''

''ہاں آگرہ اور دربار جہانگیری کی خبر آپ کو ضرور رکھنی چاہیے۔''

''ایسا ہی ہو رہا ہے ممتاز محل،تم بے فکر رہو۔'' خرم نے کہا اور مسکراتے ہوئے بستر پر دراز ہو گیا۔اسے کچھ دیر آرام کرنا تھا تا کہ وہ تازہ دم ہو کر اپنے امور سنبھال سکے۔

اس رات وہ اپنے قریبی ساتھیوں کے ساتھ محو گفتگو تھا۔رانا کی فوجیں بھاگ گئیں تھیں اوران کا تعاقب سختی سے کیا گیا تھا۔سردی کا موسم ختم ہونے کو تھا۔اس رات ان کے درمیان یہی صلاح مشورہ ہو رہا تھا کہ اس پورے علاقے کے انتظام کے لیے کس کو کس جگہ بھیجا جائے۔اسے معلوم تھا کہ یہ گفتگو کئی دن تک چلے گی۔اسے بھی اتنی جلدی نہیں تھی۔اس کے قریبی ساتھی اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔گفتگو اپنے عروج پر تھی کہ ممتاز محل کا خواجہ سرا عیسیٰ بارگاہ میں آموجود ہوا۔اس کی آمد غیر اہم نہیں تھی۔وہ چند لمحے کھڑا رہا اور پھر واپس پلٹ گیا۔یہ اشارہ تھا کہ اسے بلایا جارہا ہے۔اس نے گفتگو سمیٹی اور ممتاز محل کے خیمے کی جانب بڑھ گیا۔اس سے پہلے کہ وہ خیمے میں قدم رکھتا۔نومولود کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

۲۱صفر ۱۰۲۳ھ (۱۲اپریل ۱۶۱۴) کی اس رات شہزادہ خرم کی دوسری بیٹی جہاں آرا پیدا ہوئی۔اس کا نام جہانگیر نے تجویز کیا تھا۔

قرمزی بارگاہ میں شہنشاہ جہانگیر تخت پر جلوہ افروز تھا۔اس کے چہرے پر سرخی چمک رہی تھی اور خوشی کا دیّا روشن تھا۔شہزادہ خرم کی قیادت میں میواڑ کے رانا کی سرکوبی کے لیے جو لشکر روانہ کیا گیا تھا وہ کامیاب لوٹا تھا۔اس دن جہانگیر نے اس لشکر کے سرداروں کو اذن باریابی بخشا تھا۔وزراء،عمائدین سلطنت اور امراء کے علاوہ درباریوں سے بارگاہ بھری ہوئی تھی۔جہانگیر کے تخت پر فروکش ہونے کے تھوڑی دیر بعد ایک غلغلہ مچا،آواز اتنی اونچی نہیں تھی لیکن پھر بھی سب کو احساس ہو گیا کہ شہزادہ خرم آرہا ہے۔کچھ ہی دیر بعد شہزادہ خرم نمودار ہوا۔بیش قیمت خلعت،مرصع زیورات اور ہتھیاروں کے ساتھ نپے تلے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا جہانگیر کے پاس پہنچ گیا۔دستور کے مطابق اس نے سجدہ تعظیمی کیا اور جیسے ہی سیدھا کھڑا ہوا،

جہانگیر بھی اپنے تخت سے اٹھ گیا۔اس نے اپنے بازو پھیلائے تا کہ خرم اس کے گلے لگ سکے۔پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ بھرے دربار میں بادشاہ نے کسی شہزادے کو گلے لگایا تھا۔اس میں شفقت پدری کے جذبات تھے یا کامیاب لشکر کے سردار کی پذیرائی،اس وقت کچھ بھی سمجھ میں نہ آسکا۔تاہم جہانگیر کے چہرے پر فخر وانبساط واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔چند لمحے گلے لگے رہنے کے بعد جہانگیر نے خرم کو الگ کیا اور تخت پر بیٹھ گیا۔خرم انتہائی ادب واحترام سے چند قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

''خرم۔!میں تمہاری فتوحات سے بہت خوش ہوں۔عہد اکبری سے میواڑ کے رانا سرکش تھے۔''

''جہاں پناہ۔!یہ آپ کا تدبر اور حسن انتخاب ہی ہے جس کے باعث یہ مہم سر ہوئی۔''شہزادہ خرم نے انتہائی ادب سے کہا اور پھر ساتھ آئے ان لوگوں کو اشارہ کیا جنہوں نے بڑے قرمزی رنگ کے کپڑے سے ڈھکے تھال اٹھا رکھے تھے۔وہ آگے آئے تو خرم نے ان پر سے کپڑا اتارتے ہوئے کہا

''حضور جہاں پناہ کی نذر۔!ایک ہزار اشرفیاں،ایک ہزار روپیہ اور بیش قیمت جواہرات......''جہانگیر نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا،جواہرات کے صندوقچے میں ایک لعل چمک رہا تھا،بادشاہ کی نگاہ اس پر ٹک گئی۔وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر اشارے سے قبولیت کا اذن دے دیا۔

''شہزادہ خرم۔!میں تمہاری نذر قبول کرتا ہوں۔''یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے ٹھہرا اور پھر اعلان کرنے والے انداز میں بولا''میں تمہارے منصب میں سہ ہزاری ذات،دو ہزار سوار،دو اسپہ،سہ اسپہ اضافہ کرتا ہوں۔اس کے ساتھ پندرہ ہزاری ذات کے مطابق جاگیر،خلعت،چارقب مرصع خنجر وشمشیر مرصع،عراقی گھوڑے مرصع زین ولگام،فیل خاصہ بج گج ہتھنی نقرئی ہودج عطا کرتے ہیں۔''

جہانگیر کے اعلان میں اس قدر نوازشات سے شہزادہ خرم کے من میں ولی عہد سلطنت کا فخر مزید پختہ ہو گیا۔اس کے ساتھ ہی وہاں پر موجود وزراء،عمائدین سلطنت اور درباریوں پر واضح ہو گیا کہ جہانگیر کی شفقت پدری کے علاوہ اس کی صلاحیتوں اور بہادری کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔

......☆......

خواب گاہ کی کھلی کھڑکی سے چاندنی نے فرش پر رُوپہلی چادر پھیلا دی تھی۔جس سے خواب گاہ کا ماحول خواب ناک ہو گیا تھا۔قندیلوں کی طلائی روشنی ایک طرف سے ان حریری پردوں پر چمک رہی تھی جن کے حصار میں ممتاز محل لیٹی ہوئی

تھی۔رات کے اس پہر میں نقرئی وطلائی روشنیوں کے سنگم نے بہت خوبصورت سماں باندھ دیا تھا۔ہوا سے دھیرے دھیرے ہلتے ہوتے حریری پردے عجب جھلملاہٹ دکھا رہے تھے۔وہ خواب گاہ میں تنہا تھی۔کچھ دیر پہلے اس نے سب کنیزوں سمیت ستی النساء کو بھی جانے کا کہہ دیا تھا۔اس وقت وہ پرسکون تھی اور اس مشکل ترین مہم کے مصائب وتکالیف کو یاد کر رہی تھی جن سے وہ گذری تھی۔مگر اپنے شوہر اپنے محبوب شہزادہ خرم کی رفاقت نے ان مصائب تکالیف کو محسوس ہی نہیں کیا۔اس خونی مہم کے دوران جب بھی وہ پریشان،غمگین،شکستہ خیال اور بے چین ہوتا وہ اسے اپنی بانہوں میں لے کر اتنی پیار بھری باتیں کرتی کہ وہ پھر سے بااعتماد اور حوصلہ مند ہو جاتا۔ان دنوں میں وہی سمجھتی کہ شہزادے کو کس کس طرح پرسکون کیا جا سکتا ہے۔ورنہ اس خونی مہم میں جنگی چالوں کے لیے یکسوئی حاصل کرنا مشکل ہی نہیں،ناممکن تھا۔اسے دور ویرانوں اور جنگوں کی زندگی کا تجربہ بہت اچھا لگا تھا۔جہاں خطرات کے علاوہ فطری حسن بکھرا پڑا تھا۔رات ڈھلتے ہی خطرناک جنگلوں میں درندوں کی وحشیانہ آوازیں اور صبح دم جھیل پر پڑتی سنہری کرن اس کی زندگی کے انوکھے تجربات تھے۔

ایسے ہی ایک رات وہ بہت بے چین،شکستہ دل اور قدرے مایوس تھا۔وہ خاموش تھا لیکن اس کی آنکھیں سب کچھ واضح کر رہی تھیں۔ممتاز محل نے اسے بانہوں میں بھرا اور پیار سے پوچھا

''میرے محبوب......!اتنی بے چینی،اتنی مایوسی،آخر کیوں۔؟''

خرم نے اس کی طرف دیکھا اور پھر شکستہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا''لشکر کے چند سرداروں میں مایوسی سرائیت کر رہی ہے۔وہ اس طویل محاصرے سے اکتا گئے ہیں۔مجھے یہ خوف ہے کہ یہی مایوسی عام سپاہی تک نہ پھیل جائے۔''

''سپاہی میں اکتاہٹ اور مایوسی اس وقت آتی ہے جب اسے اپنی کوششوں کے رائیگاں جانے کا احساس پیدا ہو جائے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو لیکن اس کی وجہ حالات نہیں ہیں،فوج میں یہ سرگوشیاں جان بوجھ کر پھیلائی جا رہی ہیں تاکہ میں یہاں ناکام ہو جاؤں۔''

''مگر وہ کامیاب نہیں ہو پائیں گے...... بہت جلد آپ قلعے کی دیواریں توڑ دیں گے۔'' ممتاز محل نے کہا اور چند لمحے بعد بولی۔''کیا آپ نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ یہ افواہیں کون پھیلا رہا ہے۔''

''وہی جو چاہتے ہیں کہ میں جہانگیر کی نظروں سے گر جاؤں،اگر تم کھلے لفظوں میں سننا چاہتی ہو تو وہ ملکہ نور جہاں

ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ مہابت خاں کو واپس روانہ کر دیا جائے۔''

''اور اس کے چاہنے والے لشکر میں مایوسی پھیلا رہے ہیں۔'' ممتاز محل نے کہا پھر بولی'' لیکن ان کی تمام تر سازشیں، افواہیں اور سرگوشیاں، اس وقت دم توڑ جائیں گی جب آپ قلعہ فتح کر لیں گے، آپ نے تو اب تک محاصرہ کیا ہوا ہے اس میں نئی منصوبہ بندی کریں تا کہ تبدیلی کے امکان کے ساتھ صورت حال تبدیل ہو جائے۔ جس طرح لشکر میں کمزور لوگوں کے راستے سے افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں، آپ قلعے کی دیوار میں کمزور ترین حصہ کیونکر تلاش نہیں کر سکتے۔'' ممتاز محل نے کہا تو شہزادہ خرم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ مطمئن اور پرسکون ہوتا چلا گیا۔

ممتاز محل کی خواہش تھی کہ وہ بھی بارگاہ میں جائے اور وہاں کامیابی کی خوشی میں خرم کی پذیرائی دیکھے مگر وہ ایسا کر نہیں سکتی تھی۔ وہ تخلیقی عمل کے اس مقام پر تھی جہاں عورت پر نگاہ پڑتے ہی واضح طور پر سمجھ آجاتی ہے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ بارگاہ تک جا نہیں سکتی تھی بلکہ احساس شرم مانع تھا، ورنہ اس قدر مہم میں سفر کے بعد چند قدموں کا فاصلہ اس پر بھاری تو نہیں تھا۔ ملکہ نور جہاں سمیت امراء و وزراء کی بیگمات وہاں پر موجود تھیں۔ بارگاہ میں دربار کے اختتام پر وہ سب خواتین اس کے پاس آتی تھیں۔ ان میں ملکہ نور جہاں بھی تھی۔

''کامیابی مبارک ہو ارجمند۔'' نور جہاں نے چہرے پر خوشی سجاتے ہوئے کہا۔

''آپ کو بھی۔ یہ سب آپ کی دعاؤں اور شہزادہ خرم کی اطاعت کا ثمر ہے۔'' ممتاز محل نے ادب سے کہا

''خرم کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے نہ صرف رانا کی سرکوبی کی بلکہ اس کے بیٹے کرن سنگھ کو بھی شہنشاہ کے حضور پیش کر دیا۔'' نور جہاں نے کہا اور کرن سنگھ کے بارے میں بتانے لگی کہ وہ محض ایک لڑکا ہے جو شہنشاہ کی نوازشات سے مالا مال ہو کر شاہی مہمان بن گیا ہے۔ اور اب اسے دارالسلطنت میں رہنا ہے۔

''ارجمند۔! تم بہت امیر ہو چکی ہو۔''

''میں نہیں، شہزادہ خرم، مجھے دولت سے نہیں اس کی محبت سے غرض ہے۔''

''ہاں۔! تم دونوں کی محبت دکھائی دیتی ہے۔'' اس نے ممتاز محل کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔اس ہنسی میں قدرے طنز بھی چھپا ہوا تھا۔پھر کچھ دیر باتوں کے بعد وہ چلی گئی تو دوسری عورتیں بھی دھیرے دھیرے مبارک دینے کے بعد رخصت ہو گئیں۔

ممتاز محل کی پذیرائی محض شہزادہ خرم کی محبت کی وجہ سے تھی یا اس میں ممتاز محل کی وفا بھی شامل تھی؟

وہ رات کے اس پہر تنہا یہی سوچ رہی تھی کہ شہزادہ خرم اس کے پاس آ گیا۔اس کے چہرے پر خوشی پھیلی ہوئی تھی۔ممتاز محل نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا لیکن خرم نے انتہائی پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔وہ پر سکون ہو کر لیٹ گئی تو خرم بھی اس کے پاس لیٹ گیا۔

''ارجمند۔! آج میں بہت خوش ہوں۔'' خرم نے لرزتے ہوئے لہجے میں سرگوشی کی۔''میرے باپ کا مجھ پر اعتماد ہی میرے لیے سب سے بڑا انعام ہے۔''

''جی شہزادہ معظم۔! یہاں تک کہ ملکہ نور جہاں بھی اعتراف کر چکی ہے۔وہ اسے بہت بڑی کامیابی سمجھتی ہے کہ آپ نے راجکمار کرن سنگھ کو بادشاہ کے حضور پیش کر دیا ہے اور انہوں نے اطاعت قبول کر لی ہے۔''

''ہاں۔! یہ کامیابی تو ہے لیکن اس ساری کامیابی میں تمہاری محبت بھری رفاقت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔مجھے اعتراف ہے کہ تمہاری باتیں مجھے اک نیا حوصلہ دیتی تھیں۔''

''ایک شریک حیات ہونے کے ناطے یہ میرا فرض ہے کہ میں آپ کو پراگندہ خیال نہ ہونے دوں، آپ کو پر سکون رکھوں، ہر وقت آپ کی راحتوں کا خیال رکھوں۔'' ممتاز محل نے محبت میں بھیگے ہوئے لہجے میں کہا تو خرم کے چہرے پر خوشی کا رنگ مزید گہرا ہو گیا۔

ان دونوں میں خاموشی چھا گئی جیسے خاموشی بھی ایک زبان رکھتی ہو اور وہ بنا کچھ کہے ایک دوسرے کے احساسات و جذبات کو سمجھ رہے ہوں۔کافی دیر بعد ممتاز محل نے کہا

''خرم۔! میرے محبوب۔! اگر اس بار بھی لڑکی ہوئی تو............''

''تو کوئی بات نہیں۔یہ خدا کی طرف سے عطیہ ہے۔وہ جو چاہے گا ہمیں نواز دے گا۔''

''لیکن جانشین تو لڑکا ہی ہوتا ہے نا.........اب تک دو بیٹیاں..........'' اس کے لہجے میں خوف کی پرچھائیں

تھی۔

''مایوس نہیں ہوتے، کیا تمہیں خدا کی رحمت اور میری محبت پر اعتماد نہیں؟ اس بار اگر بیٹا نہیں ہوگا تو اگلی بار سہی، کبھی تو............اور پھر ارجمند۔! مجھے تمہاری رفاقت چاہیے، تمہاری وہ محبت جس میں جنون ہے، عشق کی گہرائیاں ہیں۔''

''میرے محبوب......!'' ممتاز محل نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

کامیابیوں اور کامرانیوں میں لپٹی ہوئی وہ رات محبت کی سرشاری میں پگھلتی دھیرے دھیرے گذرتی چلی گئی۔

......☆......

۲۹ صفر ۱۰۲۴ ہجری (۳۰ مارچ ۱۶۱۵) کی شب ممتاز محل کے گرد ستی النساء کے ساتھ کنیزوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ ممتاز محل کے بطن سے تیسری اولاد کی آمد آمد تھی اور وہ دردزہ میں مبتلا تھی۔ بارہ گھڑی رات گذر جانے کے بعد طلوع سحر سے پہلے قدرت نے شہزادہ خرم کو اولا دنرینہ سے نواز دیا۔

شہزادہ خرم کی اولاد میں وہ پہلا بیٹا تھا۔ اس لیئے اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ جس طرح سورج کی روشنی اجمیر کی سرزمین پر پھیلتی گئی۔ اس طرح خرم کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی اطلاع بھی مسرت کے ساتھ ایک دوسرے کو سنائی گئی۔ حرم سرا میں یہ خبر بڑی خوشی کے ساتھ سنی گئی۔ طلوع آفتاب کے وقت جب یہ اطلاع جہانگیر کو سنائی گئی تو کتنی دیر تک وہ آنکھیں بند کر کے اس اطلاع میں موجود انبساط کے نشے سے دوچار رہا۔

اجمیر کے تالاب کنارے اس رات روشنیوں کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ شہزادہ خرم نے بیٹے کی ولادت کی خوشی میں عظیم الشان جشن کا اہتمام کیا تھا۔ تالاب کا وہ کنارا مشعلوں، قندیلیوں اور لالٹینوں سے جگمگا رہا تھا۔ اندھیری رات میں ان کی روشنی سے یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے روشن ستارے زمین پر تالاب کنارے اتر آئے ہوں۔ وزراء، عمائدین سلطنت، امراء کے علاوہ راجے مہاراجے بھی اس جشن میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ بارگاہ کی طرز پر شامیانوں نے ایک بہت بڑی جگہ کو گھیر رکھا تھا۔ رات کا پہلا پہر ڈھلنے کو تھا کہ شاہی نقارہ بجنے سے شہنشاہ کی آمد کا اعلان ہوا۔

شہنشاہ جہانگیر خصوصی مسند پر براجمان تھا۔ مہمانوں کا ایک ہجوم تھا جو اس جشن میں شریک تھا۔ تھوڑی دیر بعد شہزادہ خرم آگے بڑھا اور رسم کے مطابق نومولود کو اس کی گود میں دے کر ایک ہزار اشرفی کی نذر پیش کی اور پھر نہایت ادب سے بولا

''شہنشاہ معظم! ظل سبحانی، جہاں پناہ۔! اس نعمت خداوندی کا نام تجویز فرمادیں۔''

جہانگیر چند لمحوں تک اس نومولود کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اپنے سامنے موجود خرم اور اس کے پیچھے ایک ہجوم پر نگاہ کی۔ وہ سبھی نومولود کا نام سننے کے مشتاق تھے۔ تب جہانگیر نے لب کھولے اور کہا

''میں اپنے پوتے کا نام داراشکوہ تجویز کرتا ہوں۔''

ان لفظوں کے ساتھ ہی ہجوم میں بھنبھناہٹ ہوئی اور پھر نام تجویز کرنے پر مبارک سلامت کا شور ہوا۔ اس کے ساتھ ہی جشن کی شروعات کا اعلان ہو گیا۔

داراشکوہ کا نام پا کر نومولود واپس ممتاز محل کی گود میں آ چکا تھا۔ جشن کی آوازیں اسے سن رہی تھیں۔ اس نے داراشکوہ کی طرف دیکھا اور ستی النساء سے کہا

''دیکھو تو، اس کی آنکھیں شہزادہ خرم جیسی ہیں۔''

''جی ہاں شہزادی۔! اور اس کے ہونٹ آپ کی طرح، خدا کرے اس کی عمر دراز ہو اور اسے کامیابی نصیب ہوں۔''

''آمین۔!'' ممتاز محل نے دھیرے سے کہا اور ممتا میں بھیگی ہوئیں نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

......☆......

تقریباً ڈیڑھ سال بعد یعنی ۱۸ جمادی الثانی ۱۰۲۵ھ (۳ جولائی ۱۶۱۶ء) کی رات کا دوسرا پہر ختم ہونے کو تھا۔ جب تیموری نسل میں، ممتاز محل کے بطن سے جہانگیر کا پوتا اور خرم کا بیٹا پیدا ہوا۔ اس بیٹے کی پیدائش پر جشن طرب کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ کیونکہ محض چار ماہ پہلے شہزادی حور النساء فوت ہو گئی تھی۔ وہی شہزادی حور النساء جسے جہانگیر نے گود لے لیا تھا۔ خرم کی پہلی اولاد کی وفات پر حرم سرا غمگین تھا۔ اسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ کے باہر دفن کر دیا گیا تھا۔ یوں ماحول ابھی تک سوگوار تھا۔ جس طرح جہانگیر حرم سرا کی تمام بیگمات کے ساتھ شہزادہ خرم کے ہاں پرسا دینے آئے تھے۔ اسی طرح نومولود بیٹے کی مبارک باد دینے بھی آئے۔ خرم نے رسم کے مطابق ایک ہزار اشرفی نذر کی اور نومولود کا نام تجویز کرنے کی درخواست کی۔ جہانگیر نے اس کا نام محمد شاہ شجاع تجویز کیا۔

......☆......

دکن سے شورشوں کی خبریں متواتر آ رہی تھیں۔ دکن والوں کے حوصلہ بلند تھے کیونکہ اس سے قبل شہزادہ پرویز اپنے لشکر کے ساتھ شکست کھا کر واپس آیا تھا۔ اس کے بعد جو بھی تدابیر کی گئی اس سے مغل فوج کا رعب زائل ہی ہوا۔ دکنی

دھیرے دھیرے تمام علاقے پر قابض ہونے لگے تھے۔صورت حال اس قدر پیچیدہ ہوگئی کہ وہاں کا مغلیہ حاکم عبدالرحیم خاں خاناں بے دست و پا ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس نے تمام حالات سے بادشاہ کو مطلع کیا اور امداد کا طلب گار ہوا۔

اس وقت جہانگیر بارگاہ کے کمرہ خاص میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر قبل ملکہ نور جہاں اس کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ جہانگیر نے بس ایک جام لیا تھا اور پھر اپنی سوچوں میں ڈوب گیا تھا۔نور جہاں سمجھ گئی کہ بادشاہ تخلیہ چاہتا ہے لہٰذا وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ کچھ وقت گذرا ہوگا کہ شہزادہ خرم کے باریاب ہونے کی اطلاع دی گئی۔

''ہاں۔! اسے فوراً حاضر کیا جائے۔''

شہنشاہ کی اجازت پا کر خرم اندر داخل ہوا۔اس نے جھک کر تعظیم دی اور مودب کھڑا ہوگیا۔

'' آؤ خرم۔! ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔'' جہانگیر نے کہا تو شہزادہ خرم مسند کی ایک طرف اپنے باپ کے پاس بیٹھ گیا تو جہانگیر بولا۔'' خان خاناں کی طرف سے اطلاع آئی ہے کہ دکن میں بغاوت بڑھ گئی ہے ایسے مرحلے پر اگر ان کی سرکوبی نہ کی گئی تو ان کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔''

''جہاں پناہ۔! پھر ہمیں دیر نہیں کرنا چاہیے۔'' خرم نے ادب سے کہا

''کیا تم اس مہم کے لیے تیار ہو؟'' جہانگیر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جو حکم جہاں پناہ۔!'' خرم نے ادب سے کہا تو جہانگیر کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی۔ وہ چند لمحے سوچنے والی حالت میں رہا اور پھر بولا

''میواڑ کی مہم میں جو مندر تباہ ہوئے مجھے اس کا افسوس ہے، لیکن کوشش کرنا کہ عبادت گاہیں بچی رہیں۔''

''شہنشاہ معظم۔! میں نے رائے سندر داس کو رانا کے تعاقب میں بھیجا تھا۔ وہ ہندو ہے اور میں نے جو اسے ذمہ داری دی تھی اس میں پوری طرح اختیار دیا تھا۔ اگر سندر داس نے بت خانوں کو تباہ کیا ہے تو اس کی سراسر نوعیت سیاسی تھی، اس میں کوئی مذہبی عناد شامل نہیں تھا۔ اگر کوئی یہ الزام لگائے کہ ہم مسلمان تھے اور ہم نے کسی مذہبی عناد کے باعث مندر گرائے ہیں تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ سندر داس ایک ہندو ہے اور اس نے جو بہتر سمجھا کیا۔''

''میں جانتا ہوں کہ اس وقت یہی مندر سلطنت کے خلاف سازشوں میں شریک ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے ہمیں ہندوستان کی سرزمین سے اٹھا کر باہر پھینک دینے کے منصوبے تیار ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کا سدباب کرنے کے

لیےاورکوئی راہ نکالی جائے۔''

''جہاں پناہ۔! یہ ہندو پنڈت اپنی عجیب وغریب رسموں کے باعث راجاؤں، مہاراجوں کواپنی مٹھی میں رکھنے کا گر جانتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ مذہب کے نام پران کی اجارہ داری ختم ہو۔ یہ ہمیشہ سازشوں کا گڑھ رہیں گے۔ وہاں سے اگر لوگوں کو ہٹائیں گےتو وہ پھر آمادۂ سازش ہوں گے۔ جیسے یہ دکن۔! آپ دیکھ لیجئے گا کہ ان بغاوتوں کے پیچھے ان پنڈتوں اور پروہتوں کا ہاتھ ہوگا۔ مندر مسمار کردینے سے وہاں سب ختم ہوجاتا ہے،لوگوں کے ساتھ سازشیں بھی۔'' خرم نے جذباتی انداز میں کہا۔ اس کا لہجہ بلند ہوگیا تھا۔ پھرلمحہ بھر توقف کے بعد نہایت ادب سے کہا'' تاہم جیسا حضور چاہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ مندر مسمار نہ کیے جائیں محض سازشیوں کوختم کیا جائے۔''

''کوشش کرو کہ اس مہم پر جلد از جلد روانہ ہوا جائے۔ تمہاری قیادت کا اعلان بہت جلد کردوں گا۔ تم روانگی کی تیاریاں کرو۔'' جہانگیر نے کہا اور نیم دراز ہوگیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اب مزید بات نہیں کرے گا۔ شہزادہ خرم نے اجازت چاہی اوروہاں سے چلا آیا۔

چند دن بعد دربار میں دکن کی مہم پرروانگی کا اعلان کردیا گیا۔ اس کی قیادت شہزادہ خرم کوسونپ دی گئی۔

''دکن کی مہم پر میں خرم کی قیادت میں لشکر کی روانگی کا حکم دیتا ہوں۔ خرم کے منصب کوبیس ہزاری ذات اوردس ہزار سوار دواسپہ سہ اسپہ پر بڑھاتا ہوں۔ اس کے علاوہ خلعت ، چارقب مرصع، خنجر وشمشیر مرصع، دوگھوڑے مع ساز مرصع، طلائی ساز سمیت ایک ہاتھی اورایک ہتھنی، اکبراعظم کی یادگار دومالائیں، ایک مالا میری طرف سے عنایت کرتے ہوئےخرم کوشاہ کا خطاب دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کران سرداروں کے نام گنوائے گئے جواس لشکر میں جانے والے تھے۔ ان کے اعزازاورانعامات کی تفصیل دی گئی۔ ۳۰ شوال ۱۰۲۵ھ (۱۲ نومبر ۱۶۱۶ء) کو یہ لشکر مہم پر روانہ ہوا۔

برہان پور۔! دریائے تاپتی کی وادی میں ایک قلعہ بند شہر تھا۔ یہیں سے کشتیوں کے ذریعے سورت جایا جاتا تھا۔ یہی وہ دریا تھا جس کے کنارے اکبراعظم نے پڑاؤ کیا تھا۔ اس دریا کنارے جو محل تھا وہ بہت سادہ سا تھا۔ محض سادہ سی اینٹوں سے بنا ہوا، مگر اپنی اہمیت کے لحاظ سے بہت اہم تھا۔ ہمایوں اکبر، جہانگیراوراب شاہ خرم اس محل میں آکر ٹھہرے تھے۔ یہی وہ مرکز تھا جہاں سے وہ اپنے دشمنوں کے خلاف لڑائی کے لیے صف آرا ہوتے تھے۔

حسب معمول ممتاز محل بھی شاہ خرم کے ساتھ تھی۔ اگرچہ شاہ شجاع کی ولادت ایسے حالات میں ہوئی تھی کہ ممتاز محل کو

اطباء نے آرام کے لیے کہا تھا لیکن شاہ شجاع کی ولادت کے تقریباً چاہ ماہ بعد وہ سفر پر نکل پڑی تھی۔ اسے محض اپنے شوہر، اپنے محبوب کا ساتھ چاہیے تھا۔ پانچ ماہ کے طویل سفر کے بعد وہ اجمیر سے برہان پور پہنچے تھے۔ فطرت سے محبت کرنے والی ممتاز محل کو قدرتی نظاروں میں ہمیشہ سے دلچسپی رہی تھی۔ لیکن اس سفر میں اس کی پہلے والی جذباتی کیفیت نہیں تھی، یوں جیسے احساس کی لو کم ہوگئی ہو۔ اگرچہ اس کی محبت میں وہی پہلے والا والہانہ پن تھا مگر اپنے کمزور جسم کے ساتھ وہ اس کا ساتھ نبھانے میں مشکل محسوس کر رہی تھی۔ بچوں کی مسلسل پیدائش کے باعث وہ قدرے بھاری ہوگئی تھی۔ جسم کے وہ خطوط جنہیں حسن کا معیار خیال کیا جاتا تھا، اب دھیرے دھیرے ڈھل رہے تھے۔ شاہ خرم اگر اپنے سرداروں کے ساتھ لڑائی کے منصوبے بناتا، فوج کی نقل و حرکت اور دیگر امور میں مصروف رہتا تھا تو ممتاز محل اپنے بچوں کے ساتھ دن گذارتے ہوئے فرحت محسوس کرتی تھی۔ دارا اور جہاں آرا اس کے ساتھ تھے۔ ان دونوں کے لیے اگرچہ کئی ساری کنیزیں اور ملازم موجود تھے لیکن وہ ان کے کام خود کرتی اور اپنا ممتا کو تسکین دیتی تھی۔ پورا دن ان کے ساتھ گذارنے کے بعد وہ خوشگوار چہرے، فرحت بخش مسکراہٹ اور دل ربا باتوں کے ساتھ شاہ خرم کے استقبال کے لیے موجود ہوتی۔ وہ سارے دن کی تھکان، ذہنی پریشانی اور دباؤ لے کر آتا مگر ممتاز محل کے ساتھ وہ سب کچھ بھول جاتا۔ ان دونوں کی زندگی بہت خوبصورت انداز میں اپنے بچوں کے ساتھ گذرتی چلی جارہی تھی۔ ان کی خانگی زندگی بہت پرسکون تھی۔

گذرتے دنوں میں ایک دن کا پہلا پہر گذر گیا تھا۔ ممتاز محل تخلیق کے عمل سے دوچار تھی۔ ستی النساء اس کے قریب تھی برہان پور کے اس قلعے میں دن کا دوسرا پہر شروع ہوتے ہی نومولود کی آواز گونجی، ۲ رمضان المبارک ۱۰۲۶ھ، ۲ ستمبر ۱۶۱۷ء کو ممتاز محل کے بطن سے روشن آراء پیدا ہوئی۔ یہ شاہ خرم کی پانچویں اولاد تھی۔

......☆......

شاہی نقارہ بجنے اور نقیب کی آواز کے ساتھ جہانگیر کے آنے کی اطلاع ان سب میں پھیل گئی جو دربار میں موجود تھے۔ وزراء ایک طرف قطار باندھے کھڑے تھے۔ اس سے پیچھے عمائدین و سرکاری اہلکار، دوسری جانب چاندی کے جنگلے کے ساتھ شاہ خرم کھڑا تھا۔ اس سے بالکل سامنے کی طرف پردے کے پیچھے شاہی بیگمات بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان سے ہٹ کر کافی دور تک درباری امراء، فوجی کماندار محافظ شاہی وغیرہ کھڑے تھے۔ اس دن خصوصی تقریب تھی۔ جہانگیر نمودار ہوا اور اپنے جھروکے میں تخت پر فروکش ہوگیا۔ چند لمحے بیٹھنے کے بعد اس نے شاہ خرم کی طرف دیکھا اور بولا

''میرے بیٹے۔! شاہ خرم، مجھے تم پر فخر ہے۔ایک بار پھر تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم شہسوار میدان ہو۔دشمن کے علاقے میں گھس کر اسے مات دے سکتے ہو، شجاع و بہادر ہو۔دکن کی مہم سے کامیابی کے ساتھ واپسی نے تمہارے اعزاز بڑھا دیئے ہیں۔دکن کے سازشیوں پر نہ صرف تم نے اپنا اثر ورسوخ قائم کر لیا ہے بلکہ مغل سلطنت کا رعب و داعب قائم رکھا ہے۔وہاں تم نے امن قائم کر کے ثابت کر دیا ہے کہ مغل حکمران اپنی رعایا کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔وہ سارے باغی اب ہماری تابعداری پر مجبور ہوں گے جنہوں نے امن کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔میں تم سے خوش ہوں اور اس موقعہ پر تمہیں شاہ جہاں کے خطاب سے نوازتا ہوں۔''

جہانگیر نے پورے جوش اور شفقت پدری سے مغلوب لہجے میں کہا۔تاہم وہ پہلے والا تناؤ اور کڑک اس کی آواز میں نہیں تھی۔چہرے پر افسردگی کے باعث وہ بیمار و نحیف دکھائی دے رہا تھا۔اس کی آنکھوں سے ٹپکتی خوشی بہر حال شک میں مبتلا کر رہی تھی۔شاید اس بارے کسی نے بھی نہ سوچا تھا کہ خطاب دینے کے ساتھ ہی درباری نعرہ لگانے لگے تھے۔

''شہزادہ شاہ جہاں زندہ باد۔شہزادہ شاہ جہاں زندہ باد''

ان لمحات میں پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی ممتاز محل کے چہرے پر خوشیاں اور مسرتیں رقص کر رہی تھیں۔اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی جوت میں اپنے محبوب کے لیے پیار امنڈ رہا تھا۔

نعروں کی گونج ابھی باقی تھی کہ ایک شاعر نے شاہ جہاں کی تعریف میں قصیدہ پڑھا۔نظم کے اختتام پر جہانگیر اٹھا اور شاہ جہاں کو گلے لگا لیا۔کتنے لمحے وہ اسے اپنے سینے سے لگا کر کھڑا رہا۔پھر جب الگ کیا تو ان خدام کو اشارہ کیا جو طلائی طشتریاں پکڑے کھڑے تھے۔وہ خدام آگے بڑھے اور اس کے اوپر دھرا قرمزی کپڑا ہٹا دیا۔طشتری میں قیمتی پتھر، زمرد، ہیرے، نیلم، پکھراج وغیرہ دھرے ہوئے تھے۔جہانگیر نے دونوں مٹھیاں بھریں اور شاہ جہاں پر نچھاور کر دیں۔وہ اس پر ہیرے جواہرات اس وقت تک نچھاور کرتا رہا جب تک وہ طشتری خالی نہیں ہوگئی۔اسی طرح اس نے دوسری طشتری خالی کی اور پھر تیسری طشتری بھی خالی کی جو اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔اتنی دیر تک کھڑے رہنے اور پھر جواہرات و اشرفیاں نچھاور کرتے ہوئے بادشاہ نڈھال سا ہو گیا۔اس نے شاہ جہاں کا بازو پکڑا اور اپنے ساتھ دوسری کرسی پر بٹھا دیا۔مغلیہ عہد میں یہ کسی بھی شہزادے کے لیے پہلا اعزاز تھا کہ وہ بادشاہ کے برابر بیٹھا تھا۔ایک لمحہ میں بھرے دربار میں حیرت پھیل گئی۔

''شاہ جہاں کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔'' ملکہ نور جہاں نے تیزی سے کہا۔

''میرا محبوب، خود کو اس اعزاز کے لیے ثابت کر چکا ہے۔'' ممتاز محل نے صدقے واری ہوتے ہوئے کہا۔ پھر دھیرے سے پوچھا ''پھوپھی جان۔! کیا بادشاہ کی صحت اچھی نہیں ہے جو وہ نڈھال اور کمزور دکھائی دے رہے ہیں۔''

''نہیں تو۔!'' نور جہاں نے تیزی سے کہا ''وہ ٹھیک ٹھاک ہیں اور صحت مند ہیں۔ خدا کے فضل سے وہ کئی سالوں تک حکمرانی کریں گے۔؟ اس کی آواز میں غرور پوشیدہ تھا۔ ممتاز محل کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کی عام سی بات کو اس قدر گہرائی سے لے گی۔ وہ خاموش ہوگئی۔

جب وہ دونوں یہ باتیں کر رہی تھیں اس دوران شاہ جہاں اٹھا اور اس نے رسم کے مطابق ایک ہزار اشرفی اور ایک ہزار روپے بطور نذر پیش کیے جسے بادشاہ نے قبول کر لیے۔ پھر اتنی ہی رقم بطور صدقہ پیش کی گئی جسے غربا میں تقسیم کرنا تھا۔ اس دن دیگر سرداروں کے ساتھ شاہ جہاں کے منصب میں تیس ہزاری ذات، بیس ہزار سوار کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔

......☆......

ان دنوں موسم برسات ختم ہو چکا تھا۔ خوشگوار ٹھنڈی ہواؤں نے موسم کے بدلنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ شاہ جہاں ان دنوں برہان پور میں تھا۔ اس شہر کی فضاؤں میں اک خاص قسم کا تذبذب گھلا ہوا تھا۔ شاہ جہاں کا لشکر قلعہ کانگڑہ کی فتح کے لیے راجہ بکر ماجیت کی قیادت میں بھجوایا جا چکا تھا۔ شاہ جہاں کی تمام تر توجہ اس قلعہ کی فتح میں لگی ہوئی تھی۔ پورا دن اسی یاس و امید اور مصروفیت میں گذر جاتا۔ لشکر سے مسلسل رابطہ تھا۔ پیام بر مختلف پیغام لاتے اور لے جاتے تھے۔ قلعہ کانگڑہ پر شاہ جہاں کی پوری توجہ اس لیے بھی تھی کہ اس قلعہ کو ناقابل تسخیر تصور کیا جا رہا تھا۔ پنجاب کے شمالی کوہستان میں بلند پہاڑی سلسلے پر تعمیر یہ قلعہ اتنا پرانا تھا کہ اس کے بنانے والے کا نام تک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکا تھا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ قلعہ کس نے تعمیر کیا تھا۔ اس پر پہلا حملہ سلطان محمد تغلق نے کیا تھا اور پھر مختلف امراء و سلاطین نے اس پر تقریباً ۵۲ حملے کیے مگر کوئی بھی کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ غالباً ۵۳ واں حملہ شاہ جہاں کی نگرانی میں راجہ بکر ماجیت نے کیا تھا۔ عہد اکبری میں اس قلعے پر کئی مرتبہ لشکر کشی ہوئی تھی مگر کامیابی نصیب نہیں ہو پائی تھی۔

اینٹوں سے تعمیر کردہ برہان پور کے اس سادہ سے محل میں ممتاز محل اپنی خواب گاہ میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس رات شاہ جہاں اس کے پاس نہیں آیا تھا، وہ پوری رات مصروف رہا تھا۔ ممتاز محل ان ایام سے گذر رہی تھی جب وضع حمل کے دن قریب ہوتے ہیں۔ وہ رات کے پہلے پہر میں کچھ دیر کے لیے سوئی تھی لیکن پھر اسے نیند نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ستی النساء

اس کے پاس سے گئی تھی۔اس نے بااصرار اسے کھلایا پلایا تھا اور یہ خبر دی تھی کہ شاہ جہاں مصروف رہا تھا اور اب رہیں کہیں سو رہا ہے۔اسے اطمینان پھر بھی نہیں آرہا تھا۔اس نے دھیرے سے پہلو بدلا اور ان دنوں کے بارے میں سوچنے لگی جب ملکہ نور جہاں سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔اس نے بہت غور سے ملکہ نور جہاں کے تاثرات جاننے کی کوشش کی تھی۔اس دن جب جہانگیر نے شاہ جہاں کو اپنے خاص اعزازات سے نوازا تھا، ملکہ نور جہاں کو اتنی خوشی نہیں ہو پائی تھی۔اس وقت تو وہ ملکہ نور جہاں کے رویئے کو اچھی طرح محسوس نہ کرسکی لیکن بعد میں جب وہ ملکہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تو اسے احساس ہوا تھا۔نور جہاں نے بات ہی یہی سے شروع کی تھی کہ ''ارجمند تم اتنی خاموش کیوں ہو؟''

''نہیں تو۔! بلکہ میں تو بہت خوش ہوں۔اس قدر اعزازات سے کس شہزادے کو نوازا گیا ہے۔شاہ جہاں کا خطاب اور بادشاہ کے برابر نشست اس کے ولی عہد ہونے کا اعلان ہی تو ہے۔بس رسمی اعلان ہی تو باقی ہے۔''

''ہاں۔! مگر جہانگیر کا مزاج......خیر۔! تم بتاؤ، یہ تم شاہ جہاں کے ساتھ ہمیشہ سفر میں کیوں رہتی ہو؟''

''پھوپھی۔! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی اور نہ ہی وہ میرے بغیر۔!'' ممتاز محل نے کہا

''میں اس محبت کو سمجھتی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم بھی اس کے ساتھ دربدر ہوتی پھرو، تم اپنے رتبے کو سمجھو، شہزادیوں کی طرح محلوں میں عیش وعشرت سے رہو۔'' نور جہاں نے نخوت سے کہا

''میں ایسا نہیں کرسکتی، ہم دونوں......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اپنی طرف دیکھو، اپنی صحت کا خیال کرو، تمہاری شادی کو پانچ سال ہوئے ہیں اور تم پانچ بچوں کی ماں بھی بن چکی ہو۔کیا تم کوئی گائے ہو جو ہر سال ایک نئے بچے کے لیے تیار ہو جاتی ہو؟''

''میں اسے اس نقطہ نظر سے نہیں دیکھتی، مجھے فخر ہے کہ میں اتنی اولاد کی ماں ہوں۔یہ میرے شوہر کی محبت کا ثبوت ہے کہ وہ مجھے چاہتا ہے۔'' ممتاز محل نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنی صحت خراب کرلو۔'' نور جہاں نے تیزی سے کہا۔

''شاہ جہاں میرا شوہر ہے۔میں اس کی بیوی ہی نہیں، وہ میری محبت بھی ہے۔'' ممتاز محل نے اسے سمجھنا چاہا۔

''لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر سال اک نیا بچہ......! اپنے جسم کی طرف دیکھو، کیسا ہو رہا ہے، کیا تم اب کسی نئے بچے کے لیے متحمل ہوسکتی ہو......؟ میری طرف دیکھو، اور اپنا موازنہ مجھ سے کرو، تم میری بیٹی کی عمر کی ہو لیکن میرے جیسی لگتی

ہو۔''

ممتاز محل نے اس کی طرف دیکھا، وہ اب بھی حسین تھی، اس کی کمر ویسی ہی پتلی تھی، اس کی جلد صحت منداور چمکدار، اس کے لمبےاور گھنے بال اب بھی ریشمی تھے۔اس کی کلائیاں اب بھی سڈول تھیں۔وہ اب بھی کسی پر اپنے حسن سے سحر کر سکتی تھی۔اس کا واضح ثبوت جہانگیر تھا جو پوری طرح اس کے حسن کے جادو میں کھو چکا تھا۔وہ جسم کی قدر کسی اور انداز سے دیکھتی تھی جبکہ ممتاز محل کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

''پھوپھو۔! میرے لیےصرف شاہ جہاں کی محبت اہم ہے، میں اس کی بیوی ہوں اور اگر وہ مجھ سے سکون حاصل کرتا ہےتو میرے لیے یہی اہم ہے۔وہ اگراولاد مجھ سے چاہتا ہےتو یہ میرے لیےاعزاز ہے۔''

''لیکن اگر تم یونہی بچے پیدا کرتی رہی تو کبھی بھی اس طرح حسین وجمیل دکھائی نہیں دو گی، تم بھدی موٹی اور بھاری عورت بن جاؤں گی، پھراس کی محبت تمہارے لیےنہیں ہوگی۔اس کے اردگرد بہت ساری حسین وجمیل عورتیں موجود ہیں۔''

''اگر میرے محبوب کی خوشی اسی میں ہےتو میں اس میں ہی خوش ہوں'' ممتاز محل نے مسکراتے ہوئے کہا،اسے پوری طرح احساس تھا کہ وہ ان کی محبت کوسمجھ نہیں پا رہی ہے اور نہ ہی وہ سمجھ سکے گی کیونکہ اس کے سوچنے کا انداز ہی مختلف ہے۔ اس لیے بات کا رخ موڑتے ہوئے اس نے کہا'' پھوپھو۔! آپ تو کہہ رہی تھیں کہ بادشاہ بالکل صحت مند ہیں لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں۔وہ بیمار ہیں اور پہلے سے زیادہ پینے لگ گئے ہیں؟''

''تمہیں غلط اطلاع ملی ہے۔وہ بالکل صحت مند ہیں'' یہ کہہ کر اس نے سوچنے والے انداز میں پوچھا'' یہ تم اتنا کرید کر بادشاہ کی صحت کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو۔کیا تمہیں جلدی ہے کہ بادشاہ،شاہ جہاں کے ولی عہد ہونے کا اعلان کردے۔''

''نہیں پھوپھو۔! میرا مطلب یہ نہیں تھا، میں............''

''دیکھو۔! یہ امور سلطنت ہیں۔کس سردار کو کس حد نوازنا ہے، کسے کیا اعزاز دینا ہےاور کسے کیا سزا دی جائے گی، یہ سب بادشاہ نے طے کرنا ہوتا ہے۔خرم کی یہ چند کامیابیاں اسے تخت تک لے جانے کا ثبوت نہیں ہے۔تم شاید جہانگیر کے مزاج کو نہیں سمجھتی، وہ کسی وقت بھی اپنا ارادہ تبدیل کر سکتا ہے۔''

''میری دعا ہے کہ ان کا سایہ ہم پر سلامت رہے۔آپ کو بھی پتہ ہے کہ مجھے تخت اور امور سلطنت سے کوئی دلچسپی

نہیں ہے۔''

''ہاں مگر۔ اپنے محبوب شوہر کے لیے تو تم کچھ بھی کر سکتی ہو۔ جو محلوں کا عیش چھوڑ کر میدان جنگ کی مصیبتیں برداشت کرتی ہے۔''

''آپ میری بات کو کسی اور طرح سمجھ رہی ہیں، میں تو بس شہنشاہ کی سلامتی اور صحت مندی چاہتی ہوں۔''

ممتاز محل نے کہا اور پھر باتوں کا رخ تبدیل کر دیا۔

ممتاز محل کی سوچوں کا تارا چانک ٹوٹ گیا۔ اس نے اپنی گردن پر پیار بھرے لمس کا احساس کیا، اس نے پہلو بدل کر دیکھا، شاہ جہاں اپنے پر مسرت چہرے کے ساتھ، آنکھوں میں دنیا جہان کا پیار سمیٹے اسے دیکھ رہا تھا، صرف اس ایک نگاہ سے پوری رات کی کلفت اور اب تک کی تھکان نجانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ تبھی شاہ جہاں نے کہا

''ارجمند۔! مبارک ہو، قلعہ کانگڑہ فتح ہو چکا۔''

یہ سنتے ہی ممتاز محل نے اچانک اٹھ کر بیٹھنا چاہا مگر شاہ جہاں نے اسے قابو میں رکھا اور اسے یونہی لیٹے رہنا دیا۔

''آپ کو بھی مبارک ہو۔'' ممتاز محل نے پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''کل ہری سنگھ قلعدار نے راجہ بکر ماجیت کو نہ صرف قلعے کی چابیاں دے دی ہیں بلکہ اپنے سارے راجپوت امراء کے سامنے اپنی بہن کے عقد کا وعدہ بھی کیا ہے؟ راجہ قلعے میں داخل ہو چکا ہے اور آج وہ اس کی بہن سے شادی کرے گا، میں نے فتح نامہ دربار شاہی میں بھجوا دیا ہے۔ میں اس لیے رات نہیں آسکا۔''

''کوئی بات نہیں، ایک رات کی جدائی کے عوض آپ کو اگر اتنی بڑی کامیابی ملتی ہے تو آپ کی کامیابیوں پر ایسی بے شمار راتیں قربان کرتی ہوں۔'' ممتاز محل نے پوری محبت سے کہا تو شاہ جہاں اس پر نچھاور ہو گیا۔

۱۵ ذی قعد ۱۰۲۷ھ، (۳ نومبر ۱۶۱۸ء) کی رات کا دوسرا پہر ختم ہونے کو تھا جب برہان پور کے نزدیک پرگنہ دوھود کے مقام پر شاہ جہاں کی چھٹی اولاد نے جنم لیا۔ شاہ جہاں نے فوراً یہ خبر جہانگیر تک پہنچائی۔ ساتھ میں رسم کے طور پر ایک ہزار اشرفی نذر کے لیے بھجوائی۔ جہانگیر نے اس کا نام ''اورنگ زیب'' رکھا۔ جس کا جشن ولادت صوبہ مالوہ میں اجین کے مقام پر ہونا طے پایا۔ اس جشن طرب میں جہانگیر خود اجین تک آیا۔ شاہ جہاں نے بیش قیمت جواہرات کے ساتھ پچاس ہاتھی نذر

پیش کیے۔

اورنگ زیب بہت پیارا بچہ تھا۔ ممتاز محل کو اس میں ایک نئی طرح کی الوہی کشش محسوس ہوا کرتی تھی۔ کالی آنکھوں والا وہ صحت مند بچہ اسے سب سے زیادہ قریب محسوس ہوا۔ نجانے کیوں اسے تمنا تھی کہ شاہی جوتشی جب اس کی کنڈلی بنائے تو اسے بھی پیشین گوئی معلوم ہو۔ مغلیہ خاندان میں ہر بچے کی پیدائش پر ایسی ہی جنم کنڈلی بنائی جاتی تھی۔ ممتاز محل نے کبھی بھی دلچسپی نہیں لی تھی مگر وہ اس بار چاہتی تھی۔ شاید ماں کو اپنے بچے کے بارے میں پہلے ہی سے احساس ہو جاتا ہے۔

جہانگیر کے ذاتی ستارہ شناس جاتک رائے نے اپنی پیشین گوئی بتائی۔ ''یہ بچہ غیر معمولی قسمت رکھتا ہے۔ اس کا ستارہ بتاتا ہے کہ یہ عظیم فرمان روا ہوگا کہ اتنی بڑی سلطنت پر حکمرانی کرے گا جواب آپ کے پاس ہے۔ اس سے بھی زیادہ، اس کی زندگی پر سورج کی حکمرانی ہے۔ یہ دنیا کو بدلنے کی قوت واستطاعت رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھوں بہت بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔''

سبھی نے جاتک رائے کی پیشین گوئی سن لی۔ تبھی شاہ جہاں نے دھیرے سے ممتاز محل کے کان میں کہا

''ایسی پیشین گوئی تو جہاں آراء کے بارے میں بھی ہوتی تھی......لیکن انہیں کیا معلوم، ستارے زندگی نہیں بدلتے، انسان بدلتے ہیں۔ ہر پیشین گوئی اتنی اچھی کیوں ہوتی ہے۔''

شاہ جہاں نے یہ بات محض مذاق میں کہی تھی جبکہ ممتاز محل کی نگاہوں نے دور تک دیکھ لیا۔ اس نے اورنگ زیب کے ننھے منھے سے معصوم چہرے کو دیکھا اور پیار سے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اسے ممتا کی اک نئی طرح کی تسکین کا احساس ہوا تھا۔

شاہ جہاں پر شہنشاہ جہانگیر کی نوازشات دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اسی باعث اس کی ذاتی دولت اور ثروت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شاہ جہاں اور ممتاز محل آگرہ میں تھے اور پرسکون دن گذارنے کا لطف لے رہے تھے۔ بہت عرصے بعد ممتاز محل کو اپنے قائم کردہ شفاخانے کو بہتر بنانے کا موقع ملا تھا۔ اس نے نہ صرف اس شفاخانے کی توسیع کی بلکہ

اسے مزید بہتر بنایا۔ اس میں ایک الگ سے شعبہ صرف عورتوں کے لیے مختص کیا تا کہ ان کا بہتر طور پر علاج ہو سکے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے مدرسے کھلوائے جہاں بنا کسی تفریق مذہب بچوں کو تعلیم دی جانے لگی۔ اسے غریب بچوں کی تعلیم کا خیال اس وقت آیا جب اس کے اپنے بچوں کی تعلیم کا آغاز کیا گیا تھا۔ ممتاز محل اس وقت تک سات بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ ساتواں بچہ امیر بخش تھا جو ۵ محرم ۱۰۲۸ھ (دسمبر ۱۶۱۹ء) میں کشمیر کی سیر پر جاتے ہوئے سحر نہ مقام پر پیدا ہوا تھا۔ ان میں حورالنساء محض تین سال اور ایک ماہ زندہ رہی تھی۔ اسے اجمیر میں دفن کیا گیا تھا۔ یہ ممتاز محل کی پہلی اولاد تھی۔ اس کے بعد سارے بچے بقید حیات تھے۔ وہ اپنی اولاد اور خدمت خلق میں مصروف تھی لیکن محل میں ہونے والی سر گرمیوں سے بھی خوب واقف تھی۔

ان دنوں ملکہ نور جہاں کا نام چار دانگ عالم میں خوب پھیل گیا تھا۔ مہر اوزک کے ساتھ امور سلطنت میں اسے پوری طرح دخل تھا۔ کیونکہ شہنشاہ جہانگیر صرف اسی کی سنتا اور اسی کی بات مانتا تھا۔ اپنی اسی اہمیت کی بنا پر وہ دن بدن طاقتور ہوتی چلی جارہی تھی۔ وہ چاہتی تو ٹیکس گھٹ جاتے یا بڑھ جاتے، سرکاری اہلکاروں کی تعیناتی یا بے دخلی ہو جاتی۔ معیشت، قانون اور داخلی اموراس کے منشاء و مرضی کے مطابق بنتے یا بگڑتے تھے۔ بہت ساری سزائیں نور جہاں کی مرضی پر یا تو موقوف ہو جاتی یا انہیں دے دی جاتیں۔ ان دنوں صرف ملکہ نور جہاں ہی حکمرانی کر رہی تھی۔ وہی آواز جہانگیر کے کانوں تک پہنچ پاتی جو نور جہاں پہنچانا چاہتی ورنہ باقی سب فضاؤں میں گم ہو جاتی تھیں۔

ممتاز محل کو نور جہاں کی اس طاقت، ثروت اور اہمیت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے اگر مطلب تھا یا اسے جس سرگوشی سے دلچسپی ہو سکتی تھی تو وہی تھی جن میں اس کے محبوب شوہر کا ذکر ہوتا۔ ہوسکتا تھا کہ نور جہاں اس کے شوہر کے خلاف کوئی بات کرتی لیکن خود جہانگیر اس پر مہربان تھا۔ اس کے علاوہ اعتماد الدولہ اور آصف خاں کی پوری مدد شاہ جہاں کے ساتھ تھی۔ اس لیے نور جہاں نے شاہ جہاں کے بارے میں اپنی کسی بھی رائے، رویہ یا مشورہ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی حکمرانی اور سلطنت پر تسلط کے لیے مہرے منتخب کر چکی تھی اور انہی کے ذریعے چالیں چل رہی تھی۔ نور جہاں کے ان مہروں میں سے ہر ایک مہرہ اپنی جگہ اہمیت رکھتا تھا اور بہت سوچ سمجھ کر انہیں چل رہی تھی۔

اگرچہ وقت دھیرے دھیرے گذر رہا تھا لیکن سلطنت کے ایوانوں میں نئی طرح کی سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔ جسے ممتاز محل نے اپنی ذہانت اور تدبر سے بھانپ لیا۔ پھر ایک رات جب شاہ جہاں اس کی خواب گاہ میں آیا تو وہ اس سے بات

کرنے کے لیے پوری طرح تیار بیٹھی تھی۔

''کیا آپ اپنے امور اور دلچسپیوں کے علاوہ بھی ادھر ادھر نگاہ رکھتے ہیں؟'' ممتاز محل نے پوری سنجیدگی سے کہا

''ہوسکتا ہے بہت ساری باتیں میری نگاہ سے اوجھل رہی ہوں، اگر تمہیں ان کا احساس ہے تو بتاؤ۔'' شاہ جہاں نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''میری مراد ملکہ نور جہاں کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور سازش سے ہے۔''

''ارجمند۔! یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔''

''لیکن کچھ معاملات ایسے ہیں جو نئی سمتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔''

''مثلاً۔!''

'' آپ کو تخت تک پہنچنے میں کوئی حائل طاقت ہوسکتی ہے تو وہ صرف ملکہ نور جہاں ہے، کچھ دنوں سے اس کی مہربانیاں خسرو پر بڑھ رہی ہیں۔ اگرچہ وہ قید میں نہیں محض نظر بند ہے لیکن اس کا محل میں اور خصوصاً ملکہ نور جہاں کے پاس بہت زیادہ آنا جانا ہوگیا ہے۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ خسرو کبھی میری راہ میں حائل تھا۔ اب بھی اس کی جانب سے خطرہ ہوسکتا ہے لیکن اتنا بھی نہیں۔ اس وقت جبکہ حضرت شہنشاہ کی صحت دن بدن گرتی چلی جا رہی ہے اور ان کی صحت کا بھی اس قدر امکان نہیں ہے۔ ایسے وقت ایوان اقتدار میں ہلچل تو ہوگی۔ دراصل سب سے بڑا مسئلہ ولی عہدی کا ہوتا ہے۔ اس بارے سب جانتے ہیں کہ میں ہی ہوں ہندوستان کی اس سلطنت کا وارث۔''

''میرے محبوب۔! میں مانتی ہوں کہ اس وقت ایوان اقتدار دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک طرف ملکہ نور جہاں، آپ اور عبدالرحیم خان خاناں وغیرہ ہیں اور دوسری طرف مہابت خاں...... آپ سوچیئے، مہابت خاں کے پاس کون سی اتنی بڑی طاقت ہے لیکن اگر وہ سامنے کھڑا ہے تو اس کے پاس کچھ ایسا ہوگا جو وہ نور جہاں کے مقابلے پر موجود ہے اور وہ خسرو کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ خسرو تنہا نہیں ہے اس کے عقب میں شاہی بیگمات موجود ہیں۔ ایسے وقت میں نور جہاں کی خسرو پر عنائتیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی ہیں۔''

''ہوسکتا ہے وہ مہابت خاں کا زور توڑنے کے لیے خسرو پر عنائتیں کر رہی ہو۔''

''ممکن ہے ایسا ہو، ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن......! لیکن میرے محبوب آپ بتاؤ کیا اقتدار پسند نور جہاں آپ کو مطلق العنان شہنشاہ کے عہدے پر پسند کر سکتی ہے؟ آپ کی وراثت اور ولی عہدی کے بارے میں ملکہ نور جہاں بھی جانتی ہے اور عمائدین سلطنت بھی۔ نور جہاں یہ کوشش کرے گی کہ آپ کے مقابلے میں کسی کو بھی لے آئے۔ وہ خسرو کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''

''ارجمند، تمہاری باتیں ٹھیک ہیں، خیال انگیز بھی ہیں، میں اس کا خیال رکھوں گا۔'' شاہ جہاں نے پرسوچ انداز میں کہا اور پھر اسی موضوع پر باتیں چلتی رہیں۔

......☆......

اس وقت شاہ جہاں صبح کی سیر سے واپس لوٹا تھا، اس کا رخ حمام کی جانب تھا کہ اسے خدمت پرست رضا خاں محو انتظار کھڑا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ شاہ جہاں ٹھٹک گیا۔

''رضا۔! کوئی اہم معاملہ ہے؟''

''جی شہزادہ معظم۔! محل سرا کی ایک کنیز آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہے۔''

''کہاں ہے وہ، اسے حاضر کیا جائے۔'' شاہ جہاں نے کہا اور قریب پڑی مسند پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد کامل تخلیے میں وہ کنیز سامنے آ گئی۔

''بولو۔!'' شاہ جہاں نے حکم دیا۔

''حضور۔! رات ملکہ عالیہ نے شہزادہ خسرو اور ان کی بیگم کی دعوت کی تھی۔ اس پرتکلف دسترخوان پر ملکہ کی بیٹی لاڈلی بیگم بھی موجود تھیں۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لیے رکی اور پھر جھجکتے ہوئے کہا۔'' ملکہ عالیہ نے اس موقع پر شہزادہ خسرو سے یہ کہا ہے کہ وہ اس کی بیٹی سے شادی کر لیں۔''

''کیا۔! تم یہ بات ہوش میں تو کہہ رہی ہو؟'' شاہ جہاں نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے کہا۔

''جی شہزادہ بلند اقبال۔ میں درست کہہ رہی ہوں۔'' کنیز نے لرزتے ہوئے کہا۔

''کیا اس موقع پر شہزادہ خسرو کی بیگم موجود تھی؟'' شاہ جہاں نے سوچنے والے لہجے میں پوچھا

''جی حضور۔! اس کے علاوہ ملکہ عالیہ نے شہزادہ خسرو کو یہ پیشکش بھی کی ہے کہ اگر وہ اس کی دامادی میں آ جاتا ہے تو

وہ اسے ولی عہد نامزد کروا دے گی۔''

''اس پر شہزادہ خسرو نے کیا کہا؟''

''وہ خاموش ہو گئے تھے۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا لیکن ان کی بیگم نے جواب میں کہا تھا کہ وہ شادی کر لیں، تب شہزادہ خسرو نے سوچ کر جواب دینے کو کہا ہے۔''

''اور کچھ۔؟'' شاہ جہاں نے پوچھا

''اہم باتیں یہی تھیں جو میں نے حضور کے گوش گذاری ہیں۔'' کنیز نے باادب جھک کر کہا تو شاہ جہاں نے اپنی خلعت سے اشرفیوں کی تھیلی نکالی اور کنیز کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

''اب تم جا سکتی ہو، مگر آنکھیں اور کان کھلی رکھنا، جو بھی خاص بات ہو فوراً آگاہ کرنا۔ ہم تمہیں اسی طرح نوازتے رہیں گے۔''

کنیز نے اشرفیوں کی تھیلی تھامی اور جھک کر کورنش بجا لائی اور پھر انہی قدموں پر واپس پلٹ گئی۔ شاہ جہاں سوچ میں پڑ گیا۔ کتنے ہی لمحے یونہی گذر گئے۔

''حضور۔! اگرچہ شہزادہ خسرو کی ایک ہاں، سلطنت مغلیہ میں انقلاب برپا کر سکتی ہے لیکن ابھی تو صرف ملکہ عالیہ کی طرف سے ابتداء ہے۔ اس کا سدباب کیا جا سکتا ہے۔'' رضا نے حوصلہ دیتے ہوئے ادب سے کہا

''ایسا کرنا ہی ہو گا رضا۔! اب بلاشبہ میرے اور ملکہ عالیہ کے راستے جدا ہوں گے۔ تم بھی حالات پر کڑی نگاہ رکھنا۔ یہ ہمارے لیے نازک ترین لمحے ثابت ہو سکتے ہیں۔''

''جیسے آپ کا حکم شہزادہ معظم۔'' رضا نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا تو شاہ جہاں اٹھا اور حمام کی طرف بڑھ گیا۔ اسے ممتاز محل کی باتیں یاد آ رہی تھیں جسے وہ وقت سے پہلے ہی محسوس کر چکی تھی۔

اسی شام وہ اپنے سسر اور سلطنت مغلیہ میں کلیدی عہدے پر فائز آصف خاں سے ملا۔ ملکہ نور جہاں کے معاملے کی ساری روداد بتا کر ان سے مشورہ مانگا۔ وہ کتنی دیر تک سوچتا رہا اور پھر بڑے گھمبیر لہجے میں بولا

''مہر النساء۔! مہر النساء ایک نئے فتنے کی بنیاد ڈال رہی ہے۔ شاید اسے احساس نہیں کہ اس کے اثرات کہاں تک جائیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ایسا کر گذرے گی اور بادشاہ سلامت اس عمل میں کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔ ان کا دل و

دماغ اس وقت مہرالنساء کے قبضے میں ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر خسرو نے مہرالنساء کی بیٹی سے شادی کر لی تو وہ اسے ولی عہد بنا کر ہی دم لے گی۔اس نے یہ قدم یونہی نہیں اٹھایا ہوگا۔اس کے پیچھے بہت گہری سوچ لگتی ہے۔'' آصف خاں نے شاہ جہاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

''آپ بھی ان حالات پر نگاہ رکھو اور میں بھی دیکھتا ہوں۔کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکلے گی۔'' آصف خاں نے کہا اور پھر وہ اسی موضوع پر باتیں کرتے چلے گئے۔

بساط کسی وقت بھی الٹ سکتی تھی۔شاہ جہاں کے لیے یہ گھڑیاں انتہائی نازک اور خطرناک تھیں۔اقتدار دونوں شہزادوں کے درمیان پڑا تھا، وقت شہزادہ خسرو کا ساتھ دے رہا تھا کہ قوت اس کے ساتھ تھی۔شاہ جہاں اپنے سارے چاہنے والوں کے ساتھ ایسے کنارے پر کھڑا تھا جسے حالات کی ہوائیں کہیں بھی لے جا سکتی تھیں۔یقین اور بے یقینی کی کیفیت اس طرح اچانک سامنے آئی تھی کہ اسے اپنا مستقل تاریکی میں دکھائی دے رہا تھا۔وقت کی بساط پر کھیل جاری تھا، شاہ جہاں، ملکہ نور جہاں، مہابت خاں اور اب آصف خاں اس میں شامل ہو چکا تھا۔

امید اور ناامیدی کے انہی دنوں میں اچانک شہنشاہ جہانگیر کو دکن سے خوفناک خبر موصول ہوئی۔پھر اس کے ساتھ ہی خان خاناں کا عریضہ موصول ہوا کہ وہ نظام الملک، قطب الملک اور عادل خاں کے اتحادی لشکر کے باعث پسپا ہو کر برہان پور میں مجبوراً آ گیا ہے۔رسد، غلہ اور کمک نہ ہونے کے باعث لڑائی جاری نہیں رکھ سکتے۔لہٰذا دشمن حوصلہ مند ہو گیا ہے۔اگر انہیں محاصرے سے نہ نکالا گیا تو بہادر راجپوتوں کی طرح جوہر کی رسم ادا کرتے ہوئے اپنی جان دے دیں گے۔اس خبر سے جہانگیر غضب ناک ہو گیا۔اس نے فوراً ہی ایک لشکر جرار دکن کی طرف روانہ کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا اور اسے شاہ جہاں کی قیادت میں بھیجنے کا حکم دیا۔جیسے ہی شاہ جہاں کو یہ حکم ملا تو ایک لمحہ کو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

کیا وہ دارالسلطنت میں ہونے والی سازشوں کو یونہی چھوڑ کر دکن چلا جائے تاکہ وہ کھلاڑی اطمینان سے اپنا کھیل جاری رکھ سکیں۔اس کی عدم موجودگی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ قدرت کی طرف سے اشارہ ہے۔آپ ان حالات سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔'' ممتاز محل نے شاہ جہاں سے کہا تو وہ چونک گیا۔

''مگر کیسے۔؟''

''ابھی تک شہزادہ خسرو نے ملکہ نور جہاں کی پیشکش کا جواب نہیں دیا۔ اگر وہ انکار کر دیتا ہے تو ملکہ ناراض ہو جائیں گی اور اگر ہاں کہتا ہے تب سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ کیوں نا آپ شہزادہ خسرو کو اپنے ساتھ برہان پور لے جائیں۔ وہ آپ کے ساتھ رہیں گے تو یہ مسئلہ نہیں ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو لیکن کیا بادشاہ سلامت اسے میرے حوالے کر دیں گے؟''

''اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ انہیں اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں یا نہیں۔''

''مجھے ایسا کرنا ہی ہوگا، خسرو کو اپنے ساتھ لے جانا ہی ہوگا۔'' شاہ جہاں نے عزم سے کہا اور ممتاز محل کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا۔

برہان پور کے لیے لشکر کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شاہ جہاں کے منظور نظر سرداروں راجا بکرماجیت، افضل خاں، عبداللہ خاں، خواجہ ابوالحسن، لشکر خاں، سردار خاں، سید نظام کے علاوہ احادی اور برقندازوں کی فوج ساتھ میں کر دی تھی۔ انہی سرداروں میں خواجہ ابوالحسن کی نگرانی میں خسرو تھا۔ شاہ جہاں اپنے ساتھ خسرو کو برہان پور لے جانے کے لیے بادشاہ سلامت سے بات کرنے کی سوچ رہا تھا کہ ایک شام وہی کنیز آ حاضر ہوئی۔

''شہزادہ معظم۔! آپ کے لیے خوشخبری ہے۔''

''بولو۔!''

''شہزادہ خسرو نے وہ طاقتور ہاتھ جو اسے شاہی تخت تک لے جا سکتا تھا۔ جھٹک دیا ہے۔ خسرو نے ملکہ عالیہ کی تجویز مسترد کر دی ہے اور لاڈلی بیگم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔''

''کیا تو سچ کہہ رہی ہے۔'' بے اختیار شاہ جہاں کے منہ سے نکل گیا۔

''حضور۔! میں غلط اطلاع پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتی۔''

''تو اس کا مطلب ہے شہزادہ خسرو نے اپنی نامرادی کا ہاتھ تھام لیا ہے۔ خیر۔!'' شاہ جہاں نے کہا اور اشرفیوں کی تھیلی کنیز کی طرف پھینک دی۔

اگلے دن جہانگیر ابھی جھروکہ درشن سے واپس آیا ہی تھا کہ شاہ جہاں اس کے پاس پہنچ گیا۔

''خرم۔! مغلیہ لشکر کی تیاری اب کس مرحلے پر ہے۔''

''شہنشاہ معظم۔! لشکر کوچ کے لیے تیار ہے۔''

''ہاں۔! دکن کے معاملات کو تم بخوبی سمجھتے ہو۔ تم ہی ان کی سرکوبی کر پاؤ گے۔''

''جہاں پناہ۔! تمام تیاریاں مکمل ہیں اور میں ایک آدھ دن میں روانہ ہو جاؤں گا۔ تاہم میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''بولو خرم۔! وہ کیا باتیں ہیں؟'' شہنشاہ نے تجسس سے پوچھا

''خواجہ ابوالحسن لشکر مغلیہ کے ساتھ جا رہے ہیں اور بھائی خسروان کی نگرانی میں ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ کیوں نا میں بھائی خسرو کو اپنے ساتھ ہی دکن لے جاؤں۔''

''تمہیں ایسا خیال کیوں آیا؟'' شہنشاہ نے قدرے حیرت سے پوچھا

''جہاں پناہ۔! ہم دونوں بھائیوں کے درمیان غلط فہمیاں ہی پروان چڑھتی رہی ہیں۔ جنہیں کبھی ختم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اگرچہ انہیں اپنے کیے کی سزا ملی ہے لیکن سازش کی ناکامی کا موجب وہ مجھے ہی قرار دیتے چلے آ رہے ہیں۔ ایسے حالات میں ہم دونوں کے درمیان جذبہ خیر سگالی نہیں رہا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر میں انہیں ساتھ لے جاؤں۔ ان سے مشورے لوں اور اپنا اعتماد بحال کروں۔ اتنے سالوں میں وہ بھی اب آمادہ سازش نہیں ہوئے۔ آخر وہ بھی تیموری خون ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح ساتھ رہنے سے ہم دونوں کے درمیان بہت ساری غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور بلاشبہ جذبہ خیر سگالی بھی پیدا ہو جائے گا۔'' شاہ جہاں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں مضبوط دلیلیں دے کر ادب سے کہا تو جہانگیر نے انتہائی جذباتی انداز سے اس کی جانب دیکھا۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد کہا

''تمہاری باتیں ٹھیک ہیں خرم۔! جاؤ اگر ملکہ نور جہاں کو اعتراض نہ ہو تو تم اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔''

''بہت شکریہ جہاں پناہ۔!'' شاہ جہاں نے مسرت کے ساتھ ادب سے جھکتے ہوئے کہا'' آپ نے میرا مان رکھ لیا اور مجھ پر اعتماد کر کے مہربانی کی۔'' اس نے کہا اور پھر دونوں میں دکن کی مہم کے سلسلے میں کافی دیر تک باتیں چلتی رہیں۔

یہاں تک شاہ جہاں واپس آ گیا۔

......☆......

وہ موسم سرما کے آغاز کے دن تھے۔ سہ پہر ہونے کو تھی۔ ممتاز محل اپنی خواب گاہ کے جھروکے میں بیٹھی ہوئی دریائے جمنا کی لہروں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے ہمیشہ سے دریا کی روانی بہت اچھا لگا کرتی تھی۔ خرام، مستی اور سکون کے ساتھ آگے ہی بڑھتے چلے جاتا۔ اگر چہ اس نے دریائے تاپتی میں قدرے سرکشی دیکھی تھی تاہم وہ سکون جو دریائے جمنا کو دیکھتے رہنے سے حاصل ہو رہا تھا وہ دریائے تاپتی میں نہیں تھا۔ دریائے جمنا اور اس کے پار دور تک پھیلا ہوا میدان۔! لوگ، پرندے، صاف نیلا آسمان کس قدر سکون بخش ہوتا ہے یہ منظر۔ ایسے لمحوں میں لاڈلی بیگم کی آمد ہوئی۔ وہ بہت خوبصورت ہو گئی تھی اس کے چہرے پر قدرے پختگی اور آنکھوں میں بے باکی تھی۔ لیکن اس سب کے ساتھ اس کے چہرے پر غصہ اور ناراضگی جھلملا رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے آبیٹھی۔ ممتاز محل اس کی طرف چند لمحے دیکھتی رہی اور پھر پوچھا

''کیا بات ہے لاڈلی۔ تمہارا چہرہ تمہارا ساتھ نہیں دے پا رہا ہے۔''

''میری شادی ہو رہی ہے............!'' اس نے بغیر کسی تاثر کے یوں کہا جیسے وہ کسی کے بارے میں بات کر رہی ہو۔

''تو اس پر تمہیں خوش ہونا چاہیے، جبکہ تم یوں دکھائی دے رہی ہو جیسے تمہیں شادی کرنا پسند نہیں۔''

''میرے چاہنے یا نا چاہنے سے کیا ہوتا ہے، ہوگا تو وہی جو میری ماں چاہے گی۔ وہ ایک گھنا درخت ہے جس کی چھاؤں تلے کوئی اور پودا............''

''لاڈلی۔! کیا تم خوش نہیں ہو؟''

''نہیں۔! میری ماں صرف اپنی حکومت اور اقتدار مستحکم کرنے کے لیے میری قربانی دے رہی ہے۔ میں شہریار کو پسند نہیں کرتی مگر میری ماں کی خواہش ہے کہ میں اس سے بیاہ دی جاؤں اور اس نے تیاریاں بھی کر لی ہیں۔''

''شہریار۔؟''

''ہاں شہریار۔'' وہ شہزادہ ہونے کے باوجود بھی ایسی صلاحیت سے محروم ہے جس سے شہزادگی ظاہر ہو اور پھر مجھے اس سے قطعاً محبت نہیں ہے۔ میں اسے ایک شوہر کی حیثیت سے قبول کر ہی نہیں سکتی۔''

''تو پھر انکار کر دو۔!''

''ارجمند۔! تم جانتی ہو کہ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ آج اگر میرا باپ زندہ ہوتا......زندہ ہوتا تو شاید یہ حالات ہی نہ ہوتے......تم ارجمند! تم میری ماں سے کہہ دو، تم اس وقت طاقتور ہو۔ وہ تمہاری بات سنے گی......''

''لیکن تمہاری ماں۔! ملکہ نور جہاں میری بات کیسے سن پائے گی۔شہزادہ شہریار کے متبادل کوئی اور بھی تو نہیں ہے......؟''

''یہی تو دکھ ہے......میں کیا کروں؟''

''تم مایوس مت ہو، میں کوشش کروں گی۔'' ممتاز محل نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔وہ جانتی تھی کہ یہ محض تسلی ہو سکتی ہے ورنہ جو فیصلہ ملکہ نور جہاں نے کرلیا ہے وہ اسے ضرور پورا کرے گی۔وہ اپنے فیصلے کو نہیں بدلا کرتی تھی اور ایسا ہی ہوا۔لاڈلی بیگم کی شادی شہزادہ شہریار سے طے ہوگئی۔

''پہلے میں ...... پھر خسرو...... اور اب شہریار...... ملکہ نور جہاں نے شہزادوں پر ہی نظر رکھی، چاہے وہ جیسے بھی ہوں۔'' شاہ جہاں نے ممتاز محل کے پہلو میں لیٹتے ہوئے کہا۔

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں میرے محبوب۔'' ممتاز نے خوشگواریت سے کہا

''یہی کہ شہریار ایک ایسا شہزادہ ہے جس کی زندگی بہت محدود سی ہے۔وہ نہ تو مرد میدان ہے اور نہ ہی سیاسی سوجھ بوجھ کا مالک، پھر ملکہ نور جہاں اس پر اپنی امیدوں کے چراغ کیوں روشن کررہی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ وہ اسے شہنشاہ کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے۔''

''بلاشبہ ارجمند۔! کیا تم نے محسوس نہیں کیا؟''

''میں جانتی ہوں۔! ابھی تو اس نے ایک راہ پکڑی ہے لیکن وہ کس حد تک جائے گی آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔وہ آپ کے راستے میں ضرور حائل ہوگی، تخت تک پہنچنے میں رکاوٹ بنے گی چاہے آپ شہنشاہ کے چہیتے، باصلاحیت اور قابل فرزند ہو۔''

''مگر کب تک، وہ اپنے دشمن بڑھائے گی۔''

''آپ جانتے ہیں کہ حکمرانی بھی شطرنج کے کھیل کی طرح ہے، جس کی چال کامیاب ہو، وہی مات دیتا ہے۔کبھی کبھار پیادوں سے بھی شہہ پڑجاتی ہے۔حقائق کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔؟

''مطلب۔!''

''یہی کہ مہر النساء کے ہاتھوں شہنشاہ پوری طرح قابو میں ہیں اور وہ بیمار ہیں۔اقتدار ملکہ نور جہاں کے پاس ہے اور

اب شہزادہ شہر یار اس کا داماد ہے۔اور ہم......!''

''اس سے تو حالات بہت حد تک بدل سکتے ہیں۔''

''بدل سکتے نہیں، بدل گئے ہیں میری جان، ہمارے لیےامن وسلامتی کا زمانہ شاید اب نہیں ہوگا۔تخت حاصل کرنے کی بجائے شاید اب تخت سے بچنے کے لیے بھاگ دوڑ کرنا پڑے۔نور جہاں، مہابت خان، شہر یار اور خود جہانگیر۔!''

''ہاں۔!اور شاید شہزادہ خسرو بھی......!جس کے نام پر مہابت خان سیاست کر رہا ہے۔''

''ارجمند۔!تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''محض انتظار۔! جیسے ہی آپ یہاں سے دکن کے لیے کوچ کریں گے یہ شادی ہو چکی ہوگی، حرم سرا میں یہ خبر گھوم رہی ہے کہ شہنشاہ کشمیر جانا چاہتے ہیں......''

''کیا انہیں ملکہ نور جہاں کے ارادوں کی خبر ہے......''

''ہاں ہے۔انہوں نے ہی تو اجازت دی ہے۔مجھ تک یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ ملکہ کہہ رہی تھی کہ اس اجازت کے بعد شہنشاہ نے کہا تھا کہ نور جہاں تم ملکہ اور تمہاری بیٹی شہزادی............''

''تو اس کا مطلب ہے وہ تمہیں نظر انداز کر گئی ہے۔وہ شاید نہیں جانتی کہ ممتاز محل ہی شہزادی ہے اور وہ ملکہ بنے گی کیونکہ وہ شاہ جہاں کی بیوی ہے۔'' شاہ جہاں غصے میں بڑبڑایا۔تب ممتاز محل نے اس سے کسی دوسرے موضوع پر باتیں چھیڑ دیں تاکہ اگلے دن کسی مناسب وقت پر بات ہو سکے۔

لاڈلی بیگم اور شہزادہ شہر یار کی شادی ہوگئی۔جس کے چند دن بعد ہی یکم صفر ۱۰۳۰ھ (۲ دسمبر ۱۶۲۱) کو مغلیہ لشکر شاہ جہاں کی قیادت میں روانہ ہوا۔حسب معمول ممتاز محل اس کے ساتھ تھی اور شہزادہ خسرو بھی۔

روانگی سے تھوڑی دیر قبل آصف خاں سے شاہ جہاں کا آمنا سامنا ہوا تو اس نے کہا۔

''شاہ جہاں۔!قسمت تیرا ساتھ دے رہی ہے۔اپنی خوش قسمتی کا ایک بھی لمحہ ضائع نہیں کرنا۔قدرت مہربان ہے اور اس نے تجھے موقع دے دیا ہے۔اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا مگر عجلت مت کرنا، جو فیصلہ بھی کرنا ہو، انتہائی سوچ سمجھ کر مناسب گھڑی میں، صحیح وقت پر کرنا۔میں یہاں تمہارے معاملات کی بہتر نگرانی کر پاؤں گا، حوصلے بلند رکھنا......''

شاہ جہاں مسکرا دیا۔

اسی مہم کے دوران ۲۰ رجب ۱۰۳۰ھ (۱۰ جون ۱۶۲۷) کی رات شاہ جہاں کی آٹھویں اولاد نے ممتاز محل کے بطن سے جنم لیا۔ اس شہزادی کا نام ثریا بانو رکھا گیا۔

دکن کی شورشوں اور بغاوتوں پر قابو پا کر شاہ جہاں پرسکون ہو گیا تھا۔ اس نے حکیم علیم الدین کے ہاتھوں ان فتوحات کا جو فتح نامہ شہنشاہ جہانگیر کے حضور بھیجا تھا، اس کے جواب میں تحسین آفرین اور انعامات کے ساتھ جوابی عنایت نامہ موصول ہو چکا تھا۔ بظاہر حالات پرسکون اور معمول کے مطابق چل رہے تھے لیکن شاہ جہاں محسوس کر رہا تھا کہ اس قدر خاموشی میں طوفان پوشیدہ ہوسکتا ہے۔ آگرہ سے آنے والی خبروں میں اس احساس کو تقویت مل رہی تھی۔ شہنشاہ جہانگیر کا مرض پھر سے عود کر آیا تھا۔ وہ دمے کی وجہ سے اس قدر بیمار ہو گیا تھا کہ امور سلطنت سے پوری طرح عاجز آ گیا۔ اس پر کثرت منشیات کا استعمال اسے ٹھیک نہیں ہونے دے رہا تھا۔ حکیم اور اطباء پوری کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن مرض تھا کہ افاقہ ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس ساری صورت حال کو ملکہ نور جہاں نے اپنی دسترس میں لے لیا تھا۔ ملکہ کی اقتدار پسند طبیعت کے باعث نظام سلطنت بگڑ کر رہ گیا تھا۔ وہ بہت تیزی سے اپنا اقتدار مضبوط کر لینا چاہتی تھی اور اس مقصد کے لیے استعمال ہونے والے مہروں پر نوازشات اور عنایات کی بارش کر دی گئی تھی۔ ان میں شہزادہ شہریار بھی تھا جو ملکہ کی شہہ پر ولی عہدی کے خواب دیکھنے لگا۔ اس نے نہ صرف خواب دیکھے بلکہ عملی طور پر بھی نور جہاں کے مقاصد میں استعمال ہونے لگا تھا۔ آگرہ میں بیٹھا ہوا آصف خان ان تمام حالات سے باخبر تھا۔ ان اطلاعات کی بہم رسانی شاہ جہاں کو پوری طرح ہو رہی تھی۔

شاہ جہاں مرد میدان ہی نہیں مدبر سیاست دان بھی تھا۔ ایوان اقتدار میں ہونے والے فیصلوں اور محلاتی سازشوں سے پوری طرح واقف تھا۔ لیکن دارالسلطنت سے دوری اور مہمات میں گھرے ہونے کی وجہ سے وہ پوری طرح حالات کو اپنے قابو میں نہیں کر پا رہا تھا۔ دکن کی مہمات سے فراغت کے بعد اسے احساس ہوا کہ اسے دکن کی شورشوں پر قابو پانے کے لیے ہی نہیں بھیجا گیا بلکہ اسے دارالسلطنت سے دور رکھنے کی بھی کامیاب کوشش ہو چکی ہے۔ شاہ جہاں یہ سمجھ رہا تھا کہ ان حالات میں اسے دارالسطنت آگرہ میں ہونا چاہیے تھا۔

''رضا۔! کیا تم محسوس کر رہے ہو کہ دن بدن ملکہ نور جہاں اقتدار پر قابض ہوتی چلی جا رہی ہیں؟''

''جی شہزادہ حضور۔! میرے خیال میں آپ کا ان حالات میں آگرہ میں ہونا بہت ضروری ہے۔''

''شہنشاہ کی گرتی ہوئی صحت اور اطباء کی مایوسی بہت حد تک حالات کو نیا رخ دے رہی ہے۔ تاہم تمہارے خیال میں ہماری راہ میں ملکہ کس حد تک رکاوٹ بن سکتی ہے۔''

''حضور۔! جہاں تک مجھے علم ہے ملکہ نور جہاں اپنی سیاسی چال شہریار کے ذریعے چلے گی۔ کیونکہ وہ ابھی کم سن اور نااہل ہیں۔ انہیں محلاتی عیش وعشرت کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ ملکہ نور جہاں کو ایسا ہی کمزور حکمران چاہیے۔ جس کے ذریعے وہ حکمرانی کر سکیں۔ بلکہ۔! اپنی حکمرانی کو طول دے سکیں۔ دوسری جانب مہابت خان ہے جو خسرو کی حیثیت پر اپنے اقتدار کے نقشے مرتب کر رہا ہے۔ مہابت خانی سیاست کا بہترین مہرہ شہزادہ خسرو ہی ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ وہ عوام میں مقبول ہے اور محل کی بیگمات کی تمام تر ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ ایسے میں قدرت نے آپ کا ساتھ دیا اور شہزادہ خسرو آپ کے پاس ہے جس سے مہابت خاں کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ اس کے پاس ملکہ نور جہاں کی اطاعت کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ میرا گمان یہی کہتا ہے کہ وہ اسے آپ کے خلاف ضرور استعمال کرے گی تا کہ ملکہ کے حریفوں کا زور ٹوٹ جائے۔''

رضا نے پورے حالات کا تجزیہ کر ڈالا تو شاہ جہاں دھیرے سے مسکرا دیا۔ اس نے پورے خلوص کے ساتھ شاہ جہاں کو آنے والے طوفان سے باخبر کر دیا تھا۔

''ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''شہزادہ حضور۔! تیموری نعرہ یہی ہے کہ نا کہ تخت یا تختہ۔ آپ کے پاس بھی کوئی راستہ نہیں ہے سوائے تخت کے لیے کوشش کرنے کے ورنہ............!''

''تو تمہارا مطلب ہے۔ ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اب فیصلے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ اب جو کچھ بھی کرنا ہوگا! ہمیں ہی کرنا ہوگا۔''

''حضور۔! اس کے سوا ہمارے پاس چارہ بھی تو نہیں ہے۔ نظام درہم برہم ہے اور آپ کے چاہنے والے آپ کی راہ تک رہے ہیں۔''

شاہ جہاں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ باد مخالف میں اسے اپنا لائحہ عمل ترتیب دے دینا چاہیے۔

......☆......

انہی دنوں ایک سانحہ ہو گیا۔شاہ جہاں کی ساتویں اولاد شہزادہ اُمید بخش تقریباً دو سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔اس کی وفات ربیع الثانی ۱۰۳۱ھ (وسط فروری ۱۶۲۲) کو ہوئی۔اسے برہان پور کے قریب باغ فیروز میں دفن کر دیا گیا۔

......☆......

''حضور۔! شہزادہ خسرو نے گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے اور اب وہ اس قدر کم خوراک کھاتے ہیں کہ دن بدن نحیف و نزار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔'' اس اہلکار نے شاہ جہاں کے سامنے باادب انداز میں کہا جو خسرو پر متعین تھا۔

''وہ کس حال میں ہے اور ایسا کیوں کر رہے ہیں؟''

''ان پر مایوسی اور قنوطیت طاری ہے۔ان سے اگر وجہ دریافت کی جاتی ہے تو وہ بتاتے نہیں۔''

''ٹھیک ہے، ان کے لیے کچھ کرتے ہیں۔'' شاہ جہاں نے کہا تو وہ اہلکار اجازت لے کر چلا گیا۔شاہ جہاں تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر خدمت پرست خاں رضا بہادر کو طلب کیا۔

اس وقت شاہ جہاں اپنی قرمزی بارگاہ میں تھا جب رضا بہادر اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔اس وقت ممتاز محل بھی موجود تھی۔

''رضا بہادر۔! میں ان مہمات سے تھک چکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کچھ دنوں کے لیے شکار پر جایا جائے۔''

''آپ تھک چکے ہیں تو آرام کریں، شکار پر جانا تو تھکن اتارنے کے لیے موزوں نہیں۔'' ممتاز محل نے کہا تو شاہ جہاں مسکرا دیا۔

''اب تک میں مہمات ہی سر کرتا رہا ہوں۔لیکن اب مجھے شکار کرنا ہے۔کسی مہم کے دوران جنگ کرنا اور شکار پر جانے میں بہت فرق ہے۔تم سمجھ رہے ہو رضا بہادر۔!'' شاہ جہاں نے ممتاز محل کو جواب دیتے ہوئے رضا سے کہا۔

''جی ہاں حضور۔!''

''تو ہمارے شکار پر جانے کا بندوست کیا جائے۔میرے ساتھ ممتاز محل بھی ہوگی۔میں شکار کروں گا اور یہ حسین قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوگی۔'' شاہ جہاں نے کہا اور ممتاز محل کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھا۔

حکم شاہی کے باعث دو دن میں شکار کے لیے انتظامات ہو گئے۔ رضا نے سارے انتظامات ہو جانے اور روانہ ہو جانے کے لیے پوچھا تو شاہ جہاں نے کہا۔

''رضا۔! میرے بھائی خسرو پر مایوسی اور قنوطیت طاری ہے۔ وہ کچھ کھا پی نہیں رہے۔ انہیں بہت زیادہ حفاظت اور صحت کی ضرورت ہے۔ ان کا خیال رکھنا۔''

''جی بہتر حضور۔!'' رضا نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔! بہت ہو چکا، اب ان کی طرف سے کوئی شکایت نہیں آنی چاہیے۔ ہمیشہ کے لیے ان کا بندوبست کر دو۔ اسی میں ہماری عافیت ہے۔''

''جب آپ واپس آئیں گے تو شہزادہ خسرو کوئی بھی شکایت نہیں کر پائیں گے۔'' رضا بہادر نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں۔! بہت احتیاط سے، مناسب وقت اور صحیح گھڑی پر............!''

''جو حکم حضور۔!'' رضا نے دوبارہ جھکتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

شاہ جہاں شکار پر چلا گیا۔ چند دن بعد رضا بہادر نے اپنے قابل اعتماد ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور رات کے پہلے پہر اس حویلی جا پہنچا جہاں خسرو نظر بند تھا۔ اسے دیکھ کر پہرے دار ایک طرف ہٹ گئے اور اہلکار نے انہیں خسرو تک پہنچا دیا جو سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ رضا نے اہلکار کو واپس چلے جانے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر خسرو کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

''تم۔! کون ہو اور یوں میری خواب گاہ میں کیسے گھس آئے ہو۔'' خسرو نے تیزی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''رضا بہادر، خدمت پرست خان۔! آپ کی رہائی کا حکم نامہ لے کر آیا ہوں۔''

''تم یہ بتاؤ کہ یہ حکم نامہ شہنشاہ کی طرف سے ہے یا شاہ جہاں کی جانب سے۔''

''میرے پاس حکم شاہی ہے، نہیں معلوم کہاں سے آیا ہے۔''

''ہوں۔! تو یوں کہو، میرے تخت تک پہنچنے کی تمام تر کوششوں کے اختتام کا وقت آ گیا ہے اور اب تختہ میرے مقدر میں ہے۔'' خسرو نے ایک آنکھ سے رضا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ حالات کی ستم ظریفی ہی نہیں، مقدر کا لکھا ہے یا آپ کی قسمت میں ہی یوں تھا۔ بہر حال مجھے حکم شاہی پورا کرنا

ہے۔''

''حکم شاہی یا شاہ جہاں کی خواہش، کیونکہ میری طرف سے فقط اسے ہی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ میں اسی دن ہی سمجھ گیا تھا جب وہ مجھے لے کر آیا تھا۔ بہر حال اگر وہ ایرانی طوائف اپنے ارادوں سے باز رہتی تو شاید شاہ جہاں کو ایسے فیصلے نہ کرنے پڑتے۔ اس کی ہوس اقتدار اب نجانے کس کس کے خون سے سیراب ہوگی۔''

''مگر آپ بھی تو ولی عہدی سے دستبردار نہیں ہوئے۔ آپ نے نظر بندی کے دوران بھی......''

''بس۔! میں تخت تک نہیں پہنچ پایا یہ میری قسمت ہے، اب تم لوگوں کے پاس مجھے تختے تک پہنچانے کا جو بھی طریقہ ہے تم اس پر عمل کرو۔'' خسرو نے بستر پر واپس بیٹھتے ہوئے کہا۔ چند لمحے یونہی گذر گئے۔ تب رضا نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ چشم زون میں آگے بڑھے۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ خسرو کے گلے میں تانت کا پھندا ڈال دیا۔ پھر اس پھندے کو اس قدر کسا کہ شہزادے کی آنکھیں ابل پڑیں۔ کچھ دیر بعد خسرو کی گردن ڈھلک گئی اور جسم ساکت ہو گیا۔ رضا نے آگے بڑھ کر اس کی موت کا اطمینان کیا۔ پھر اسی وقت اپنے خاص پیام بر کے ہاتھ شاہ جہاں کو خسرو کی موت کی خبر بھجوا دی۔ وہ قریبی جنگلوں میں شکار کھیل رہا تھا۔ وہ اگلے دن ہی دوپہر سے پہلے واپس پہنچ گیا۔ شام تک انتہائی عزت وتکریم کے ساتھ اس کی آخری رسومات ادا کیں، شاہی وقار کے ساتھ جنازہ اٹھایا اور بدھ کی ہی رات عالم گنج باغ میں دفن کر دیا۔

اگلی صبح شاہ جہاں نے یہ اطلاع شہنشاہ جہانگیر کو روانہ کر دی کہ ۲۰ ربیع الثانی ۱۰۳۱ھ (۴ مارچ ۱۶۲۲ء) کو شہزادہ خسرو نے نظر بندی کے دوران خودکشی کر لی ہے۔

......☆......

اس وقت شاہ جہاں برہان پور کے محل میں تھا۔ دیوان عام میں مغلیہ لشکر کے سردار موجود تھے اور ان کے درمیان دارالسلطنت کی طرف کوچ کر جانے کے بارے میں گفتگو چل رہی تھی۔ شاہ جہاں جلد از جلد واپس آگرہ پہنچ جانا چاہتا تھا۔ تا کہ شہنشاہ کی عیادت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں سے بھی نبرد آزمائی چاہتا تھا جو اس کے تخت تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ ہر گذرتے ہوئے دن کے ساتھ ملکہ نور جہاں کی اقتدار پر گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ ان لوگوں کو یا تو قید کر رہی تھی یا پھر قتل جو کسی بھی حوالے سے شاہ جہاں کے چاہنے والوں میں سے تھے۔ خسرو کی موت کے بعد ملکہ کے فرامین واحکامات میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جن سے اس کے اقتدار کی مضبوطی کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسے

میں شہنشاہ جہانگیر کی طرف سے پیغام رساں آ گیا۔اس نے نہایت ادب سے شاہی فرمان شاہ جہاں کے گوش گذار کیا۔

''......تمہاری طرف سے بھیجی گئی اس اطلاع کو ہم نے انتہائی دکھ کے ساتھ سنا ہے کہ شہزادہ خسرو اپنے خالق حقیقی سے جاملا ہے۔ہمیں بہت افسوس ہوا۔ہم دل گرفتہ ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ اسے جنت کے اعلیٰ مقامات میں جگہ دے۔

قندھار کے معاملے میں ہم نے تمہارا یہ مشورہ قبول کرلیا تھا کہ اگر اس کے بعد بھی ایران اس طرح کے مطالبات کرتا رہا تو باہمی خیر سگالی کا کہاں تک لحاظ رکھا جائے گا۔اس پر اب یہ خبر مل چکی ہے کہ شاہ ایران شاہ عباس کی افواج قندھار کی فتح کے لیے نکل پڑی ہیں۔ہمیں ان کا راستہ روکنا ہے اس لیے ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم لشکر مغلیہ لے کر فوراً قندھار کی طرف بڑھو......''

شاہ جہاں نے یہ شاہی فرمان نہایت تحمل سے سنا اور پیام برکو آرام کرنے کے لیے کہہ دیا۔وہ بہت سوچ سمجھ کر اس فرمان کا جواب دینا چاہتا تھا۔یہ فرمان ایک طرح سے اس طوفان کا پیش خیمہ تھا جیسے وہ محسوس کر رہا تھا۔شاہ جہاں نے اسی دن کوچ کا حکم صادر کر دیا۔شہنشاہ کے فرمان میں یہ بھی شامل تھا لشکر مانڈو یا اجیر میں ٹھہر کر آگے بڑھے۔لہٰذا شاہ جہاں نے مانڈہ کی طرف رخ کرلیا۔

مانڈو کی فضاؤں میں پہنچنے تک آصف خاں کا پیامبر اس تک پہنچ گیا۔شاہ جہاں کو بھی اسی کا انتظار تھا، تاکہ اسی کے مطابق شاہی فرمان کا جواب دے سکے۔مانڈو پہنچنے تک وہ خاموش رہا۔اس صبح وہ قرمزی بارگاہ سے طلوع آفتاب کا نظارہ کر رہا تھا کہ ممتاز محل اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔وہ شاہجہاں کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں دیکھ رہی تھی۔

''میرے محبوب۔! میں نے اس سے پہلے کبھی آپ کے چہرے پر اتنی پریشانی نہیں دیکھی تھی۔''

''ارجمند۔!'' شاہ جہاں نے مڑتے ہوئے اس کے چہرے پر دیکھا اور کر بولا۔''ملکہ نور جہاں۔! یہی وہ خاتون ہے جو میری پریشانی کا باعث بن رہی ہے۔وہ لاہور میں بیٹھی ہوئی سلطنت کی بساط پر مہرے جما رہی ہے۔''

''کیا ابا حضور کی طرف سے کوئی پیام بر آیا؟''

''ہاں۔! آیا، اسی نے پوری صورت حال واضح کر دی ہے۔''

''کیا کہا اس نے؟'' ممتاز محل نے پریشانی سے پوچھا۔

''ملکہ نے سیاسی طور پر بہت مضبوط چال چلی ہے۔میں اس کی ذہانت کو داد دیتا ہوں۔جہانگیر لب دم ہے۔مہابت

خاں اس کے زیر اثر، شہر یار کی صورت میں ولی عہد اس کے پاس، اسے صرف شاہ جہاں کا زور توڑنا ہے اور اس کے لیے وہ پوری طاقت صرف کر رہی ہے۔"

"مطلب۔!"

"مطلب یہی ہے میری ارجمند بانو کہ میں اگر اپنی پوری فوجی قوت کے ساتھ قندھار روانہ ہو جاؤں تو مرکز اس کے لیے صاف ہوگا۔ خسرو انتقال کر چکا ہے اور شاہ جہاں ایرانی سرحدوں پہ، ایسے میں کون ہوگا جو شہر یار کو تخت پر بیٹھنے سے روک پائے گا۔ اور اگر۔! میں قندھار نہیں جاتا تو دوسری صورت میں باغی قرار دے دیا جا سکتا ہوں، جو اس کے لیے اور فائدہ مند بات ہے۔"

"اس طرح تو سب کچھ ختم ہو کر رہ جائے گا۔" ممتاز محل نے شاہ جہاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔! بہ ظاہر تو یہی دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ ملکہ نور جہاں اس بات پر تل گئی ہے کہ وہ مجھے باغی قرار دلوا کر رہے گی۔ تمہارے والد آصف خاں کے پیام بر نے بتایا ہے کہ ملکہ، قندھار والی مہم پر شہر یار کو روانہ کرنے کے لیے جہانگیر کو آمادہ کر رہی ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ میں کبھی بھی قندھار نہیں جاؤں گا۔"

مگر شہر یار میں تو یہ اہلیت ہی نہیں کہ وہ میدان جنگ میں............"

"ملکہ نے اس کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔ وہ اس کی اتالیقی پر مرزا رستم صفوی کو مقرر کر کے ساتھ میں بھجوا رہی ہے جو پہلے قندھار میں لڑ چکا ہے اور اس علاقے سے پوری شناسائی رکھتا ہے۔ وہ شہر یار کو لشکر کی کمان دلوانے پر اس قدر اصرار کر رہی ہے کہ اپنا سارا خزانہ بھی دے رہی ہے۔ جس میں تمہارے دادا اور اس کے باپ کی دولت بھی شامل ہے۔"

"ایسے حالات میں آپ شہنشاہ کے حضور کیا جواب دیں گے۔ اس طرح تو ہم بند گلی میں کھڑے ہیں۔"

"ہاں۔! سوچنا تو یہی ہے کہ شہنشاہ کے حضور کیا جواب ارسال کیا جائے۔" یہ کہہ کر وہ ممتاز محل کے قریب ہوا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے قدرے مسکرا کر بولا۔" سیاہ بادل چھا گئے ارجمند۔! طوفان آنے والا ہے ایسے میں خود کو تیار رکھنا ہوگا۔"

"آپ شاہ جہاں ہو۔ سیاہ بادل کیا زندگی کا حصہ نہیں ہوتے۔ مت گھبرائیں۔ یہ جیسے آتے ہیں ویسے ہی چلے جائیں گے۔"

''تم ارجمند۔! چاہو تو آگرہ چلی جاؤ۔! میرا پتہ نہیں کیا ہوگا۔حالات کس کروٹ......''

شاہ جہاں نے کچھ مزید کہنا چاہا مگر ممتاز محل نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

''ساتھ نبھانا ہے، حالات جیسے بھی ہوں۔ میرے محبوب، کیا آپ سمجھتے ہو کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ سکتے ہوں۔؟'' ممتاز محل نے جذباتی لہجے میں کچھ ایسے انداز سے کہا کہ شاہ جہاں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

اسی دن شاہ جہاں نے شہنشاہ کے حضور فرمان کا جواب بھجوا دیا۔اس نے لکھا کہ میں آپ کے حکم کے مطابق برہان پور سے کوچ کر کے مانڈو میں پہنچ چکا ہوں۔ یہیں برسات کا موسم گذارنے کے بعد قندھار کی طرف کوچ کر جاؤں گا۔ایسے موسم میں مالوہ کا علاقہ عبور کرنا بہت دشوار ہے۔ستارہ سہیل کے طلوع ہوتے ہی میں قندھار کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔اس سلسلے میں ایک عرض یہ بھی ہے کہ قندھار کی مہم ہندوستانی علاقوں سے بہت مختلف ہے۔ملتان سے قندھار کا فاصلہ اور رسد کے ذرائع، غلہ کی دستیابی کے علاوہ بہترین ساز و سامان اور مکمل اختیارات کی اشد ترین ضرورت ہوگی۔ مقابلہ شاہ عباس جیسے آزمودہ کار سے ہے لہٰذا لشکر کو پورے انتظامات کے ساتھ ہی میدان جنگ میں اتارا جا سکتا ہے۔اس کے لیے آپ ملتان، کابل اور پنجاب کے صوبے میری جاگیر میں دے دیں تا کہ میں رسد کے علاوہ اس قدر خزانہ اکٹھا کر لوں کہ سارے انتظام مکمل ہو جائیں۔اس کے علاوہ لشکر میں منصب داروں کے لیے مکمل اختیارات کا طلب گار ہوں۔

شاہ جہاں نے ایسی ہی باتوں پر مشتمل خط شہنشاہ کے حضور روانہ کر دیا۔

......☆......

سقوط قندھار ہو گیا۔

اس خبر کے ساتھ نیا شاہی فرمان بھی آ گیا۔اس فرمان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ایسا ہونا ہی تھا۔قندھار جو کہ اکبر کے زمانے سے ان کے قبضہ میں تھا، جہانگیر کے زمانے میں ہاتھ سے نکل جانے پر وہ اسی کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا، شاہ جہاں بھی سمجھتا تھا کہ یہ حقیقت بھی ہے کہ اس نے شہزادی گل بدن سے اپنا رویہ اچھا نہیں رکھا تھا، پھر اسی کے مشورے سے ایرانی ایلچی کو ناکام واپس لوٹا دیا گیا تھا اور پھر خود قندھار کی مہم پر نہیں گیا۔تاہم تازہ صورت حال کے مطابق ملکہ نور جہاں نے بھی اپنی خواہش اقتدار کے باعث رنگ آمیزی کی تھی کہ جہانگیر نے اسے لکھ بھیجا کہ تجھ ناخلف بیٹے کی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنے پڑے ورنہ اب بھی میرے نحیف بدن میں اتنی طاقت ہے کہ میں میدان جنگ میں اتر سکوں۔اب جہاں ہو، وہیں ٹھہرے رہو۔

مالوہ، احمد آباد اور دکن تمہاری جا گیر میں ہیں، ان میں جہاں تمہارا دل چاہے رہو، دربار کی طرف رخ نہیں کرنا۔تمہاری تمام جا گیریں بازیاب کر لی گئیں ہیں۔لہٰذا اب جتنی فوج تمہارے پاس دکن کی مہم کے لیے روانہ کی گئی تھی واپس بھیج دو۔اس حکم پر فوری طور پر عمل ہونا چاہیے ورنہ باغی قرار دے دیئے جاؤ گے۔

ایسا شاہی فرمان ملکہ نور جہاں کی جیت تھی۔اس پر مہر لاہور سے آنے والے آصف خاں کے پیام برنے لگا دی کہ جو جا گیریں شاہ جہاں کے نام تھیں بازیاب کر کے شہزادہ شہر یار کے نام کر دی گئیں ہیں۔اسے بارہ ہزاری منصب دے کر قندھار کے لیے رخصت کر دیا گیا ہے۔لہٰذا حالات پہلے والے نہیں رہے۔کسی وقت بھی تمہیں باغی قرار دیا جا سکتا ہے۔اس لیے نہایت ہوش مندی اور زیرکی سے معاملات کو دیکھو اور عمل کرو۔شہنشاہ بہت جلد لاہور سے آگرہ کوچ کر رہا ہے۔آصف خاں کے اس پیغام نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔اسے پورا یقین ہو گیا کہ اب سیاہ بادلوں میں سے طوفان نمودار ہونے ہی والا ہے۔

......☆......

پچھلی رات کا چاند مدہم ہو کر زرد ہو رہا تھا۔ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا میں نشہ گھلا ہوا تھا۔رات کے اس آخری پہر ممتاز محل کی آنکھ کھلی تو بستر پر شاہ جہاں نہیں تھا۔ایک لمحہ کو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔وہ فوراً اُٹھی اور اس نے پہرے دار خاتون کو بلایا جو باہر موجود تھی۔

’’کہاں ہیں۔؟‘‘ ممتاز محل نے پوچھا۔

’’انہوں نے نہیں بتایا۔‘‘ پہرے دار خاتون نے ادب سے کہا تو ممتاز نے مچلتے ہوئے تیزی سے کہا۔

’’فوراً پتہ کراؤ وہ کہاں ہیں۔‘‘

یہ کہہ کر وہ واپس بستر پر نہیں لیٹی بلکہ اضطراب کے عالم میں ٹہلتی رہی یہاں تک کہ شاہجہاں واپس آ گیا۔

’’تم پریشان ہو گئی تھی ارجمند؟‘‘

’’جی۔!‘‘ ممتاز نے اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے کہا، تب اس نے ممتاز کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

’’آؤ۔! بیٹھو۔‘‘ وہ اسے لیے بستر پر آ بیٹھا۔پھر نہایت سنجیدگی سے بولا۔’’آج ہماری روانگی ہے۔مجھے نہیں یقین کہ میرا شاہی لشکر سے کہاں آمنا سامنا ہو گا مگر تم نہیں رہو گی۔میں نے رضا بہادر کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔اس پر اعتماد کرنا اور

بچوں کا خیال رکھنا۔ میں اس مہم پر تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ یہ ایک خونریز جنگ ہے۔ جو اپنوں کے درمیان لڑی جائے گی۔''

''کاش یہ لڑائی نہ لڑی جائے۔!''

''اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ نور جہاں مجھے باغی قرار دلوا کر اپنا مقصد حل کر چکی ہے جبکہ میں شہنشاہ کے خلاف نہیں لڑنا چاہتا۔ میری تمام تر مراسلات بیکار گئی۔''

''اگر آپ کہیں تو میں شہنشاہ کے حضور جا کر............''

''نہیں ارجمند۔! ہم پر یہ جنگ مسلط کر دی گئی ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ یہ اپنوں کے خلاف لڑی جائے گی۔ مگر میں یوں اس سے فرار نہیں لوں گا۔ مجھے میدان میں اترنا ہی ہوگا۔''

''اس میدان جنگ میں اگر ہم جیت نہ سکے تو......''

''تو ہم سب کچھ کھو دیں گے اور تم ایک شکست خوردہ شہزادے کی شہزادی کہلاؤ گی۔'' شاہ جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر بولا ''اپنا دھیان رکھنا۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ ممتاز محل نے وضو کیا اور جائے نماز پر بیٹھ گئی۔ طلوع صبح کے ساتھ ہی فوج کے روانہ ہونے کا شور اٹھ گیا جو دوپہر تک رہا۔

ممتاز محل کو مانڈو ویران سا دکھائی دیتا تھا۔ شاہ جہاں کے بغیر سارا ماحول اداس تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بچے، ملازمین اور سپاہی اس کی حفاظت کے لیے تھے۔ رضا بہادر ان کی خدمت کے لیے مامور تھا۔ ممتاز سارا دن اپنے بچوں کے ساتھ مصروف رہتی۔ وہ معصوم شاہی سازشوں سے بے نیاز اپنی دنیا میں مگن تھے۔ دن پر دن گذرتے رہے اور خبر آئی کہ دریائے جمنا کے کنارے بلوچ پور اور قبول پور کے درمیان شاہی لشکر سے آمنا سامنا ہو گیا ہے۔ شاہی لشکر کی قیادت مہابت خان اور سلطان پرویز کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اگلے چند دنوں میں یہ خبر بھی آ گئی کہ شاہ جہانی لشکر کو شکست ہو گئی ہے۔ تاہم شاہ جہاں زندہ ہے اور میدان جنگ سے فرار ہو گیا ہے۔ اس خبر کے ساتھ ہی ممتاز محل دل گرفتہ ہو گئی۔

اس رات وہ دردزہ میں مبتلا تھی۔ رات تھی کہ ختم ہونے کو نہیں آ رہی تھی۔ طلوع صبح کے ساتھ ہی ممتاز محل کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ یہ ان کی نویں اولاد تھی۔ اسی روز یعنی ۲۵ اکتوبر ۱۶۲۳ء کو شاہجہاں مانڈو میں آ گیا۔ ممتاز نے اپنی محبت کا

ایک گلاب پیش کیا لیکن اس دور ابتلا میں وہ نومولود کا نام بھی نہیں رکھ پائے تھے کہ وہ مرجھا گیا۔شاہ جہاں نے اسے سادگی کے ساتھ دفنا دیا۔

......☆......

انتظار......انتظار......انتظار......

ممتاز محل کے شب و روز انتظار میں بسر ہو رہے تھے۔طلوع صبح سے رات ڈھلنے تک اور رات سے صبح تک اس نے شاہجہاں کا انتظار کیا تھا۔حالات بدلنے کے ساتھ ہی قسمت بھی بدل گئی تھی۔شاہی لشکر سے شکست کے بعد شاہ جہاں کو کہیں چین نصیب نہیں ہوا تھا۔شاہی لشکر اس کے تعاقب میں تھا اور وہ کہیں بھی جم کر بیٹھ نہیں پا رہا تھا تاکہ اپنے لشکر کو ترتیب دے کر از سر نو مستحکم کرے اور شاہی لشکر سے نبرد آزما ہو سکے۔ایک برس ہونے کو آیا تھا لیکن حالات میں کہیں بھی ایسا روزن دکھائی نہیں دیا تھا جس سے امید کی کوئی کرن دکھائی دیتی۔ان صبر آزما حالات میں ان سرداروں کی بے وفائی بھی سامنے آئی جو کبھی اپنی وفاداری میں جان نچھاور کرنے تک جاتے تھے۔شاہی لشکر سے شکست بھی اسی باعث ہوئی تھی۔دراب خاں نے اپنی فوج سمیت میدان جنگ سے ہٹ کر دوسرے سرداروں کو بھی میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔شاہجہاں مانڈو سے نکلا اور پھر اک دور آشوب تھا جس میں بہت سارے ہمراہی ساتھ چھوڑ گئے، کوئی بے وفائی کر گئے اور کسی نے جان نچھاور کر دی۔اسی دھوپ چھاؤں میں ۲۵ ذی قعدہ ۱۰۳۲ھ (۲۰ ستمبر ۱۶۲۳ء) کو دریائے تاپتی عبور کیا گیا۔تب ممتاز محل اس کے ساتھ تھی۔پھر یہ سفر چلتا چلا گیا۔یہاں تک کہ وہ قلعہ روہتاس میں آن ٹھہرے۔

ممتاز محل اسی قلعہ کے ایک محل میں انتظار کی کیفیت میں شاہ جہاں کی راہ تک رہی تھی۔اگرچہ اسے اپنے محبوب شوہر کی خیر و عافیت کی اطلاع مسلسل مل رہی تھی، جو اسے یہاں محفوظ ہاتھوں میں چھوڑ کر جونپور کی طرف بڑھ گیا تھا۔تاہم اس دور آشوب کے دوران مزید صبر آزما لمحات تھے کہ وہ اپنے محبوب سے جدا تھی۔جدائی کے یہ لمحے بڑے کٹھن تھے۔اس کا محبوب اس سے دور جنگ آزما تھا اور وہ تخلیقی عمل کے اس مرحلے پر تھی کہ جب وہ سفر نہیں کر سکتی تھی۔بس انتظار تھا۔اس کے علاوہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

قلعہ روہتاس کا انتخاب شاہ جہاں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔اس کا خیال ہی تھا جو قسمت سے پیدا ہو گیا تھا۔شاید یہ ممتاز محل کی قسمت تھی۔کیونکہ یہی قلعہ روہتاس ایک ایسا قلعہ تھا جسے انتہائی مضبوط اور ناقابل شکست گردانا جاتا تھا۔پٹنہ کے

مغرب میں ایستادہ یہ قلعہ کوہستان سے ملحق اور پہاڑی سلسلے میں تھا۔ چودہ دروازوں والا اور سولہ کوس کے محیط پر مشتمل یہ قلعہ اتنا بڑا تھا کہ محاصرے میں چارے اور غلے کی قلت نہیں ہوتی تھی۔ اس میں کھیت، چراگاہیں اور تالاب تھے جو سارا سال قلعے کے عوام کی ضروریات پوری کرتے رہتے تھے۔ راجہ مان سنگھ نے اسے اس قدر مضبوط بنا دیا تھا کہ اس پر گولہ باری ممکن نہیں تھی۔ اس قلعے پر بزور بازو کوئی بھی قبضہ نہیں جما سکا تھا۔ ممتاز محل اسی قلعے میں شاہجہاں کا انتظار کر رہی تھی۔

اس رات آخر ماہ کا چاند طلوع ہوا تو ممتاز محل دردزہ میں مبتلا تھی۔ ایسا وقت تھا کہ انتظار کی کیفیات میں شاہ جہاں کی جدائی کا دکھ بھی شامل تھا۔ گوستی النساء اس کے پاس موجود تھی۔ رضا خاں بہادر کو ایک آواز پر بلایا جا سکتا تھا مگر ممتاز محل کی افسردگی دور نہیں ہو پا رہی تھی۔ رات گزرتی رہی۔ ممتاز کی زندگی میں یہ ایک طویل ترین رات تھی۔ ۲۵ ذی الحجہ ۱۰۳۳ھ (۸ اکتوبر ۱۶۲۴ء) کا سورج طلوع ہونے سے قبل سپیدہ سحر میں شاہ جہاں کی دسویں اولاد نے ممتاز محل کے بطن سے جنم لیا۔ اس کا نام بڑی سادگی سے شہزادہ مراد بخش رکھا گیا۔

......☆......

''ارجمند۔! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا میں ہتھیار ڈال کر شاہی لشکر کا اسیر ہو جاؤں، میں لڑتے ہوئے اپنی جان دے سکتا ہوں مگر یوں بزدلوں کی طرح اپنا آپ ان کے حوالے نہیں کر سکتا۔'' شاہ جہاں نے ممتاز محل کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں یہ نہیں کہہ رہی کہ آپ ہتھیار ڈال دیں۔ تین سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے، ہم کب تک بھاگتے رہیں گے۔؟''

''اس کے علاوہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔'' شاہجہاں نے دھیرے سے کہا۔

''بہت کچھ ممکن ہے۔'' ممتاز محل نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیسے؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ سوچیں شاہی لشکر آخر اتنی شد و مد سے آپ کا تعاقب کیوں کر رہا ہے۔ اب جو اطلاعات آتی ہیں ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہی لشکر پھر سے اکٹھا کیا جا رہا ہے تا کہ آپ پر بھرپور حملہ کیا جا سکے۔ میں نہیں سمجھتی کہ یہ محض شہنشاہ کی خواہش ہو گی۔''

''ہاں ملکہ نور جہاں نہیں چاہتی کہ میں زندہ رہوں اس کی زبردست خواہش......''

''تو کیا ہم اس کی سازش کو پورا ہونے دیں۔ جو وہ چاہتی ہے ویسا ہو جانے دیں۔ جیسے لوہا کاٹنے کے لیے لوہا استعمال کیا جاتا ہے ویسے ہی اس کا کوئی اور راستہ نکالیں۔ یوں بار بار لڑائی سے یہ مسئلہ حل نہیں ہونے والا۔ اس روزن کو بند کرنا ہوگا جہاں سے سازش کی ہوائیں آ رہی ہیں۔''

''ہاں۔! بار بار کی لڑائی میں میرے لوگ ختم ہو رہے ہیں۔ راجہ بھیم سنگھ۔ بیرام خاں، میر بخشی، محمد تقی............! یہ سب سردار مجھ پر نثار ہو گئے ہیں۔ وہ ہزاروں سپاہی...... تم ٹھیک کہتی ہو۔ مسلسل جنگ اس کا حل نہیں۔''

''شہنشاہ جہانگیر کوئی غیر تو نہیں، آپ کے والد محترم ہیں، وہی باپ جو آپ پر عنایات اور نوازشات کی بارش برساتے رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ ان کا دل اس قدر سخت ہو گیا ہوگا۔ وقت اور حالات کی ستم ظریفی کے تحت اگر وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں تو آپ کا یہ فرض ہے وہ غلط فہمی دور کریں۔ اس کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ یہ میں نہیں جانتی۔ شہنشاہ کی غلط فہمی دور ہوتے ہی یہ دور آشوب ختم ہو جائے گا۔ وہ آپ کے باپ ہیں اور آپ یہ جانتے ہیں کہ وہ انصاف پسند ہیں۔ جونہی ان کے سامنے اصل صورت حال آ گئی، سب کچھ بدل جائے گا۔''

''ہاں ارجمند۔! دربار سے بہت ساری ایسی خبریں موصول ہو رہی ہیں جن میں حالات کی تبدیلی کا اشارہ ہے میں اس پر بھی سوچوں گا، ہمیں بہر حال حالات کو بدلنا ہے۔'' شاہ جہاں نے پر سوچ انداز میں کہا تو ممتاز محل کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔

وہ ان دنوں سنگ نیر میں خیمہ زن تھے۔ یہیں پر انہیں حالات بدلنے کے اشارے موصول ہوئے تھے۔ دربار شاہی میں آصف خاں کی طرح اور بہت سارے مخلص تھے جو اسے اطلاعات بھجوا رہے تھے۔ یہیں پر اسے پہلی خبر یہ ملی کہ مہابت خاں کو بنگال کا صوبیدار بنا کر بھیج دیا گیا ہے اور وہ جاگیر بھی اسے عطا کر دی گئی ہے پھر پتہ چلا کہ دراب خاں کو شاہی فرمان کے مطابق قتل کر دیا گیا ہے اور سلطان پرویز پر اعتماد کم کر دیا گیا تھا۔ دن گذرتے جا رہے تھے کہ انہی دنوں اسے یہ اطلاع ملی کہ شہنشاہ جہانگیر نے خان خاناں سے شاہ جہاں کے معاملے میں ندامت کا اظہار کیا ہے۔ شہنشاہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اصل حقائق کیا ہے لیکن باپ اور بیٹے کے درمیان ایسی فضا قائم ہو چکی تھی جسے دور کرنا مشکل تھا۔ تاہم ناممکن نہیں تھا۔ شہنشاہ صرف یہ چاہتا تھا کہ شاہ جہاں اس پر اعتماد کرے جس کے لیے کوئی ایسا عمل ہو جس سے شاہ جہاں کے اعتماد کا اظہار ہو سکے۔

وہ عمل یہی تھا کہ آسیر اور روہتاس کے قلعے اگر شاہی عالمین کو واپس دے دیئے جائیں اور شہزادوں کو بادشاہ کے حضور روانہ کر دیا جائے تو اعتماد کی فضا قائم ہونا ممکن تھی۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی شاہ جہاں کو حالات بدلنے کی موہوم سی امید ہوئی۔ اس نے فوراً ایک پیام برکو آصف خاں کی طرف روانہ کیا تا کہ اس اطلاع کی مزید تصدیق ہو سکے۔ تقریباً ایک ماہ بعد یہ تصدیق بھی ہوگئی۔ ان دنوں شاہ جہاں نہایت علیل تھا۔

’’ارجمند۔! حالات بدلنا ممکن ہو گیا ہے۔ شہنشاہ ہم پر اعتماد کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ہمیں اپنا دل، اپنی جان داؤ پر لگانا پڑے گی۔‘‘

بستر پر پڑے ہوئے شاہ جہاں نے محبت پاس نگاہوں سے ممتاز محل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’ایسا کیا ہے میرے محبوب۔!‘‘ ممتاز محل نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پیار سے پوچھا تو شاہ جہاں نے ساری بات ممتاز کو بتادی۔ اس پر اس نے نہایت تحمل سے کہا۔

’’میرا نہیں خیال کہ شہنشاہ شہزادوں کو ضمانت کے طور پر طلب کر رہے ہیں بلکہ اس تجویز میں ایک طرف اگر باپ کی محبت شامل ہے تو دوسری جانب پوتوں کو ملنے کی تڑپ ہے۔ دارا، اورنگ زیب، شجاع اور مراد اس کی نسل سے ہیں۔ اس کا خاندان......‘‘

’’ممتاز۔! میری محبت، کیا تم اولاد سے دوری برداشت کرلوگی۔‘‘ شاہ جہاں نے حیرت سے پوچھا

’’میں آپ پر اپنا سب کچھ وار سکتی ہو۔ اپنی جان، اپنی اولاد سب کچھ۔! میں نے آپ سے محبت کی ہے۔ اپنی محبت کو بچانے کے لیے کسی بھی شے کو وارا جا سکتا ہے۔ اور پھر اگر شہزادے درگاہ والا میں چلے جائیں گے تو وہ کسی غیر کے پاس نہیں، اپنے دادا کے پاس جائیں گے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہاں ان کی پذیرائی ہوگی۔ ایک دادا اپنے پوتوں کی پذیرائی کرے گا۔‘‘

’’اگر وہ تمہاری پھوپی کی اقتدار پسندانہ ہوس کی بھینٹ چڑھ گئے تو......‘‘

’’نہیں۔! آپ حوصلہ رکھیں اور شہنشاہ کے حضور ایک معافی نامہ ارسال کریں۔ یہ معافی نامہ خود شہزادے لے کر جائیں گے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ان معصوموں کو دیکھ کر شہنشاہ کے دل سے کدورت صاف نہ ہو۔‘‘

’’دیکھو ارجمند! وہ ہماری اولاد ہیں ہم......‘‘

''شاہ جہاں ۔! میرے محبوب ......حوصلہ، میری بھی وہ اتنی ہی اولاد ہیں۔لیکن اگران کے باعث امن اورسکون میسر آجائے تو ہمیں یہ سب کر لینا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے ارجمند۔!تم دارااوراورنگ زیب کودرگاہ والا میں جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرو۔میں ان کے کوچ کا بندوست کرتا ہوں۔'' شاہ جہاں نے کہا تو ممتاز نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے گالوں سے لگا لیا۔اس کی نگاہوں میں پہلے دن کی محبت روشن تھی۔

وہ ۳ جمادی الثانی ۱۰۳۵ھ (۲ مارچ ۱۶۲۶ء) کا دن تھا۔شہزادہ داراشکوہ اور شہزادہ اورنگ زیب درگاہ والا میں جانے کے لیے تیار تھے۔ممتاز محل نے انہیں بڑے چاؤ سے تیار کیا تھا۔دونوں شہزادے ایک ہی طرح کی دستار باندھے، اپنے باپ کے حضور میں آئے تو ایک لمحہ کے لیے شاہ جہاں کا دل کانپ گیا۔وہ اپنے جگر گوشوں کو شہنشاہ کے حضور روانہ کر رہا تھا، جہاں دوست کم اور دشمن زیادہ تھے۔شاہ جہاں نے انہیں بہت غور سے دیکھا۔دونوں شہزادوں کے چہروں پر متضاد تاثرات تھے۔دارا اپنے باپ سے جدا ہوتے ہوئے رنجیدہ تھا جبکہ اورنگ زیب بااعتماد دکھائی دے رہا تھا۔شاہ جہاں کافی دیر تک انہیں دیکھتا رہا پھر علامہ سعداللہ خاں پر نظر ڈالی۔وہ ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔اس نے معافی نامہ پر ایک بار دوبارہ نظر ڈالی۔اس نے لکھا تھا۔

''ظل الٰہی، جہاں پناہ،شہنشاہ ہندوستان،ابوالمظفر نورالدین جہانگیر بادشاہ کی خدمت اقدس میں شہزادہ شاہ جہاں کی طرف سے۔میں آپ کا بیٹا،آپ سے معافی کا خواست گار ہوں۔میری کوتاہیاں جو بھی رہی ہوں اوران کی وجوہات جیسی بھی تھیں، میں اس پر ندامت محسوس کرتے ہوئے حضور والا سے معافی چاہتا ہوں۔میں آپ کے سایہ عاطفت میں امن اورسکون سے رہنا چاہتا ہوں۔میری زندگی آپ کے لیے وقف ہے۔آپ جیسا چاہیں میں حاضر خدمت ہوں۔مجھے امید ہے کہ میری سابقہ کوتاہیوں کو معاف کر دیا جائے گا۔''

''معافی نامہ براہ راست شہنشاہ کے حضور دیا جائے،اسے ملکہ نور جہاں کی وساطت سے نہ بھجوانا۔'' شاہ جہاں نے معافی نامہ علامہ سعداللہ خاں کے حوالے کرتے ہوئے کہا

''اگر ملکہ نے اس کی اجازت نہ دی تو............؟''

''ابھی وہ اتنی طاقتور نہیں ہوئی کہ شہزادے درگاہ والا میں حاضر ہوں اور میرا پیغام براہ راست بادشاہ تک نہ پہنچ

سکے۔''

''مجھے معلوم ہے شہزادہ معظم! لیکن دربار کے حالات ایسے ہیں۔ میں بہرحال کوشش کروں گا کہ بہت اچھی خبر لے کر لاہور سے واپس آؤں۔''

اسی دن دوپہر سے قبل علامہ سعداللہ خاں کی رہنمائی میں دونوں شہزادے عازم درگاہ ہوئے۔ ان کے ساتھ دولاکھ روپے، مرصع آلات، جواہر، کوہ پیکر ہاتھی بھی روانہ کیے تاکہ جب وہ شہنشاہ کے حضور پیش ہوں تو نذر کے طور پر دے سکیں۔ اس کے ساتھ ہی حکم جاری کیا کہ قلعہ روہتاس اور آسیر کے نگہبان ان دونوں قلعوں کو شاہی عمال کے سپرد کر کے خدمت میں حاضر ہو جائیں۔

......☆......

ان دنوں شاہ جہاں نے ناسک سے ٹھٹھہ کی طرف کوچ کیا تھا۔ اس دوران درگاہ والا سے پیام بر آیا۔ وہ جو اطلاعات لے کر آیا تھا وہ خوشگوار ہوا کا جھونکا تھا۔ اس وقت شاہ جہاں قرمزی بارگاہ میں تھا جب پیام بر کو ملاقات کا اذن ہوا۔ ممتاز محل پردے کے پیچھے ان کی گفتگو سننے کے لیے موجود تھی۔

''کیا خبر لائے ہو؟''

''حضور۔! درگاہ شاہی میں شہزادوں کی پذیرائی بہت شاندار ہوئی ہے۔ اس سے دربار میں یہ قیاس آرائی ہے کہ شہنشاہ معظم نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ شاہی لشکر کو آپ کے تعاقب میں روک دیا گیا ہے کیونکہ اس پر ابھی غور کیا جا رہا ہے کہ آپ کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کیا جائے۔ حضرت آصف خاں کو امید ہے کہ حالات آپ کے حق میں موافق ہوں گے۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ شہزادوں کی پذیرائی کس طرح ہوئی؟'' شاہ جہاں نے بے تابی سے پوچھا۔

''جی حضور والا۔!'' یہ کہہ کر اس نے روداد سنائی۔ ''لاہور پہنچتے ہی شہزادوں کو اذن باریابی مل گیا تھا۔ شہنشاہ خود ان سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ سیدھے محل میں نہیں گئے بلکہ شہزادوں والی آن بان اور وقار کے ساتھ دربار میں حاضر ہوئے۔ جب شہنشاہ دربار میں فروکش ہوئے تو وہ اس مقام پر موجود تھے جو شہزادوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ انہیں دیکھ کر شہنشاہ تخت سے اتر کر آگے بڑھے تھے اور دونوں کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔''

''پھر۔!'' شاہ جہاں نے تیزی سے پوچھا۔

''پھر انہیں سینے سے لگائے کافی دیر یونہی رہے اور انہیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھا لیا۔ تب شہزادوں نے بادشاہ کے حضور نذر پیش کی۔ اس وقت بادشاہ بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ نذر قبول کر لی گئی۔ پھر ان سے آپ کے اور ممتاز محل کے بارے میں پوچھتے رہے کہ ان کا کیا حال ہے کافی دیر تک دربار میں رہنے کے بعد انہیں حرم سرا بھجوا دیا گیا۔''

''کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ان کی وجہ سے حالات تبدیل ہو جائیں؟''

''جی حضور۔! حضرت آصف خاں نے نہ صرف بہترین حالات کی پیش گوئی کی ہے بلکہ آپ کو نہایت صبر و تحمل اور برداشت کے ساتھ رہنے کی تلقین کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ وقت جنگ کا نہیں سیاست کا ہے اور سیاست ہمیشہ ٹھنڈے مزاج سے کی جاتی ہے۔''

''بس یا اور کچھ۔؟''

''نہیں حضور۔! بس اتنا ہی پیغام تھا۔''

''ٹھیک ہے تم آرام کرو اور جب جانا چاہو تو آگاہ کر دینا۔'' شاہ جہاں نے کہا تو وہ جھک کر کورنش بجا لایا اور واپس چلا گیا۔ شاہ جہاں اپنے خیالوں میں کھو چکا تھا۔

......☆......

۱۴ صفر ۱۰۳۶ھ (نومبر ۱۶۲۶ء) کو شاہ جہاں کے چمن میں ایک اور پھول کھلا۔ ممتاز محل کے بطن سے یہ گیارہویں اولاد تھی۔ ان نومولود کا نام لطف اللہ رکھا گیا۔ اس کی جنم بھومی ٹھٹھہ تھی۔ جہاں سے بائیس روز بعد شاہ جہاں نے ناسک کے لیے کوچ کیا تھا۔

......☆......

ممتاز محل اپنے محبوب شوہر اور بچوں کے ساتھ دارالخیر خبیر میں قیام پذیر تھے۔ ماحول اور حالات میں سکوت تھا جیسے بارش سے پہلے ہوا منجمد ہو جاتی ہے۔ وہ دس سالہ دارا اور سات سالہ اورنگ زیب کو بہت یاد کرتی تھی۔ اس قدر ان کی یاد آتی کہ وہ رو دیتی تھی۔ لیکن اپنی اس حالت کے بارے میں شاہ جہاں کو خبر نہیں ہونے دیتی تھی۔ جہاں آراء اپنے باپ کے ساتھ بہت مانوس تھی۔ دن گذرتے چلے جا رہے تھے۔ دربار شاہی سے موافق ہوائیں چل رہی تھیں۔ شہنشاہ کشمیر کی طرف گیا ہوا

تھا۔مہابت خان جو کبھی شاہ جہاں کا دشمن بن چکا تھا اب شاہ جہانی پناہ میں آ گیا تھا۔

پھر ایک دن پیام بر آ گیا۔ وہ سردیوں کے دن تھے۔اس کے ساتھ چند گھڑ سوار تھے۔اس کے پاس ایک سادہ سا پیغام تھا کہ آخر ماہ صفر سن ایک ہزار سینتیس ہجری کو شہنشاہ ہندوستان بادشاہ جہانگیر کا راجور میں انتقال ہو گیا ہے اور انہیں لاہور میں دفن کر دیا گیا ہے۔

ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہ جہاں بادشاہ، ۷ جمادی الثانی ۱۰۳۷ھ (۱۴ فروری ۱۶۲۸ء) کو تخت نشین ہو گیا۔

سہ پہر سے تھوڑی دیر قبل شہنشاہ شاہ جہاں دربار سے اٹھ کر حرم سرائے شاہی میں آیا۔ دور تک کنیزوں اور ملازماؤں کی قطار تھی۔شاہ جہاں نے جونہی قدم اندر رکھے، کنیزوں کی قطار کے بالکل آخر میں حرم سرا کی بیگمات کے جلو میں ممتاز محل کھڑی دکھائی دی۔اس کی محبت پاش نگاہیں فرش راہ ہو رہی تھیں۔شاہ جہاں کے ہر اٹھتے ہوئے قدم کے ساتھ اس کے چہرے پر خوشیوں کا ایک نیا رنگ جھلک رہا تھا۔شاہ جہاں کو اس کے چہرے پر جوالوہی تاثر دکھائی دیا تھا اسے وہ لفظوں میں نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ تاثر وہی تھا جو ایک چاہنے والا دوسرے چاہنے والے کو بنا کوئی لفظ کہے دے سکتا ہے۔ایسا تبھی ممکن ہے جب کسی کو پورے خلوص سے چاہا جائے۔شاہ جہاں اس کے سامنے جا کر رک گیا۔ممتاز محل نے پوری نگاہوں سے اسے دیکھا اور کنیز کو آگے بڑھنے کے لیے کہا۔کنیز نے ایک بڑا سا تھال اٹھایا ہوا تھا جس میں اشرفیاں دھری ہوئیں تھیں۔ممتاز محل نے دونوں ہاتھوں سے وہ اشرفیاں اٹھائیں اور شاہ جہاں کے سر سے وار کر نچھاور کر دیں۔ وہ مسلسل ایسا کرتی رہی یہاں تک کہ اشرفیوں بھرا تھال ختم ہو گیا۔تبھی دوسری کنیز آگے بڑھی اس کے تھال میں روپے تھے۔ممتاز محل نے وہ بھی وار دیئے۔ اگلا تھال لعل و جواہر کا تھا۔ممتاز محل نے وہ بھی شاہ جہاں پر نچھاور کر دیئے۔ ایسا کافی دیر تک سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ وہ تھک گئی۔ اس نے ایک ایسی نگاہ سے شاہ جہاں کو دیکھا کہ وہ نگاہ ان اشرفیوں، روپوں اور لعل و جواہر سے زیادہ قیمتی تھی۔شاہ جہاں مسکرا دیا۔ممتاز محل شرما کے ہٹ گئی تو جہاں آرا کی باری آ گئی۔ یہ سلسلہ غروب آفتاب تک چلتا رہا۔

اوائل ماہ کا چاند روشن تھا جس کی روشنی نے ہر شے میں خمار بھر دیا تھا۔رات کے دوسرے پہر کی شروعات تھیں اور

ایسے میں شاہ جہاں اور ممتاز محل، شاہی باغ میں موجود تھے۔ دبیز مسند پر براجمان یہ محبت کے متوالے خاموش تھے۔ دریائے جمنا سے آنے والی ہوا میں قدرے ٹھنڈ تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ برداشت نہ ہو سکے۔ موسم بہار کی پیام بر یہ ہوا خمار آلود تھی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ یوں جیسے خاموشی بھی ایک زبان رکھتی ہو۔

''ارجمند۔! تمہیں یاد ہے ہماری پہلی ملاقات اسی باغ میں ہوئی تھی۔ یہاں مینا بازار تھا، تم موجود تھی، چاندی کے زیورات تمہاری دوکان پر سجے ہوئے تھے۔'' شاہ جہاں نے سکوت توڑا۔

''ہاں۔! مجھے وہ رات ہی نہیں، اس کا ایک ایک لمحہ بھی یاد ہے، میں اس لمحے کو کیسے بھول سکتی ہو جس نے مجھے محبت سے متعارف کرایا تھا۔''

''وقت کتنی تیزی سے گذر جاتا ہے۔ اس وقت میں کچھ بھی نہیں تھا مگر کتنا خوش تھا۔ آج میں ہندوستان کا شہنشاہ ہوں مگر خوشی کا وہ احساس میرے پاس نہیں ہے۔ میں کتنا بدل گیا ہوں۔ لیکن ارجمند۔! ایک بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، تم نہیں بدلی ہو، تمہاری محبت نہیں بدلی، وہ اس وقت بھی میری حوصلہ افزاء تھی اور آج بھی ہے۔''

''میرے محبوب۔! میں آج اگر ملکہ ہندوستان ہوں تو وہ آپ کی وجہ سے، میں ایک عام سی لڑکی تھی اور میرے خواب بھی ایک عام سی لڑکی کی طرح تھے۔ ہمارے اعمال ہمیں تبدیل کرتے ہیں، لیکن میں چاہوں بھی تو میری محبت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ میں خود وہی لڑکی رہنا چاہتا ہوں جسے آپ کو پہلی بار دیکھ کر محبت ہوئی تھی۔ اب تو یہی میری زندگی ہے۔''

ممتاز محل حرف بحرف سچ کہہ رہی تھی۔ جب سے وہ شاہ جہاں کی زندگی میں آئی تھی تب سے اس کی محبت و وفاداری اور جنوں ایسے تھا جیسے شفاف پانی۔ شاہ جہاں ایک لمحے کے لیے بھی اس پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ اسے پوری طرح احساس تھا کہ ممتاز نے اس کی شہزادگی کو اہمیت نہیں دی تھی، اس طرح وہ اس کی بادشاہت کو بھی اہمیت نہیں دے گی۔ کیونکہ وہ اسے چاہتی ہے۔ اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ بس اس سے محبت کرتی چلی جا رہی ہے، بالکل اس سنیاسی کی طرح جو اپنی تپسیا میں مصروف ہوتا ہے۔ اقتدار سے رغبت نہ ہونے کے باوجود ہر نازک موقع پر وہ شاہ جہاں کے ذہن کو متوازن رکھتی تھی۔ حالات جس طرح کے بھی درپیش رہے وہ اپنی عقل، سوجھ بوجھ اور مدبرانہ فہم سے ایسے مشورے دیتی رہی جس سے سیاہ بادلوں جیسے ماحول کو دور ہونے ہی بڑی مدد ملی تھی۔ شاہ جہاں جیسے ضدی شہزادے کو سیاسی انداز میں سوچنے اور معاملات کو سلجھانے میں جو حوصلہ اور اعتماد چاہیے تھا وہ ممتاز محل نے اسے دیا۔ وہ اس کی مونس وغم خوار، خوشی اور غمی میں ہم رکاب رہی

تھی۔

''ممتاز۔! مجھے تمہاری محبت پر ناز ہے۔''

''یہ میری خوش قسمتی ہے اوراس سے مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ میری محبت رائیگاں نہیں گئی۔''

''مجھے یہ احساس ہے ارجمند۔! کہ تم اپنی پھوپھی ملکہ نور جہاں کی طرح اقتدار پسند نہیں ہو۔لیکن اب تم ملکہ ہندوستان ہو، کیا تم اس موقع پر مجھ سے کچھ نہیں مانگو گی؟''

''اس وقت آپ میرے نزدیک ہیں، میں اس سے زیادہ اور کیا مانگ سکتی ہوں، مجھے مانگے بنا ہی سب مل رہا ہے۔''

''کوئی خواہش۔!''شاہ جہاں نے اصرار سے پوچھا

''نہیں۔!''یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکی اور ہنستے ہوئے تیزی سے بولی۔''آپ کو یاد ہے کہ میں نے چاندی کے زیور آپ کو بیچے تھے۔''

''ہاں۔!وہ میرے پاس اب بھی ہیں۔تمہاری محبت کی پہلی نشانی کے طور پر۔!''

''پتہ ہے ان روپوں سے میں نے کیا کیا تھا۔''

''شفاخانہ۔!''

''ہاں۔! میں چاہتی ہوں، اس طرح کے شفا خانے جن میں صرف غریبوں، محتاجوں اور مسکینوں کا علاج ہو سکے پورے ہندوستان میں موجود ہوں، آپ اپنے خزانے سے روزانہ اتنی رقم مختص کر دیں جنہیں غریبوں اور محتاجوں خصوصاً بچیوں کی شادی کے سلسلے میں خرچ کی جائے۔بس یہی میری خواہش ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا ارجمند۔''شاہ جہاں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر بولا''شہر یار اگرچہ شکست کھا چکا ہے لیکن وہ تمہاری پھوپھی کی شہہ پر اب بھی ولی عہدی کا دعویدار ہے۔اس عورت نے ہمیں پانچ سال تک دشت نوردی پر مجبور کر دیا تھا۔میں......''

''انہیں معاف کر دیں۔''ممتاز نے تیزی سے کہا۔''حکم دے دیں کہ بس انہیں نظر بند کر دیا جائے۔''

''مگر ممتاز وہ اپنی سازشوں سے باز نہیں آئیں گے۔وہ ہماری حکمرانی کے لیے مسلسل خطرہ بنے رہیں گے۔ان کا

صاف ہو جانا ہی وقت کی اہم ضرورت ہے۔"

"مگر معاف کر دینا اس سے افضل ہے۔ کچھ وقت گذر جانے دیں، ان کی ساری سرگرمیاں ماند پڑ جائیں گی، اس کے ساتھ لوگ بھی ان کی وفاداری چھوڑ دیں گے۔"

"میں ان کی سرگرمیوں سے نہیں گھبراتا، لیکن ملکہ نور جہاں کی طاقت......اس طاقت ور کہ بتانا چاہتا ہوں کہ اقتدار کو لہو سے سینچ کر طول نہیں دیا جاتا۔"

"نہیں میرے محبوب، انہیں نظر انداز کر دیں۔ وہ ہمارے رشتے دار ہیں۔"

"حکمرانی میں رشتہ داری نہیں چلتی۔"

"پھر بھی نہیں میرے لیے معاف کر دیں۔"

"لیکن اگر انہوں نے کوئی ایسی کوشش، سازش یا سرگرمی دکھائی جس سے میری حکمرانی پر زد پڑتی ہو تو......؟"

"پھر وہ آپ کی مرضی ہے، ایک شہنشاہ کو بہت بڑے حوصلہ والا ہونا چاہیے۔" ممتاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہر حال میں آپ کو شہنشاہ ہندوستان بننے پر مبارک باد دیتی ہوں۔"

"اور تمہیں مبارک ہو کہ تم ملکہ ہندوستان بن گئی ہو۔"

دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ قہقہہ بلند ہوا جو دریائے جمنا کی طرف سے آنے والی ہواؤں میں تحلیل ہو گیا۔

وہ دونوں خواب گاہ میں پہنچ گئے۔ بستر پر جانے سے قبل شاہ جہاں نے ممتاز محل کو کاندھوں سے پکڑا اور چاندی سے بنی مرصع میز کے قریب لے آیا۔ اس پر طلائی صندوقچہ پڑا ہوا تھا۔

"آؤ ارجمند۔! میں تمہیں تحفہ دینا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے وہ صندوقچہ اٹھایا اور ممتاز محل کے ہاتھوں میں دے دیا۔ "اسے کھولو۔!"

"یہ کیا ہے؟"

"تم اسے کھولو۔"

ممتاز محل نے اس صندوقچے کو کھولا تو اس میں مہر اوزک پڑی ہوئی تھی۔ شاہ جہاں کا یہ تحفہ بہت قیمتی تھا۔ سلطنت مغلیہ کی طاقت کی علامت۔ یہ صرف اس کو دیا جاتا تھا جس پر اعتماد عظیم ہوتا تھا۔

''میں نے یہ کئی سال پہلے ملکہ نور جہاں کے پاس دیکھی تھی۔''

''اب یہ تمہارے پاس ہوگی۔تم مہر اوزک رکھوگی، یہ میری طاقت کی علامت ہے اور تم پر اعتماد کا اظہار۔''

ممتاز محل چند لمحے مہر اوزک کو دیکھتی رہی، پھر صندوقچہ بند کر کے شاہ جہاں کی طرف بڑھا دیا۔اور بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی

''آپ شہنشاہ ہندوستان ہو میرے محبوب، میں نہیں۔ میں ملکہ نور جہاں کی طرح اقتدار پسند نہیں اور نہ ہی حکمرانی کرنا چاہتی ہوں۔ یہ کام آپ کا ہے میرا نہیں۔''

شاہ جہاں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور کہا ''ایک ملکہ کی حیثیت سے تمہارا فرض ہے۔ اس مہر کو تمہیں ہی سنبھالنا ہوگا۔''

ممتاز محل نے ایک آہ بھری اور آنکھیں بند کر کے اس کے حکم ماننے کا اشارہ دے دیا۔

......☆......

وقت بہت سکون واطمینان، خاموش اور مہربانی سے گزرتا چلا گیا۔ممتاز محل اپنی اولاد کے ساتھ آگرہ میں مقیم رہی۔ شاہ جہاں کے سیاسی معاملات، امور سلطنت اور طرز حکمرانی کیا ہے انہیں توجہ سے دیکھتی ہوئی اپنی ازدواجی زندگی میں مگن تھی۔اس کے گیارہ بیٹے بیٹیوں میں سے پانچ فوت ہو چکے تھے۔ باقی سات بیٹے اور بیٹیوں کے ساتھ وہ خوش تھی، جہاں آراء، داراشکوہ، محمد شجاع، روشن آرا، اورنگ زیب، لطف اللہ اور ثریا بانو۔ کچھ عرصہ بعد ثریا بانو کے بدن پر آبلے پڑ گئے اور اسی عارضے میں وہ فوت ہوگئی۔ شاہ جہاں اور ممتاز محل کو اس کی موت پر بہت دکھ ہوا۔ پھر چند دن بعد ہی ۴ رمضان المبارک (۹ مئی ۱۶۲۸ء) کو سلطان دولت افزاء کی ولادت ہوئی۔ یہ شاہ جہاں کی بارہویں اولاد تھی۔ انہی دنوں میں شہزادہ لطف اللہ کا بھی انتقال ہوگیا۔اور چند ماہ بعد سلطان دولت افزاء بھی فوت ہوگیا۔

......☆......

شاہ جہاں دکن کی طرف کوچ کر رہا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ ممتاز محل اس کے ہم رکاب نہ ہوتی۔ ملکہ ممتاز محل کے ہاں تیرھویں بچے کی آمد کے آثار واضح ہو چکے تھے۔اس لیے میر منزل نے جو رتھ ملکہ ممتاز محل کے لیے بنوائی تھی وہ انتہائی آرام دہ تھی۔ قالین اور آرام دہ مسندوں کے ساتھ طلائی مرصع سازی میں قیمتی پتھر استعمال کئے گئے تھے۔انہیں ہر طرح سے آرام دہ

بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔شاہ جہاں کا بس نہیں چلتا تھا کہ زمین کو بھی ہموار کر دے۔

شہنشاہ شاہ جہاں اپنے لشکر جرار کے ساتھ ۲ شعبان ۱۰۳۹ھ ۲۱ مارچ ۱۶۳۰ء کو برہان پور پہنچا۔یہیں پر جشن نوروز منایا گیا۔اگلے ماہ ۱۰ رمضان (۲۳ اپریل) کو شاہ جہاں کی تیرھویں اولاد نے جنم لیا۔ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہونے والی شہزادی کا نام حسن آرا رکھا گیا۔

......☆......

برہان پور میں ممتاز محل اسی محل میں ٹھہری تھی جہاں پہلے ٹھہرا کرتی تھی۔اس دن بھی وہ اسی محل کے اس جھروکے میں کھڑی تھی جہاں وہ اکثر کھڑی ہو کر قدرتی مناظر سے دل بہلایا کرتی تھی۔اس بار جیسے ہی وہ جھروکے میں آئی تو اس نے سوچا، یہی برہان پور کا وہ اینٹوں سے بنا ہوا محل ہے جہاں سے کبھی خوف دکھائی دیا کرتا تھا اور آج چاروں طرف اعتماد ہی اعتماد بکھرا پڑا ہے۔وہ احادی جو فقط شہنشاہ کے لیے مخصوص تھے ان کے ہمراہ تھے۔شہنشاہ شاہ جہاں دکن کی شورشوں کا پوری طرح قلع قمع کرنے میں مصروف تھا۔اس بار وہ چاہتا تھا کہ دوبارہ اسے باغیوں کی سرکوبی کے لیے دکن نہ آنا پڑے۔

اس دن صبح ہی سے ممتاز محل دردِزہ میں مبتلا ہو گئی تھی۔اس کے ہاں چودھویں بچے کی آمد تھی۔دن کا پہلا گذر جانے کے بعد اس نے ستی النساء سے کہا

''اس بار دردِزہ وہ نہیں جو پہلے ہوا کرتا ہے، یہ عجیب سا درد ہے۔''

''کیسا درد ہے ملکہ معظّمہ۔!''

''میں نہیں جانتی مگر مختلف ہے۔میں اسے برداشت نہیں کر پا رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکی اور بولی ''شہنشاہ کہاں ہیں؟''

''آسی گڑھ میں......''

''انہیں فوراً بلا لو، انہیں اس وقت میرے قریب ہونا چاہیے۔''

''جیسے حکم ملکہ محترم۔! مگر آپ اس بار اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں۔''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتی، بس شہنشاہ کو بلا لیا جائے۔'' پسینے سے بھیگی ہوئی ممتاز محل نے انتہائی اضطراب سے کہا تو ستی النساء بھی گھبرا گئی۔اس نے فوراً جہاں آراء کے ذریعے دارا شکوہ کو بلوایا اور اسے شہنشاہ تک پیغام پہنچانے کے لیے کہا۔

پورا دن اسی اضطراب میں گذر گیا۔ وضع حمل کی تکلیف نا قابل برداشت ہو رہی تھی۔ دن ڈھل گیا لیکن نہ تو تکلیف کم ہوئی اور نہ ہی شہنشاہ پہنچ سکا تھا۔ پھر آدھی رات بھی گذر گئی۔ یہاں تک کہ ایک بچی پیدا ہوئی۔ شہزادی گوہر آرا کی پیدائش کے تھوڑی دیر بعد شہنشاہ شاہ جہاں پہنچ گیا۔ وہ آتے ہی ممتاز محل پر جھک گیا۔ سفر کا غبار اس کے چہرے پر تھا۔ لیکن ممتاز محل کی حالت غیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

''کیا محسوس کر رہی ہو۔''

''میں......یہی کہ بس سو جاؤں......مگر آپ میرے پاس رہو۔''

''میں تمہارے پاس ہوں ارجمند۔'' اس نے ممتاز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ یوں کتنا ہی وقت گذر گیا۔ دفعتاً اس نے کہا

''شہنشاہ شاہ جہاں، میرے شوہر، میرے محبوب۔! شاید میں اب زندہ نہ رہ پاؤں مگر......''

''نہیں......نہیں ارجمند ایسا مت سوچو، تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ حکیم پر اُمید ہیں۔ تم گھبراؤ مت......''

''سنو۔! میرے محبوب سنو۔! مجھ سے وعدہ کرو۔''

''بولو، تم حکم دو۔''

''نہیں۔! بس وعدہ۔''

''بولو ارجمند۔!''

''سنو۔! میرے بچوں کا خیال رکھنا، میرے محبوب، وعدہ کرو کہ ان کے لیے ایسا ماحول نہیں چھوڑو گے کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں۔ ان کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا، ان میں محبت اور خیر سگالی کے جذبے کو فروغ دینا......''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''وعدہ کرو کہ میرے والدین کے ساتھ ہمیشہ بہتر سلوک روا رکھو گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''وعدہ کرو......وعدہ کرو......کہ آپ ہمیشہ اپنی ارجمند کو یاد رکھو گے......نہیں بھولو گے......''

''ایسا ہو نہیں سکتا ارجمند کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

شاہ جہاں نے کہا تو ممتاز محل نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سرد آہ کھینچی اور ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گئی۔

جائے ممتاز محل جنت آباد

۱۷ ذی قعدہ ۱۰۴۰ھ (۱۷ جون ۱۶۳۱ء) کو شاہ جہاں پر غم والم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اس کی محبوبہ اس کی رفیق اور با اعتماد ساتھی اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی تھی۔ ملکہ ممتاز محل کو باغ زین آباد میں دریائے تاپتی کے پاس سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ تدفین بطور امانت تھی۔

موسم سرما کی وہ صبح انتہائی چمکدار تھی۔ دن کا پہلا پہر اپنے نقطہ اختتام پر تھا۔ دریائے جمنا کے بہتے ہوئے پانی پر دھوپ کی چمک سے یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے چمکتا ہوا سونا بکھرا پڑا ہو۔ لال قلعہ کے سائے میں دریائے جمنا کے کنارے کشتیوں کا قافلہ رواں دواں تھا۔ شاہی نقارہ بجنے سے عوام کو یہ پختہ یقین تھا کہ شہنشاہ شاہ جہاں کا قافلہ ہے۔ دریا کنارے معمول کے مطابق آنے والے لوگ حیران تھے کہ شہنشاہ کا کوچ کس جانب ہے؟ دسیوں کشتیوں کے جلو میں شاہی بجرہ منفرد دکھائی دے رہا تھا۔ ریشمی پردوں سے مزین، دیدہ زیب نقش و نگار سے آراستہ وہ عالیشان بجرہ شاہی وقار کے عین مطابق تھا۔

لال قلعہ سے تھوڑا ہی فاصلہ طے کر کے وہ قافلہ جمنا کے دوسرے کنارے جا لگا جہاں کنارے سے لے کر دور تک ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ وہیں کنارے پر وزراء درباری و مصاحبین، عمائدین سلطنت، محکمہ بیوتات کے سربراہ اور اہلکاروں کے علاوہ بہت سارے لوگوں کا ہجوم تھا جو شہنشاہ شاہ جہاں کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ شاہی محافظوں اور دیگر وزراء و مصاحبین کے جلو میں اس نے کنارے پر بچھے پڑے قالین پر پاؤں دھرا۔ انہی لمحات میں اس پر غم زدہ کیفیات طاری ہو گئیں۔ وہ بے چین اور دل گرفتہ ہو گیا۔ اس نے دل کڑا کیا اور کنارے پر اتر گیا۔ سامنے ہی عبدالکریم خاں اور مکرمت خاں کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ذرا سا ہٹ کر استاد احمد بھی کھڑا تھا۔ شہنشاہ کی آمد پر سب نے جھک کر تعظیم دی اور وہ سب اس

طرف بڑھ گئے جہاں رنگین شامیانہ نصب کیا گیا تھا اور اس کے نیچے شہنشاہ کے لیے نشست بنائی گئی تھی۔ یہ عارضی نشست گاہ بھی شاہی وقار کے عین مطابق تھی۔ شاہ جہاں بیٹھ گیا تو خاموشی چھا گئی۔ تبھی عبدالکریم خاں، مکرمت خاں اور استاد احمد آگے بڑھے اور شہنشاہ کو تعظیم دی، شاہ جہاں نے ان کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے اذن کلام دیا۔ اس پر عبدالکریم خاں بولا

''جہاں پناہ۔! شاہی خواہش کے عین مطابق مقبرہ کے لیے جگہ تلاش کر لی گئی ہے۔'' یہ کہہ کر ان نے لمحہ بھر کو شہنشاہ کی طرف دیکھا جو اس کی طرف پوری طرح متوجہ تھا۔ تب اس نے ذرا بلند آواز سے کہا'' شاہی خواہش تھی کہ مقبرہ دارالسلطنت آگرہ میں اور قلعہ سے قریب ہو۔ مقبرے کا ماحول شہر کے شور وغوغا سے دور ہو۔ فضا پرسکون اور دل آویز ہو۔ مقبرہ قلعہ کے برج سے اسی طرح دکھائی دے جس طرح قلعہ برہان پور سے باغ زین آباد دکھائی دیتا ہے جہاں ملکہ عالیہ ممتاز محل کی عارضی آرام گاہ بنائی گئی ہے۔ ماحول کی دلکشی تصنع سے پاک اور فطرت سے ہم آہنگ ہو۔ مقبرہ کے ساتھ جو باغ تعمیر کیا جانا ہے اس کے لیے پانی با آسانی فراہم ہو جائے۔ مقبرہ اس قدر مناسب بلندی پر ہو جو پورے شہر سے دکھائی دے مگر بلندی محسوس نہ ہو۔ مقبرہ کے محل وقوع میں اس بات کی گنجائش ہو کہ مقبرہ کے مقابل دریائے جمنا کے دوسرے کنارے پر ایک دوسرا مقبرہ بنایا جا سکے اور ان دونوں کو ایک پل سے مربوط کیا جا سکے۔ مقبرہ سے ملحقہ باغ نہ صرف عالیشان ہو بلکہ اس کی مزید خوبصورتی کا باعث بنے۔ مقبرہ کے لیے ہر موسم موزوں اور معتدل رہے۔ اسی طرح اس کا پس منظر ہر موسم میں مقبرہ کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہو اور کبھی بھی اس کے حسن میں خامی پیدا نہ ہو۔ مقبرہ کے لیے تعمیراتی اشیاء نہایت آسانی سے میسر ہو سکیں۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی سانس میں تیزی آ گئی تھی۔ اسے شاہی خواہش از بر تھی۔ اتنا سن کر شاہ جہاں کے چہرے پر تناؤ قدرے کم ہوا تھا۔ تب عبدالکریم نے کہا'' مقبرہ کے لیے زمین کے انتخاب میں ان سبھی باتوں کو سامنے رکھا گیا اور الحمدللہ۔! ہم ایک ایسا قطعہ اراضی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور یہ قطعہ ارضی حضور جہاں پناہ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔''

یہ کہتے ہوئے عبدالکریم خاں نے سامنے کی طرف موجود زمین کی طرف اشارہ کیا جو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمین پر ایک طرف باغ تھا جس میں مختلف پھلوں کے درخت بکثرت تھے۔ اس کے علاوہ اس ناہموار زمین میں مٹی کے بڑے بڑے تودے اور پتھریلے ٹیلے تھے۔ شہنشاہ شاہ جہاں سمیت سبھی لوگوں کی نگاہ اس زمین کی طرف اٹھ گئیں جو دھوپ کی

وجہ سے چمک رہی تھی۔ ہوا کے چلنے سے درخت اور جھاڑیاں دھیرے دھیرے لہرا رہی تھیں۔ کافی دیر تک زمین کا جائزہ لینے کے بعد شاہ جہاں لب کشا ہوا۔

''یہ زمین کس کے تصرف میں ہے؟''

''جہاں پناہ! یہ زمین راجہ مان سنگھ کے پر پوتے راجہ جےٴ سنگھ کے تصرف میں ہے۔'' مکرمت خاں نے کہا تو شہنشاہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔ شاید کسی یاد کا خستہ کاغذ پھڑ پھڑاتا ہوا اس کے سامنے وا ہو گیا ہو۔

راجہ مان سنگھ عہد اکبری میں فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس کی پھوپھی، راجہ بہاری مل کی بیٹی، اکبر کی چہیتی بیوی تھی۔ جس کا لقب مریم زمانی تھا۔ بادشاہ جہانگیر اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ راجہ مان سنگھ کی بہن جو راجہ بھگوان داس کی بیٹی تھی۔ جہانگیر کی بیوی بنی جس کا لقب شاہ بیگم تھا۔ جہانگیر اسے بے حد چاہتا تھا۔ اسی کے بطن سے سلطان بیگم اور پھر ۹۹۷ ہجری میں خسرو پیدا ہوا تھا۔ یوں اس خاندان سے شہنشاہ شاہ جہاں کی رشتہ داری تھی۔ اس نے حاضرین پر نگاہ ڈالی۔ اس اثناء میں راجہ جےٴ سنگھ آگے بڑھا، جھک کر بادشاہ کو تعظیم دی اور نہایت آداب سے کہا

''عالی جاہ شہنشاہ ہند۔! میرے لیے یہ باعث فخر ہے کہ جو زمین ملکہ عالیہ کے مقبرے کے لیے منتخب ہوئی ہے وہ میرے تصرف میں ہے۔''

''راجہ جےٴ سنگھ ہم یہ زمین آپ سے بہ رضا و رغبت اور معاوضہ دے کر حاصل کریں گے۔ بولو آپ اس قطعہ زمین کے لیئے کیا نرخ مقرر کرتے ہیں۔'' شہنشاہ شاہجہاں نے نہایت متانت اور وقار سے کہا

''حضور عالم پناہ۔'' یہ کہہ کر وہ ذرا سا جھکا اور بولا'' اگر اس میں کوئی دینی مصلحت نہ ہو تو میں یہ زمین آپ کے حضور تحفے میں پیش کرتا ہوں۔''

''ایسا نہیں جےٴ سنگھ، آپ اس کی قیمت وصول کریں، آپ اس کے نرخ مقرر کریں۔'' رعب شاہی سے لبریز لہجہ میں حکم ہوا تو جےٴ سنگھ کو مزید کہنے کا یارا نہ رہا۔ تب اس نے کہا

''حضور عالم پناہ۔! ایسا آپ خود ہی فرما دیں جو آپ کی خواہش ہو وہی مجھے قبول ہوگا۔'' اس پر شہنشاہ شاہ جہاں چند لمحے خاموش رہا اور پھر انتہائی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا

''راجہ جےٴ سنگھ۔! آپ اس مقبرہ کے تعمیراتی سامان کی بہم رسانی کے نگران ہوں گے۔ شاہی تعمیرات کے علاوہ

ایک نیا محکمہ قائم کر دیا گیا ہے۔شاہی فرامین آپ کے نام ہوں گے۔''

شہنشاہ شاہ جہاں نے کہا اور اٹھ گیا۔

پھر اسی دن ۹ رجب ۱۰۴۱ ہجری بمطابق ۲۱ جنوری ۱۶۳۲ء کو شاہی فرامین جاری ہوئے جو مقبرہ کے تعمیری امور سے متعلق تھے۔ان میں ایک زمین کی خریداری کے بارے میں تھا۔شاہ جہاں نے وہ زمین عام نرخ سے تقریباً بیس گنا زیادہ قیمت کے ساتھ خرید لی تھی۔اس میں ایک فرمان یہ بھی تھا کہ سلطنت ہند کے طول وعرض میں سے تعمیراتی فنکاروں کو جمع کر لینے کی ہدایت کی گئی تھی۔

......☆......

شام ڈھل کر رات میں تبدیل ہوگئی تھی۔چاند طلوع ہونے میں ابھی خاصا وقت تھا جبکہ ستارے آسمان پر ٹمٹانے لگے تھے۔وہ دریائے جمنا کے اس پار کھڑا دور آگرہ شہر میں ستاروں کی مانند ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔آگرہ شہر کے گرد و نواح میں اس بے ڈھب زمین پر رام داس کی وہ پہلی شب تھی۔اس کی بیوی اور تین سالہ بچہ رات کا کھانا کھا کر سو چکے تھے۔شدید تھکن نے ان پر نیند طاری کر دی تھی جبکہ وہ سو نہیں سکا تھا۔اس پر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس کی اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی۔رات کی دہشت اس پر طاری تھی اور اجنبی ماحول اسے ڈرا رہا تھا۔اس نے تا حد نگاہ پھیلے ہوئے آسمان کو دیکھا، پھر شہر کی روشنیوں پر نگاہ کی تو اسے یوں لگا جیسے زمین اور آسمان پر ہر جگہ ستارے پھیلے ہوئے ہیں۔لیکن جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں سوائے گہری تاریکی کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔اسے یوں لگا جیسے وہ انتہائی حقیر سی شے ہے، جسے بھگوان نے پیدا کر کے اس زمین پر دھکے کھانے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔اس نے اردگرد دیکھا اس کے ساتھی قافلے والے سوجانے کا اہتمام کر رہے تھے۔کہیں کہیں چند لوگ دائرے کی صورت میں آگ جلا کر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی باتوں کی دھیمی دھیمی آواز اس تک پہنچ رہی تھی مگر لفظ سمجھ نہیں آ رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔اتنے لوگوں کے درمیان بھی وہ خوف زدہ تھا۔اسے ڈر تھا کہ ڈاکو اسے لوٹ نہ لیں۔کوئی جنگلی جانور اسے چیر پھاڑ نہ دے یا کوئی سانپ ہی نہ اسے ڈس لے۔اس کی نگاہ دریائے جمنا کے اس پار آگرہ شہر پر تھی لیکن اس کا ذہن الجھی ہوئی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔اس نے ان ڈرا دینے والی سوچوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ذہن کو جھٹکا۔مگر سوچیں تھیں کہ اس پر حملہ آور ہو چکی تھیں۔اسے اپنے گھر کی یاد ستانے لگی تھی۔وہ یادیں ایسی تھیں جس سے اس کے آنسو بہہ نکلے۔اس نے ان آنسوؤں کو اپنی کھردری اور

دھنسی ہوئیں گالوں پر بہنے دیا۔

وہ اچاریہ تھا اور اس کا پیشہ بت تراشی تھا۔ یہ فن اسے ورثے میں ملا تھا۔ جسے وہ نہ صرف عبادت سمجھ کے کرتا تھا بلکہ اس سے علم وآ گہی کا وسیلہ بھی مانتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس فن کی بدولت وہ جسم، روح اور شعور کو سمجھ سکتا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک اچھا ہنر مند تھا۔ اسی باعث اس کی اپنے گاؤں اور اردگرد کے علاقے میں خاصی عزت تھی۔ لوگ اس کا احترام کرتے تھے کہ اس نے کئی سارے مندروں کی تعمیر میں اپنی ہنر مندی کے جوہر دکھائے تھے۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح پتھروں کو خوبصورت مجسموں میں تبدیل کر سکتا تھا۔ وہ سخت ترین پتھروں میں بھی دیوی دیوتاؤں کے خطوط یوں ابھارتا تھا کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ مگر وہ اپنی اس ہنر مندی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھوں سے کوئی عظیم شاہکار تخلیق ہو لیکن اسے اپنے گاؤں یا دور دراز علاقوں تک بھی ایسا موقعہ نہیں ملا تھا اور وہ ایسے کسی موقعے کی تلاش میں تھا۔

اچانک ایک دن اسے یوں لگا جیسے اس کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا ہے۔ اس نے اپنے سرپرست راجہ کے دربار میں آگرہ سے آیا ہوا فرمان سنا کہ مغل اعظم شہنشاہ شاہ جہاں نے پورے ہندوستان سے ماہر کاریگروں کو اکٹھا کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ آنجہانی ملکہ ممتاز محل کا روضہ تعمیر کیا جا سکے۔ بادشاہ اسے ایک عظیم یادگار کے طور پر بنانا چاہتا تھا۔ دربار میں اس فرمان پر گفتگو ہوئی تھی جس سے اس کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ یہ طے تھا کہ وہ مقبرہ مسلمانوں کے روایتی طرز تعمیر کے مطابق بننے والا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ جہاں مسلمان اپنی میت کو دفن کرتے ہیں، وہ عبادت گاہ نہیں ہوتی۔ تاہم اسے وہاں اپنی فنی صلاحیتوں کو آزمانے کا موقع میسر آ سکتا تھا۔ اس نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ آگرہ جائے گا۔ راجہ نے شاہی فرمان کی تعمیل میں اپنے علاقے کے ماہر ہنر مندوں کو اکٹھا کیا اور انہیں آگرہ جانے کے لیے کہا۔ وہ ہنر مند جو آگرہ جانے کے لیے تیار ہوئے ان میں ایک رام داس بھی تھا۔ راجہ نے قافلہ کی روانگی میں خصوصی دلچسپی لی تھی۔ انہیں سفر خرچ کے علاوہ سواری کے لیے مویشی بھی دیئے۔ اس نے خصوصی طور پر شاہ جہاں کے لیے بہترین تحائف بھی ارسال کیے تھے۔

تقریباً اڑھائی ماہ کی طویل مسافت کے بعد جہاں ان کا قافلہ آ رکا وہ ایک بے ڈھب اور ناہموار زمین تھی۔ وہاں مختلف علاقوں سے آئے ہوئے قافلے بھی تھے مگر وہ پوری طرح انہیں دیکھ نہیں پایا تھا، سامان اتارتے ہوئے اور پھر کھانے سے فراغت کے بعد اس کے ہاتھ میں رات کے یہی لمحات آئے تھے۔ وہ بہت مایوس ہو رہا تھا۔ اس نے دوران سفر بہت سی باتیں سنیں تھیں اور ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مسلمان بت نہیں بناتے، جس عمارت کی تعمیر کے دوران وہ

اپنی فنی صلاحیتیں دکھانے والا تھا، وہاں مجسموں کی کوئی گنجائش نہیں تھی، تو پھر وہ کیا کرے گا؟ یہی سوال اس پر مایوسی طاری کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اتنا طویل سفر کر کے یہاں کیوں آ گیا ہے۔ اسے لگا جیسے دیوی دیوتا اس سے بے وفائی کر گئے ہیں اور اس دنیا میں اسے ٹھوکریں کھانے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ وہ تو انتہائی محبت، عقیدت اور احترام سے انہیں تراشتا ہے۔ ایسا کیوں ہو گیا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ کافی دیر تک سوچتا رہا اور پھر اٹھ کر اپنی بیوی بچوں کے پاس چلا گیا جو سو چکے تھے۔

اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو شاہی نقارہ بج رہا تھا۔ یہ اس کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ اس نے لال قلعے کی جانب دیکھا تو اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اتنا بڑا قلعہ؟ دوران سفر اس نے بہت سارے قلعے دیکھے تھے لیکن اس قدر ہیبت ناک اور رعب و جلال والا قلعہ اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ پورے شہر سے بلند تھا۔ رات اسے شاید دکھائی نہیں دیا تھا لیکن دن کی روشنی میں اس کے برج چمک رہے تھے۔ دریا کے کنارے ایستادہ ایک پہاڑی کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ قافلے کے ساتھ آئے دوسرے لوگ بھی اس کی طرح حیران تھے۔ ان سب کی نگاہیں قلعہ کی جانب تھیں۔

''یہ آواز شاید اسی قلعے سے آ رہی ہے؟'' رام داس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں۔!'' اس کے ساتھ کھڑے ایک تاجر نے کہا جو مغل شہنشاہوں کے بارے میں کافی حد تک معلومات رکھتا تھا۔ ''شہنشاہ روزانہ صبح جھروکہ درشن میں آ کر اپنے درشن دیتا ہے۔ وہاں پر۔'' اس نے قلعہ کے جھروکہ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا

''کیا ہم اسے دیکھ سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں، اسے دیکھنے کے لیے ایک ہجوم قلعے کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اگر تم چاہو تو ابھی دیکھ سکتے ہو۔''

اس نے کہا تو رام داس چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے ساتھ اور لوگوں نے بھی ارادہ کر لیا۔ وہ سب باتیں کرتے ہوئے اس طرف بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ دریائے جمنا کے کنارے آ پہنچے۔ وہ دریا کافی حد تک مڑتا ہوا قلعے کے ساتھ ساتھ زاویہ بناتا گذر رہا تھا۔ تبھی ان کی نگاہ وہاں سے دور کھڑے ہجوم پر پڑی جو تعظیم میں جھکا ہوا تھا۔

''ہمیں دیر ہو گئی۔ جب تک ہم وہاں پہنچیں گے، شہنشاہ واپس جا چکا ہو گا۔'' اس تاجر نے مایوسانہ انداز میں کہا تو رام

داس کو پہلے ہی دن اپنی خواہش پوری نہ ہونا، اچھا شگون نہ لگا۔ اس کے اندر دھیرے دھیرے لرزش پیدا ہوگئی۔ وہاں سے مڑے تو انہیں تھوڑے فاصلے پر پختہ اینٹوں سے بنا ایک چھوٹا سا گھر دکھائی دیا۔ جس پر پلستر کیا ہوا تھا اور اس کی سفیدی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ سادہ سی عمارت کے اردگرد صاف جگہ اور بہت سارے محافظ موجود تھے۔ درخت ابھی چھوٹے چھوٹے پودوں کی صورت میں تھے۔

''پہرے دار یہاں پر کیوں کھڑے ہیں۔''

''یہ ملکہ ممتاز محل کی عارضی آرام گاہ ہے۔''

''عارضی آرام گاہ'' رام داس کو سمجھ نہ آسکی۔

''مطلب، مقبرہ ہے اس کا۔'' تاجر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تو یہ بن چکا ہے، اتنا مختصر۔! کیا ہمیں یہاں آنے میں دیر ہوگئی ہے۔!''

''یہ وہ جگہ ہے جہاں اسے عارضی طور پر دفن کیا گیا ہے اصل مقبرہ تو ابھی تعمیر ہوگا۔'' تاجر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔، اسے رام داس کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مغل شہنشاہوں کی تعمیرات کے بارے میں نہیں جانتا۔ انہیں نہیں پتہ تھا کہ ان کی بنائی ہوئیں عمارتیں کس قدر عالیشان اور پر رعب ہوتی ہیں۔

''وہ دیکھنے میں کیسی تھی؟'' رام داس نے پھر سوال کر دیا۔

''میں نہیں جانتا، کیونکہ میں نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔'' تاجر نے کندھے اچکاتے ہوئے عام سے انداز میں کہا تو رام داس اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ دوران سفر اس نے بہت سارے لوگوں سے یہی سوال کیا تھا۔ مگر کوئی بھی اس کے متعلق نہیں بتا پایا تھا۔ وہ دیوتاؤں کے مجسمے تراشتا رہا تھا، جنہیں سب دیکھتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے مندروں میں ان کی جگہ سب سے اہم ہوتی تھی اور ان کے آگے مرد اور خواتین چڑھاوے چڑھا کر عبادت کرتے تھے۔ یہاں وہ اس مقبرے میں کیا کر سکے گا؟ وہ اس مجسمہ حسن کو تراش تو نہیں سکتا تھا، جس نے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ مایوس ہو گیا۔

روضۂ ممتاز محل کے لیے مخصوص جگہ کو ہموار کرنے کے لیے کام شروع ہو گیا تھا۔ تقریباً دو ہزار فٹ لمبائی اور ایک ہزار فٹ چوڑائی میں احاطہ زمین کو اپنی مرضی کے مطابق مٹی کے تودوں اور پتھریلے ٹیلوں سے صاف کیا جا رہا تھا۔ اس سارے کام کی نگرانی معمار تاج محل استاد احمد کر رہا تھا۔ ممتاز محل کی عارضی آرام گاہ سے قدرے فاصلے پر رنگین شامیانے دور تک نصب کر دیئے گئے تھے۔ محکمہ بیوتات سے الگ صرف تاج محل کی تعمیر کے لیے جو محکمہ قائم تھا انہی شامیانوں تلے کام کر رہا تھا۔ یہیں ان کے سامنے زمین تھی اور دن بھر روضۂ ممتاز محل کے لیے نقشے تیار ہوتے رہتے تھے۔ مختلف ہنر مندوں کا اجتماع ہو چکا تھا، کچھ نئے آ رہے تھے۔ استاد احمد کے علاوہ جو دوسرے ہنر مند تعمیراتی فنکار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں نقشے ہوتے، کوئی آ رہا ہوتا تو کوئی جا رہا ہوتا۔ ان کی ایک اپنی دنیا آباد ہو چکی تھی۔ وہ اس ہجوم سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہتے جو مددگاروں اور عام مزدوروں کی وجہ سے وہاں رہتا تھا۔ سنگ تراش، گل کار، پنجرہ ساز، اینٹ ساز، بڑھئی، لوہار، آرائش، خطاط، طغرانویس، گنبد ساز، کلس ساز، منبت کار، پچی کار اور معمار ہندوستان اور دیگر علاقوں سے آ کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ زمین کی ہمواری کے ساتھ ساتھ وہاں کئی طرح کے کاموں کی ابتداء ہو چکی تھی۔

دریائے جمنا کے کنارے، روضہ ممتاز محل کے لیے مختص جگہ کو چھوڑ کر دھیرے دھیرے ایک نیا شہر آباد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہ شہر کسی منصوبے یا ارادے کے بغیر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پہلے پہل وہاں پر گھاس پھوس سے بنائیں گئیں جھونپڑیاں دکھائی دیں، جنہیں عام مزدوروں نے اپنی اور اپنے خاندان کی رہائش کے لیے بنائیں تھیں۔ اگرچہ ان کی حالت خستہ تھی۔ دھول مٹی میں سے اگی ہوئی جھونپڑیاں ان مزدوروں کے لیے بہت بڑا سہارا تھیں۔ دن میں چمکتی ہوئی دھوپ اور رات کے اندھیرے میں انہیں تحفظ فراہم کرتی تھیں۔ انہی جھونپڑیوں میں سے ایک رام داس کی بھی تھی۔ اس کا ایک ہی کمرہ تھا جس میں وہ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے ایک کونے میں وہ کھانا بناتے تھے جہاں اس کی بیوی مالتی نے عام استعمال میں آنے والے مٹی کے برتن رکھ چھوڑے تھے۔ دوسرے کونے میں لکشمی دیوی کی تصویر لٹکا دی گئی تھی۔ جس کے سامنے دِیا روشن رہتا تھا۔ رام داس، لکشمی دیوی کی پوجا کرتا تھا اور اسی کے نیچے اس نے اپنے اوزار، بسولے، ہتھوڑا دھونکنی وغیرہ رکھ چھوڑی تھی جو ایک چھوٹے سے صندوق میں بند تھے۔

آگرہ شہر اس کے لیے حیرت انگیز تھا۔ یہاں آ کر اس نے بہت ساری نئی چیزیں دیکھی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ کئی دن تک اپنی بیوی مالتی اور بیٹے گوپال کے ساتھ سیر سپاٹا کرتا رہا۔ یہاں آ کر اس نے دنیا کے مختلف علاقوں

سے آئے لوگوں اور اشیاء کو دیکھا۔نئی نئی زبانیں سنیں۔ اگرچہ ان زبانوں کی اسے سمجھ نہیں آئی تھی لیکن پھر بھی وہ ان میں دلچسپی محسوس کرتا تھا۔ چند دنوں کے بعد اس کی جھونپڑی کے ارد گرد بھی کئی اور جھونپڑیاں بننے لگیں۔ یہ لوگ بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔لوگوں نے آباد ہونا شروع کیا تو چھوٹی موٹی دکانیں بھی وجود میں آنے لگیں، جہاں سے ضروریات زندگی کی اشیاء میسر ہونے لگیں۔ وہ رہائشی علاقہ اگرچہ خشک اور جھلسی ہوئی دھول سے اٹا رہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مٹھائیوں، سموسے، بھاجی، آٹا، کنو، مختلف شربت، قہوے وغیرہ کی خوشبو سے فضا مہکی رہتی۔ گلیوں میں بچے گھومتے اور کھیلتے رہتے۔ یہ دوکانیں ان لوگوں کی ضروریات بھی پوری کرتی تھیں جو مختلف علاقوں سے عارضی طور پر وہاں آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ وہ سامان لاتے اور اس بڑے سارے میدان میں اتار کر چلے جاتے۔ یہ سامان قرب و جوار کے علاقوں سے لے کر سینکڑوں کوس دور تک سے لایا جا رہا تھا۔ دن رات اونٹوں، ہاتھیوں، گھوڑوں، خچروں اور بیل گاڑیوں کے قافلے آتے رہتے تھے۔کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ وہاں پر کوئی نہ کوئی قافلہ سامان اتار نہ رہا ہو۔ بیجا سال، شیشم، دیودار، صندل اور آبنوس کے درخت ترائی سے کٹ کر اس میدان میں جمع کیے جا رہے تھے۔ چار کوہ اور مکرانہ سے سفید چمکدار سنگ مرمر، راجھستان سے پیلا، اودھے پور سے سیاہ، بڑودہ سے سبز بند کی دار، وسطی ہند سے ہلکا گلابی، کانگڑا سے سرمئی اور آندھرا کے علاقہ کڑپہ سے چتکبرے سنگ مرمر کے زیر زمین پہاڑ کٹ کٹ کر رنگا رنگ پہاڑیاں بنا رہے تھے۔ کہیں چونے کے تودے لگ رہے تھے، کہیں اینٹوں کی بھٹیاں لگ کر تیار ہو گئیں تھیں۔ باریک ریت کے ٹیلے بن گئے تھے۔ گڑ کے ڈھیر اور ارد کی دال کے تھیلے گودام ہو رہے تھے۔ پٹ سن کے ڈھیر اور مصطگی کی بوریاں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ بیسن کے تھیلے اور گوند اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ ایک طرف چربی کی تھاپیاں چبوترہ بنا رہی تھیں۔ ان سے ذرا فاصلے پر ادویات ملے پانی کے حوض چھلک رہے تھے۔ تعمیراتی سامان جمع ہونے کی رفتار سے شہنشاہ شاہ جہاں کی دلچسپی عیاں ہو رہی تھی لیکن ابھی تک عمارت کا مجوزہ نقشہ نہیں بن پایا تھا۔

رام داس یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اس پر حیرتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ اس نے پہلے کبھی اس قدر بڑے پیمانے پر تیاریاں نہیں دیکھی تھیں۔ اس پر تو لال قلعے کا رعب و جلال ہی اس قدر طاری تھی کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ کیسے بنا ہوگا۔ وہ جب بھی اس طرف دیکھتا تھا اس کی وسعت دیکھ کر حیران ہو جاتا۔ سخت چہرے والے سپاہی، ان کی وردیاں اور چمکتے ہوئے ہتھیار اس پر ہیبت طاری کر دیتے۔ وہ اس وقت بیدار ہو جاتا تھا جب شاہی نقارہ بج اٹھتا۔ اس وقت محافظوں کی پہریداری

کا وقت ختم ہوتا تھا۔ ان کی جگہ نئے آ جاتے تھے۔ تب سینکڑوں لوگ دریا اور قلعے کی درمیانی زمین پر اکٹھے ہونا شروع ہو جاتے تھے تا کہ جھروکہ درشن سے عظیم شہنشاہ شاہ جہاں کی جھلک دیکھ سکیں۔ رام داس نے جب پہلے دن یہ نظارہ کیا تھا تو گوپال اس کے کاندھوں پر سوار تھا۔ شہنشاہ جب جھروکے میں فروکش ہوا تو قلعے کے نیچے کھڑے لوگ تعظیم سے جھک گئے تھے۔

''کیا یہ بھگوان ہے؟'' رام داس کے لبوں سے لاشعوری طور پر نکل گیا۔

''نہیں، محض ایک انسان ہے، تمہاری اور میری طرح۔'' وسطی ہند سے آئے ہوئے ایک مسلمان تاجر نے تیزی سے کہا وہ بھی یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔

رام داس کتنے ہی دنوں تک اس پر جلال نظارے کے زیر اثر رہا تھا۔

اس دن موسم قدرے گرم تھا۔ ہوا بھی خاصی تیز تھی۔ میدان کو ہموار کرنے سے اٹھنے والی دھول کا غبار بہت زیادہ تھا۔ یہاں تک کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اس دن وہ بھی وہاں جا پہنچا جہاں ایک شامیانے تلے کئی اہلکار بیٹھے تھے۔ ان کا یہی کام تھا کہ کسی بھی علاقے سے آئے ہوئے ہنر مند، مددگار یا مزدور کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام دیا جائے۔ یہیں پر اس کا اندراج ہوتا اور اس کی مزدوری طے ہوتی تھی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے وہ اپنی اجرت حاصل کرتا تھا۔

''میں اچاریہ ہوں۔ میں شمالی ہند کے علاقے گنتی کل سے آیا ہوں۔''

رام داس نے بڑے فخر سے کہا۔ لیکن اہلکار کو سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ تب ایک اور شخص نے اسے اچاریہ کا مطلب سمجھایا کہ اس کے معنی استاد کے ہوتے ہیں۔

''کیا کر سکتے ہو؟'' اہلکار نے معنی میں دلچسپی نہ لیتے ہوا اس کے کام سے متعلق پوچھا۔

''میں بت تراشتا ہوں۔'' رام داس نے پھر اسی فخر سے کہا

''لیکن یہاں پر تو مجسمہ سازی کا کوئی کام نہیں ہے۔'' اہلکار نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ معمولی وضع قطع کا پتلے چہرے والا شخص تھا جس کی خشخشی داڑھی میں دھول پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بڑے بڑے ہاتھوں پر زخموں کے نشان تھے اور کافی حد تک کھردرے دکھائی دے رہے تھے۔

''یہاں کا نگران کون ہے؟'' رام داس نے بے صبری سے پوچھا کیونکہ اہلکار اس کے پیچھے قطار میں کھڑے مرد اور

عورتوں کی طرف متوجہ ہو جانے کے لیے نگاہیں اٹھا چکا تھا۔ وہاں کام کے حصول کے لیے بہت سارے لوگ جمع تھے کیونکہ لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہاں کام کی زیادہ اجرت ملتی ہے۔ اس وقت گیہوں بارہ دام میں چالیس سیر آ جاتے تھے جبکہ عام مزدور کی اجرت تین دام روزانہ تھی۔ روضہ ممتاز محل پر کام کرنے والے کی اجرت چار سے پانچ دام روزانہ تھی۔ یہ اجرت ایک عام مزدور کو ملتی تھی۔ اس لیے وہاں پر جوق در جوق افرادی قوت جمع ہو رہی تھی۔

اہلکار نے رام داس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے سوال پر متوجہ ہو گیا تھا۔

''تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے یہاں گنتی کل کے راجہ نے بھیجا ہے اور میں اس کی طرف سے بادشاہ کے لیے تحفہ لایا ہوں۔''

''وہ تم ادھر جمع کروا دو۔ بادشاہ تک پہنچ جائے گا۔'' اہلکار نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر پوچھا'' یہاں تو تمہیں ملازمت مل سکتی ہے کہو تم کیا کر سکتے ہو؟''

''میں اچاریہ ہوں اور بت تراشتا ہوں۔''

''لیکن یہاں مجسمہ سازی کا کوئی کام نہیں ہے۔ چاہو تو پتھر کاٹ سکتے ہو، اس کی تمہیں اچھی اجرت ملے گی۔''

''نہیں، میں دست کار نہیں ہوں بلکہ ہنر مند ہوں۔''

''یہاں تو پھر مجسموں کی ضرورت نہیں ہے، کوئی اور کام کر سکتے ہو تو بتاؤ ورنہ جاؤ، دوسرے لوگ انتظار کر رہے ہیں۔'' اہلکار نے جلدی سے کہا اور اس کے پیچھے کھڑے شخص کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم مجھے یہاں کے نگران سے ملوا دو۔'' رام داس نے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی ہنر مندی کے بارے میں اس شخص کو کیسے سمجھائے اس کے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کے سامنے لوگ عبادت کے لیے جھکتے ہیں۔ پھل اور پھول چڑھاوے کے لیے لاتے ہیں۔

''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو وہاں چلے جاؤ۔'' اہلکار نے رنگین شامیانوں کی طرف اشارہ کیا تو رام داس ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ ان شامیانوں کی طرف چلا جائے۔ اسے اپنے فن پر ناز تھا۔ وہ اپنے وراثتی ہنر کو محض پتھر تراشنے اور کاٹنے پر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اب یہاں سے واپس بھی نہیں جانا چاہتا تھا اور کام نہ ملنے کی وجہ سے ٹھہر بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تذبذب کی حالت میں آ گیا کہ کیا کرے۔ اہلکار نئے مزدور کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اس سے

سوال و جواب کر کے کاغذوں پر اندراج کر رہا تھا۔تبھی رام داس کے ذہن میں سوال آیا۔اس نے حیرت سے پوچھا۔

'' کیا لوگ یہاں اس عمارت میں عبادت نہیں کریں گے؟''

''ارے نہیں۔! یہ مسجد نہیں، مزار ہے۔''

''تو پھر اس مزار میں ملکہ کی شبیہہ بھی درکار ہوگی۔''

''تمہیں شاید پتہ نہیں، اسلام میں شبیہہ اور مجسمہ سازی منع کی گئی ہے۔'' اہلکار کے کہنے پر رام داس نے یوں سر ہلایا جیسے وہ اس کی بات سمجھ گیا ہو۔حالانکہ اسے اس بارے تصور بھی نہیں تھا۔

'' آپ یہ تو بتا سکتے ہو کہ وہ کیسی تھی؟'' رام داس کے اس سوال پر اہلکار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔اسے رام داس پاگل معلوم ہوا۔لیکن پھر بھی اس نے تحمل سے کہا

''مجھے نہیں معلوم۔اب تم جاؤ۔لیکن اگر پتھر کاٹتے ہیں تو ملازمت مل سکتی ہے۔'' اہلکار نے حتمی انداز میں کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

رام داس وہاں سے مایوس لوٹ آیا۔اس کا دل نہیں چاہا کہ راجہ کی طرف سے بادشاہ کے لیے بھیجا گیا لکشمن کا مجسمہ ان اہلکاروں کے حوالے کر دے۔اس وقت اسے اپنے مستقبل کی فکر لگ گئی تھی۔وہ حالات کے رحم و کرم پر تھا۔

رام داس پر شدید مایوسی طاری تھی۔اس کا سارا دن کسی نہ کسی طرح گذر جاتا لیکن رات کی تنہائی میں اس کی مایوسی کرب آمیز ہو جاتی تھی۔اسے نیند نہیں آتی تھی اور وہ بے چین رہتا تھا۔اس وقت بھی وہ اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔دِیے کی مدہم اور مدقوق روشنی پھیلی ہوئی تھی۔اس کی بیوی مالتی بے خبر سو رہی تھی۔وہ پسینے سے شرابور تھی۔یوں دکھائی دیتا تھا کہ وہ کپڑوں سمیت ندی میں سے ڈبکی لگا کر آئی ہو۔اس کی میلی سی مہین اور پرانی ساڑھی اس کے جسم پر چپکی ہوئی تھی۔اس نے ایک نگاہ مالتی کے بدن کے خطوط پر ڈالی اور آہ بھر کر رہ گیا۔وہ اپنے آپ کو اس کا مجرم سمجھتا تھا۔اس کی آہ سے دِیے کی لُو تھرتھرا اٹھی تو سبھی سائے لرزنے لگے۔وہ اٹھا اور سوئے ہوئے بیوی بچوں کو دیکھا۔پھر دھیرے سے جھونپڑی سے باہر نکل گیا

، جہاں فضا قدرے خوشگوار تھی۔ وہ چند لمحے خالی الذہن سا وہاں کھڑا رہا۔ پھر اس جانب بڑھ گیا جہاں دوکانوں کی قطاریں تھیں۔ وہ دوکانیں ختم ہوئیں تو وہ ایک جھونپڑے میں جا پہنچا۔ جہاں اندر اور باہر لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور شراب پی رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مٹی کے پیالے تھے۔ وہاں دن بدن لوگوں کے آنے میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شہر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ نئی نئی جھونپڑیوں کے علاوہ چند پختہ اور بڑے بڑے مکان بھی بن گئے تھے۔ یہ ان احکام تھے جو وہاں پر روضہ ممتاز محل کے انتظام سنبھال رہے تھے۔ اس بڑھتے ہوئے شہر کا نام ممتاز آباد پڑ چکا تھا۔

رام داس نے تلخ اور گھٹیا شراب کا گھونٹ حلق سے اتارا اور وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ وہ سب مزدور طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بزعم خود ان سے فاصلہ رکھتا تھا۔ شاید وہ یہاں بھی نہ آیا کرتا اگر اس کی معاشی حالت بہتر ہوتی یا پھر کوئی اور اچھا شراب خانہ کھل جاتا۔ اس نے یہاں آ کر لوگوں سے تعلق نہیں بنایا تھا۔ وہ پنڈت تو نہیں تھا لیکن وہ اپنا درجہ انہی کے برابر سمجھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ خود اس کے پاس آئیں اور اس سے تعلق پر فخر محسوس کریں جیسا کہ اس کے گاؤں میں تھا۔ سوائے دو خاندانوں کے ان کا کسی سے بھی تعلق نہیں تھا۔ یہ دونوں خاندان اس کی ذات کے نہیں تھے، لیکن شمالی علاقے سے آئے تھے۔ چونکہ وہ انہی کی زبان بولتے تھے اس لیے مشترک زبان ہونے کے باعث معمولی سی شناسائی، تعلق میں بدل گئی تھی۔ اگر یہ تعلق صرف اسی بنا پر رہتا تو شاید آگے نہ بڑھتا لیکن مالتی کی کوششوں سے وہ ان کے قریب آ گئے تھے۔

رام داس کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ جو کام وہ جانتا تھا اس کی روضہ ممتاز محل میں ضرورت نہیں تھی۔ جو کام اسے ملتا تھا، وہ خود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کام کو وہ گھٹیا اور اپنے درجے سے کم تر خیال کرتا تھا۔ وہ یہاں پر اس کام کے لیے نہیں آیا تھا کہ محض پتھر کاٹنے لگ جائے۔ اس کی اس ہٹ دھرمی میں ان کے پاس جو جمع پونجی تھی وہ ختم ہو کر رہ گئی یہاں تک کہ اس نے لکشمن کا مجسمہ بھی ایک ہندو کے ہاتھ بیچ دیا تا کہ اس سے چند دن کام چلتا رہے۔ مگر کب تک۔؟ آخر کار نوبت فاقوں پر آنے لگی لیکن اس کی ہٹ دھرمی اور ضد ویسے کی ویسے ہی رہی۔ مالتی اپنے بچوں کی بھوک نہیں دیکھ پائی سو حاملہ ہونے کے باوجود وہ ایک دن کام کرنے کے لیے نکل پڑی۔ اسے جہاں کام ملا تھا وہاں پر ہزاروں عورتیں اور مرد دریائے جمنا کی گذرگاہ تبدیل کر رہے تھے۔ وہ مزدور نہیں جانتے تھے کہ دریا کی گذرگاہ کیوں تبدیل کی جا رہی ہے۔ انہیں تو بس حکم دے دیا گیا تھا۔ دریائے جمنا، روضے کے لیے مخصوص جگہ سے کافی دور بہہ رہا تھا۔ وہ قلعے کے ساتھ ساتھ خم کھاتا ہوا آگے بڑھتا تھا۔ لیکن گذرگاہ کی تبدیلی سے وہ دھیرے دھیرے روضے کے لیے مخصوص جگہ کے قریب آتا جا رہا تھا۔ مالتی کے ذمے مٹی ڈھونا تھا۔ وہ

مٹی کی ٹوکری اٹھاتی اور کافی فاصلے پر دریا میں پھینک دیتی۔اس کام کے لیے نگران عورتیں اور مرد موجود تھے۔مرد پھاوڑوں سے مٹی کھودتے، پھر بیلچوں سے ٹوکریاں بھرتے اور مزدور انہیں اٹھا کر لے جاتے۔مالتی حاملہ ہونے کے باوجود وہاں پر کام کرتی رہی اور رام داس سارا دن بے کار رہ کر گذار دیتا۔حالانکہ وہاں پر مٹی کھودنے کا کام دن رات ہو رہا تھا۔

''میری بھی مجبوری ہے، میں کیا کروں۔رام داس نے نشے میں سر کو جھٹکتے ہوئے بڑ بڑا کر کہا۔''میں گھٹیا کام کے لیے پیدا نہیں ہوا۔''

اس نے مالتی کے خیال کو ذہن سے نکال دیا اور اپنے ہونے والے بچے کے متعلق سوچنے لگا۔اس کی زبردست خواہش تھی کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہو۔تا کہ وہ اسے بھی گوپال کی طرح اپنا وراثتی ہنر سکھائے۔اس نے مٹی کے پیالے میں موجود شراب کو دیکھا اور پھر ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔اس پر نشہ طاری ہو چکا تھا۔اس لیے وہ وہاں سے اٹھا اور اپنی جھونپڑی کی طرف واپس چل دیا۔

......☆......

شاہی محل کے اس حصے میں قندیلیوں کی روشنی سے کمرہ جگمگا رہا تھا جہاں پر روضہ ممتاز محل کا چوبی نمونہ دھرا ہوا تھا۔اس کے اردگرد وہ تعمیراتی فنکار کھڑے تھے جو مختلف حوالوں سے اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ان میں استاد اسمٰعیل آفندی گنبد ساز، امانت خاں طغرا نویس، ستار خاں خوش نویس، محمد حنیف، عبداللہ خاں، محمد کاظم، محمد سجاد، محمد صدیق معمار، چرنجی لعل، منو لعل، بشارت علی، بھگوان داس، محمد یوسف خاں، چھوٹے لعل، جھومر لعل، ابو یوسف، شیو جی لعل، منوہر داس، مادھو رام، چنتامن، بنی دھر، ہیرامن، منوہر سنگھ، موہن لعل پچی کار، کاظم خاں کلس ساز، بلدیو داس، شکر اللہ، شاکر محمد، گل تراش، عبدالغفار، محمد ایوب خوش نویس۔قادر زمان خان، استاد عیسیٰ آفندی، ستار خان نقشہ نویس کے علاوہ معمار تاج محل استاد احمد بھی موجود تھا۔

وہ چوبی نمونہ شہنشاہ جہاں کے اس خواب کی تعبیر تھا جو اس نے مسلسل دو سالوں کے دوران ٹکڑوں کی صورت میں ان ماہرین تک پہنچائے تھے۔اس میں شک نہیں کہ ان تعمیراتی فنکاروں نے شہنشاہ کے خواب کو اپنی محنت، ریاضت اور مہارت سے شرمندہ تعبیر کر دیا تھا۔یہ سبھی اپنے اپنے فن میں کمال تعمیراتی فنکار تھے۔روم، سمرقند، تہران، بلخ، بخارا، شام اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے یہ فنکار اپنی پوری توانائی اور صلاحیتیں لگا رہے تھے۔انہیں یقین تھا کہ ان کی ہنر مندی بیش بہا

دولت کے حصول کا باعث بن جائے گی۔ گذشتہ دو سالوں سے وہ اس چوبی نمونہ کے بنانے میں صرف کر چکے تھے۔

محل سے ملحقہ کارخانے میں سینکڑوں لوگ مصروف کار تھے۔ جس طرح یادگار محبوب کا تصور شہنشاہ کے ذہن میں واضح ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ لوگ اسی طرح شہنشاہ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ پیچیدہ نمونے اور نقش و نگار تخلیق کر رہے تھے۔ طغرا نویس، خوش نویس اور گل تراش اپنے اپنے فن کا جادو دکھا رہے تھے۔ جب بھی کوئی نئی تخلیق کرتا، اسے شہنشاہ کے حضور پیش کیا جاتا، بادشاہ کو اگر پسند آ جاتا تو انعام واکرام سے نوازتا ورنہ مسترد کر دیتا۔ وہ مزید بہتر سے بہتر کی خواہش کرتا چلا جا رہا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی خاص تصور ہوگا جس کی مطابقت کے لیے وہ متجسس تھا۔ اس کی پسند کئے گئے کام سے فنکاروں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ شہنشاہ اس یادگار محبوب میں عظیم مغلوں کی شان وشوکت بھی دیکھنا چاہتا ہے مگر اس عمارت میں سادگی کو بھی نہیں کھونا چاہتا۔ وہ دولت کی نمائش نہیں کوئی تخلیق چاہتا تھا۔ یوں جیسے ارجمند بانو کے بے مثال حسن میں سادگی تھی۔ اس کے گالوں کے چاہ خنداں، ناک کا خم، مسکراہٹ جو محض لبوں تک محدود رہ کر پورے نقوش میں سرائیت کر جاتی تھی۔ وہ اس کا حسن دروازوں، کھڑکیوں اور گنبدوں میں تبدیل کر دینا چاہتا تھا۔

شہنشاہ شاہ جہاں کی آمد کا اعلان ہوا تو تعمیراتی فنکار کے چہروں پر اندیشے پھیل گئے۔ کچھ لمحوں بعد وہ آ گیا۔ اس نے سبھی فنکاروں پر نگاہ دوڑائی۔ سب نے اسے تعظیم دی۔ وہ دھیرے قدموں سے چلتا ہوا چوبی نمونے کے پاس آ گیا جو قندیلیوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے اطراف میں گھومتا رہا۔

''پسند آیا۔!'' شاہ جہاں نے چہرہ اٹھا کر کہا تو سب کے چہروں پر خوشی کی لہر رقصاں ہوگئی۔'' استاد احمد۔! کیا اس کے نقشے میں کوئی بھی تبدیلی ممکن ہے۔''

''جو حکم جہاں پناہ۔'' استاد احمد نے آگے بڑھ کر ادب سے کہا

''اگر اس میں کہیں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہو تو یہ خیال رکھیے گا کہ اس کی سادگی برقرار رہے۔''

''حضور۔! ہماری طرف سے یہ مکمل ہے۔ آپ اسے مزید دیکھ لیں۔ کیونکہ پھر یہی چوبی نمونہ ایک معیار ہوگا۔ پوری عمارت کا ابعاد اسی پر ہوگا۔''

''مطلب۔!''

''جہاں پناہ۔! اس چوبی نمونے کو اسی معیار پر بنایا گیا ہے کہ جب اصل عمارت تعمیر کی جائے تو اسی کی پیمائش کو

سامنے رکھا جائے۔''

شاہ جہاں خود تعمیراتی امور کو بہترین انداز میں سمجھتا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اسے استاد احمد کی ذہانت اور صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑا۔

''بہت خوب استاد احمد۔! آپ کا انتخاب ہی دراصل اس عمارت کو منفرد و یکتا بنانے کے لیے کافی ہوگا۔ ہم آپ کو نادرالعصر کا خطاب عطا کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے رکا اور پھر پوچھا

''شہنشاہ عالم......!'''' کیا آپ لوگ کام کی رفتار سے مطمئن ہیں؟''

''جی شہنشاہ عالم......!'' مکرمت خان نے آگے بڑھ کر کہا۔'' بہت جلد حضور کو عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کی دعوت دی جائے گی۔ وہی تمام تر عمارت کی پیمائش کا مرکز ہوگا۔''

''میں انتظار کروں گا۔'' شاہ جہاں نے کہا اور ایک بار پھر چوبی نمونے پر نگاہ ڈالی۔ چند لمحے اسے گھورتا رہا اور پھر واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تعمیراتی فنکار بھی جانے لگے۔

نادرالعصر استاد احمد۔! اس نابغہ روزگار معمار کا فرزند ارجمند تھا جو بابر کے ساتھ ہندوستان آیا تھا اس کا نام استاد یوسف تھا۔ وہ ترکی کے عظیم تعمیر کار''سنان'' کا شاگرد خاص تھا۔ استاد یوسف نے لاہور میں سکونت اختیار کی۔ اس کا بیٹا استاد احمد اسی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے معمار بنا۔ وہ زبردست ماہر ریاضی اور مستند معمار تھا، اسے فلکیات سے خصوصی شغف تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کے انتقال کے وقت وہ آگرہ میں ہی تھا اور شہر کو خوبصورت کے بنانے کے شاہی فرمان کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ تاج محل تعمیر کرنے کی بات چلی۔ استاد احمد نے دوسرے نقشہ کاروں کے ساتھ عمارت کا نقشہ بنایا جیسے شاہ جہاں نے فوراً منظور کر لیا اور پھر اس کے مطابق چوبی نمونہ تیار کر کے''نادرالعصر'' کا خطاب پایا۔''تحریر اقلیدس'' اور''مجیطی'' دونوں کتب پر استاد احمد کو عبور حاصل تھا۔ اس لیے وہ اپنی عمارتوں میں تناسب العباد کا بہت خیال رکھتا تھا۔

......☆......

رام داس کے دن بے کار اور بے چینی میں گذر رہے تھے۔ اسے ایک کام مل گیا تھا کہ جب مالتی کام پر چلی جاتی تو وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس کا نومولود بیٹا خاصا صحت منداور مضبوط بدن والا تھا۔ لیکن رام داس اس سے بھی اکتا گیا تھا۔ یہ کام عورتوں کا تھا اور وہی اسے بہتر انداز میں نبھا سکتی ہیں۔ اکتاہٹ اور مجبوری کے باوجود وہ ان کی دیکھ بھال

کرتا تھا۔ وہ سارا دن گھر میں رہتا اور جب مالتی آ جاتی تو وہ باہر نکل جاتا۔ یہی اس کا معمول تھا۔

ایک دن مقبرہ کے لیے مخصوص جگہ پر دھیرے دھیرے ہجوم اکٹھا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ یہ معمول سے ہٹ کر تھا۔ مشرقی کی جانب پانی کا چھڑکاؤ کر کے اڑتی ہوئی دھول کو ختم کر دیا گیا تھا۔ رام داس کو لگا کہ کوئی اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ وہ تجسس سے مجبور ہو کر اپنی جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ تب اسے اپنے ہمسائے سے معلوم ہوا کہ شہنشاہ کی آمد کے لیے یہ سارے انتظام کیے جا رہے ہیں۔ وہ کیا کرنے آ رہا ہے؟ یہ سوچ کر رام داس کا دل مچلنے لگا کہ وہ بھی وہاں جائے اور جا کر دیکھے۔ اس نے اپنے بچے ہمسائے کی بیوی آرتی کے پاس چھوڑے اور چل پڑا۔

رام داس اس ہجوم میں شامل ہو چکا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں سے وہ جگہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس جگہ پر چند نجومی بیٹھے ہوئے حساب کتاب میں مصروف تھے۔ ایک طرف قطار میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور ان پر علماء بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی قطار کے ساتھ امرائے سلطنت اور تعمیراتی فنکار بھی موجود تھے۔ دن کا پہلا پہر ڈھل گیا تو دریائے جمنا کے کنارے شاہی بجرہ آ رکا، اس کے ساتھ ہی نقارہ اور ناقوس بجنے لگے۔ پورے ہجوم پر خاموشی چھا گئی۔ دریائے جمنا کے کنارے سے اس جگہ تک شاہی محافظ کھڑے ہو گئے۔ شہنشاہ بجرے سے اتر کر پالکی میں سوار ہوا اور تھوڑی دیر بعد وہاں آ رکا۔ چمکتے ہوئے سورج کی روشنی میں پورا ہجوم ساکت تھا۔ ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی جس سے شہنشاہ کی دستار میں جڑا ہوا پر لہرا رہا تھا۔ استاد احمد، مکرمت خاں اور عبدالکریم خاں آگے بڑھے۔ استاد احمد کے ہاتھ میں طلائی تھالی پکڑی ہوئی تھی جس میں ایک اینٹ اور تھوڑا سا گچ پڑا ہوا تھا۔ امرائے سلطنت، تعمیراتی فنکار، ہنرمند، کاریگر اور تماشائی، ان سب کا ہجوم دیکھ رہا تھا۔ شاہجہاں نے وہ اینٹ پکڑی، طلائی اوزار سے گچ اٹھایا دوسرے ہاتھ سے اینٹ تھام کر جھکا، اس نے پہلے گچ دھرا اور اس کے اوپر اینٹ رکھ دی۔ شہنشاہ نے اپنی محبوبہ کے لیے بنائی جانے والی عمارت کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ وہ سیدھا ہوا تو دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ کچھ دیر دعا مانگنے کے بعد وہ واپس مڑا، پالکی میں بیٹھا اور واپس چلا گیا۔ سنگ بنیاد رکھنے کی یہ رسم مختصر ترین وقت میں ختم ہو گئی تھی۔ رام داس حیران تھا کہ اس قدر قلیل وقت میں بنیاد کھودنے کی رسم ختم ہو گئی؟ اسے تو یہی معلوم تھا کہ جب کسی مندر کی بنیاد رکھنی ہو تو وہاں پر کئی دن تک رسومات چلتی تھیں۔ صبح سے لیکر شام تک بھجن گائے جاتے ہیں۔ گھی سے آگ جلائی جاتی، رقص ہوتا، کھانا تقسیم ہوتا، وہ اس تقریب کی سادگی سے نہ صرف حیران تھا بلکہ مرعوب بھی ہو گیا تھا۔

بے کاری کی بناء پر جب رام داس کی اکتاہٹ حد سے بڑھنے لگی تو ایک دن اس نے اپنے اوزار والا صندوقچہ اٹھالیا

جولکشمی دیوی کی تصویر کے نیچے پڑا تھا۔ وہ اوزار کند ہو رہے تھے۔اس صندوقچے میں مختلف جسامت کے بسولے پڑے ہوئے تھے جن پر زنگ آ گیا تھا۔اس کے منہ سے آہ نکل گئی۔اس نے سارے اوزار نکالے اور انہیں دیکھتا رہا اور پھر تیزی سے انہیں بند کر کے رکھ دیا۔چند دن بعد اس نے اپنی جھونپڑی کے باہر دھونکنی جما دی۔ٹاٹ بچھا کر سان رکھی اور بھٹی گرم کر لی۔رام داس ان بسولوں کو بھٹی میں سرخ کرتا اور پھر سان پر رکھ کر ہتھوڑے سے کوٹتا۔اس کی مدد کے لیے گوپی بھی ہوتا وہ بھٹی گرم رکھنے کے لیے دھونکنی سے ہوا دیتا رہتا۔اس نے گوپی کو ہنر سکھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔اس فن کی ابتداء یہی تھی کہ بسولہ کیسے بنایا جاتا ہے۔یوں گوپی کو اپنا ہنر منتقل کرنے کی ابتداء کر دی گئی۔

ایسے ہی ایک دوپہر وہ اپنی جھونپڑی کے باہر کام میں مصروف تھا۔گوپی اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا، جبکہ دوسرے دونوں بچے اندر تھے۔کچھ لوگ اس کے پاس آن ٹھہرے۔وہ چند لمحے اسے کام کرتا دیکھتے رہے۔جب رام داس نے اپنا سر اٹھایا تو ان میں سے ایک دو چہرے اسے شناسا سا لگے۔ان میں سے ایک موہن لعل تھا جو کھانے پینے کی چیزوں کا سوداگر تھا۔عام طور پر وہ بے حال رہا کرتا تھا۔تاکہ لوگ یہ نہ جان پائیں کہ وہ اپنی تجارت سے کس قدر منافع کما رہا ہے۔مگر اس دوپہر اس نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔رام داس کو متوجہ پا کر اس نے جلدی سے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔اس کے ساتھ ہی دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تقلید کی۔

''آیئے موہن لعل۔! کیسے آنا ہوا؟'' رام داس نے ایک بسولے کو پانی میں ڈبوتے ہوئے کہا۔

''یہ چرن جی لعل ہیں۔آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' رام داس نے ایک موٹے سے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔رام داس نے اسے نمستے کیا تو موہن لعل بولا ''یہ آپ سے تھوڑی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔اگر تم وقت نکال لو تو اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

''ہاں ...... ہاں کیوں نہیں، آپ پدھاریئے'' رام داس نے جھونپڑی کے اندر کی طرف اشارہ کیا تو وہ سبھی اندر چلے گئے۔چند لمحوں بعد وہ بھی کپڑے سے ہاتھ صاف کرتا ہوا ان کے پاس آ بیٹھا۔چرن جی لعل بولا

''میں دہلی سے آیا ہوں، بیوپاری ہوں۔میں نے سنا ہے کہ تم اچاریہ ہو؟''

پہلی بار یہاں کسی نے اسے اچاریہ کے طور پر شناخت کے لیے پوچھا تھا۔رام داس پوری جان سے خوش ہوا اور مسکراتے ہوئے بولا

''ہاں۔ہاں جی، میں اچاریہ ہوں۔مگراس عمارت کے لیے میرے ہنر کی ضرورت نہیں، یہاں کوئی مجسمہ نہیں بننے والا۔ سومیں یہاں کوئی بھی ہنرمندی نہیں دکھا سکتا ہوں۔''

''ہمیں اس عمارت یا مقبرے سے کوئی مطلب نہیں ہے۔'' چرن جی لعل نے کہا۔'' ہم ہندو ہیں اور ہماری طرح یہاں پر بہت سارے ہندو ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ یہاں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے۔''موہن لعل نے لقمہ دیا۔

''ہاں۔! تم ٹھیک کہتے ہو۔لیکن رام داس ہماری پوجا کے لیے کوئی مندر نہیں ہے۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ مندر بنانے کے لیے ہمیں کس سے اجازت چاہیے ہوگی لیکن ہمیں بہرحال مندر بنانا ہے۔اس مقصد کے لیے ہم شہنشاہ تک رسائی کریں گے اور ہم مندر بنانے کی شروعات کرنا چاہتے ہیں۔''

رام داس بے چین ہوگیا اس بے چینی میں اس نے سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔وہ ان کی جرأت دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے انہیں شہنشاہ تک عرض داشت پہنچانے کے لیے ہمت اور رسائی کی قوت چاہیے تھی۔صدیوں سے ہندو اپنے عظیم مندر بناتے چلے آرہے تھے۔لیکن مسلمانوں کی آمد سے مسجدیں بھی بنیں۔مسلمان فاتحین کے آنے سے اسلام یہاں تیزی سے پھیلا تھا۔یہی مندر تھے جنہوں نے اس طوفان کے سامنے تھوڑا بہت بندھ باندھا تھا۔اگر یہ اکبر کا زمانہ ہوتا تو انہیں شاید اجازت کی بھی ضرورت نہ پڑتی مگر اکبر کے دین الٰہی کے خلاف جو تحریک اٹھی تھی اس سے مغل شہنشاہ ایسے کسی مذہبی فیصلے کے بارے میں بہت محتاط ہو گئے تھے۔دوسرا یہی مندر محض مذہبی عبادات کے لیے استعمال نہیں ہوتے تھے بلکہ وہاں سیاسی اور تحریکی سرگرمیاں بھی شروع ہو چکی تھی۔ممتاز آباد میں کوئی مندر اگر نہیں تھا تو ہندو اپنی انفرادی پوجا کرتے تھے۔یہاں مختلف علاقوں، قومیتوں اور مذاہب کے لوگ تھے۔کوئی شک نہیں کہ اجتماعی عبادت نہ ہونے کی وجہ سے دوسروں کے مذہبی عقائد کو فروغ مل جائے۔ ہوسکتا ہے یہاں بھی مندر اس لیے بنایا جارہا ہو کہ اسے سیاسی سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ مذہبی جذبات کیسے بھی ہو مگر خطرہ بہرحال موجود تھا۔

''میں......میں ایک مندر تعمیر نہیں کرسکتا۔'' رام داس نے جھجکتے ہوئے کہا'' میرا خاندان......''

''تم مندر تعمیر نہیں کرو گے اور یہ ذمہ داری ہم تم پر نہیں ڈالنا چاہتے، ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم درگا دیوی کی مورتی بنادو تاکہ ہم عبادت کرسکیں۔کیا تم ایسا کرسکتے ہو؟'' چرن جی لعل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔! میں ایسا کرسکتا ہوں مگر اس کے لیے تھوڑا وقت تو درکار ہوگا نا۔ میں اپنا کام اس وقت تک شروع نہیں کرسکتا جب تک درگا دیوی کی آشیر واد حاصل نہ کرلوں۔''

وہ سمجھ گئے۔ یہ اچاریہ کسی بھی دیوی یا دیوتا کی مورتی بنانے سے پہلے تصورات میں آشیر واد حاصل کرتے ہیں۔ درگا دیوی۔! آٹھ بازو والی، شیر پر سواری کرنے والی۔ دہشت اور قہر کی دیوی۔

''میں اس کے لیے کون سا پتھر استعمال کروں؟'' رام داس نے پوچھا۔

''سنگ مرمر۔! اس کے لیئے ہم نے ایک سل خرید رکھی ہے۔ یہاں مقبرے پر جو پتھر کا سوداگر آتا ہے اس سے خریدی ہے۔''

ان کے درمیان کچھ دیر معاوضے کی ادائیگی کے بارے میں بات ہوتی رہی۔ چرن جی لعل نے کچھ نقد رقم اسے دے دی اور چلے گئے۔ وہ خوش تھا۔ یہاں آ کر پہلی بار اس نے کمائی کی تھی اور وہ خوش گمان تھا کہ اب اس کی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ ممکن ہوگا۔ اب شاید مالتی کو کام پر نہ جانا پڑے۔ وہ ان لمحات کے بارے میں سوچ کر خوش ہوا تھا جب وہ مالتی کو بتائے گا کہ اسے کام مل گیا ہے اور اب اسے مزدوری پر نہیں جانا پڑے گا۔

......☆......

ایک نئے دن کا سورج طلوع ہو کر روشنی پھیلا چکا تھا۔ نیلگوں آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے تیر رہے تھے۔ روضہ ممتاز محل کے مجوزہ قطعہ اراضی پر معمول کے مطابق کام کا آغاز ہو چکا تھا۔ مزدور، مددگار اور ہنرمند اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایسے میں وہاں پر نصب رنگین شامیانوں میں وہ تعمیراتی فنکار اکٹھے ہو رہے تھے جنہیں وہاں خصوصی طور پر بلایا گیا تھا۔ وہاں بہت ساری کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان بڑا سا میز پڑا ہوا تھا جس کے اوپر کاغذوں کے دستے پڑے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد بلائے ہوئے سبھی فنکار جمع ہو گئے۔ صرف استاد احمد کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آ گیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''میرے محترم ساتھیوں۔! زمین کی کھدائی کا کام تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔ جس کی تفصیل میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے کچھ کاغذ نکالے اور انہیں کھول کر پڑھنے لگا۔ ''حسب منشاء زمین کو ہموار کرنے میں ہمارا پانچ سال کا عرصہ صرف ہوا ہے۔ اس میں چار سو ضرب چار سو مربع فٹ زمین کو ۴۴ فٹ گہرا کھود کر اس

میں سے نرم مٹی نکال دی گئی ہے۔اس طرح تقریباً دولاکھ ساٹھ ہزار مکعب فٹ مٹی کو نکال باہر کیا گیا ہے۔اس زمین پر ۳۱۳×۳۱۳ مربع فٹ کے مربعی قطعہ پر اصل روضے کی بنیاد ہے۔''

''کیا یہ سب دریائے جمنا کے پانی کی سیلن سے حفاظت کے لیے کافی ہوگا۔''

''نہیں۔! یہ تو آپ کو پتہ ہے روضے کی تعمیر ان محلوں کی طرز پر ہوگی جو دریا کنارے بنائے جاتے ہیں۔اس سیلن کو روکنے کے لیے میں، بنیاد کی تیاری کے لیے آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔'' استاد احمد نے کہا اور چند لمحے خاموش رہا تاکہ کوئی اگر بات پوچھنا چاہے تو پوچھ لے مگر خاموشی رہی تب اس نے کہا ''اصل بنیاد سے ہٹ کر دریا کی طرف ایک خاص نسبت سے کنویں کھودے جائیں گے۔یہ کنویں، ۳، ۷، ۱۷ کی نسبت سے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک نقشہ کھولا اور اس پر دریائے جمنا پر ایک جگہ اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہاں بسالی برج کی طرف سے جدھر پانی کے خطرناک دباؤ کا زیادہ اندیشہ ہوگا۔ مہمان خانے کی طرف کنویں زیادہ نہیں بنائے جائیں گے۔ہر دو کنوؤں کے محیطوں کے درمیان ایک تا اڑھائی فٹ کا فاصلہ ہوگا یعنی ہر متصلہ کنوؤں کے مرکزوں کے درمیان فاصلہ ساڑھے گیارہ فٹ ہوگا۔''

''ان کنوؤں کو کس سے بھرا جائے گا۔'' ایک معمار نے سوال کیا۔

''نو انچ قطر والے چالیس فٹ لمبے پانچ شہتیروں کا ایک لٹھا ۱۸ مساوی الفاصلہ پیتل کی کیلوں اور لوہے کے شکنجوں سے کسا جائے گا۔ہر کنویں میں ۱۸ لٹھے اتارے جائیں گے۔ان لٹھوں کے اطراف میں ادویات ملی ریت اور خاص طریقے سے بنائے آبی چونے کے مرکب کو دھمس کر دیا جائے گا۔اس سے کنویں کا پانی نہ صرف اچھل جائے گا بلکہ اطراف کے تمام جھرے بند ہو جائیں گے جو ان لٹھوں کو مضبوطی سے تھام لیں گے اور وہ بذات خود بنیاد کا سخت ترین جزو بن جائیں گے۔ اس طرح روضے کی بنیاد کے لیے چھتیس سو شہتیر استعمال ہوں گے یعنی سات سو بیس لٹھ۔''

''یہ لٹھ کس لکڑی کے ہوں گے۔''

''بیجا سال۔اس لکڑی کی عمر بہت طویل ہوتی ہے اس پر نہ پانی کا اثر ہوتا ہے اور نہ اس میں کیڑا لگتا ہے۔نہ گلتی ہے اور نہ سڑتی ہے۔''

استاد احمد نے کہا اور پھر ان فنکاروں کی طرف دیکھنے لگا۔یہ اس کی عادت تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ سوال کریں تاکہ سب مل کر گفتگو کریں اور مزید بہتر صورت نکل آئے۔وہ بہت دیر تک اس کے مختلف پہلوؤں اور حوالوں سے بحث کرتے

رہے۔ یہاں تک کہ وہ سب اس پر متفق ہو گئے اور بنیادوں کی تیاری کا کام شروع ہو گیا۔

اس دن بھی رام داس معمول کے مطابق بیدار ہوا تھا۔ موسم بھی اچھا تھا۔ وہ پوجا سے فارغ ہو کر اس پتھر کی سل کی طرف بڑھا جو چرن جی لعل نے بجھوائی تھی۔ سنگ مرمر کی وہ سل کئی دنوں سے اس کے ہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سفید چمکدار سنگ مرمر مکرانہ کی کان سے آیا ہے جو یہاں سے بہت زیادہ فاصلے پر تھا۔ ممتاز آباد میں روزانہ ایسے پتھروں کے قافلے اترتے تھے۔ رام داس نے پتھر کی سل پر ہاتھ پھیرا وہ کھردری تھی۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی اس قدر تھی کہ درگا دیوی کا مجسمہ بنانے کے لیے کافی تھی۔ وہ کتنی دیر تک سنگ مرمر کی اس سل میں موجود قدرتی نقش و نگار کا مشاہدہ کرتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور یوں مراقبے میں بیٹھ گیا جیسے پوجا کر رہا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ شعور صرف عبادت اور یکسوئی سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک یونہی بیٹھا رہا جب تک مالتی نے اسے کھانے کے لیئے بلا نہیں لیا۔

رام داس کافی دنوں سے بے چین تھا۔ چند دنوں سے مالتی بھی کام پر نہیں جا رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ لوگ اس سے یہ نہ پوچھ لیں کہ اگر وہ کام نہیں کرتے تو ان کے پاس رقم کہاں سے آ رہی ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ درگا دیوی کا مجسمہ تراشنے کے معاوضے میں پیشگی لے چکا ہے اور مجسمے کی تکمیل کے بعد اسے مزید رقم ملنے والی تھی۔ لیکن سوال ہنوز وہیں تھا کہ وہ لوگوں کے سوالوں کا جواب کیا دے گا۔ ہوسکتا ہے یہ خبر حکام تک پہنچ جائے اور اس سے باز پرس شروع ہو جائے، ہوسکتا اس وجہ سے مندر بنانے کا معاملہ بھی چوپٹ نہ ہو جائے اور سبھی اسے موردالزام ٹھہرائیں۔ جب وہ درگا دیوی کا مجسمہ تراشے گا تو اس کے ہمسائے بھی جان جائیں گے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ایک اکیلی سل کے بارے میں اس کی ہمسائی آرتی اس سے پوچھ چکی تھی کہ یہ کس مقصد کے لیے لائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اگر وہ پریشان رہا تو درگا دیوی کا تصور نہیں کر پائے گا۔

اس دن اچانک اس کے ذہن میں ان سارے مسائل کا حل آ گیا، وہ بھی اگر دوسروں کی طرح پتھروں پر نقش و نگار بنانا شروع کر دے تو یہاں اس جھونپڑی میں بہت ساری سلیں بھی آ جائیں گی اور لوگ اس سے نہیں پوچھیں گے کہ رقم کہاں

سے آ رہی ہے۔اس حل کے ساتھ ہی وہ غم زدہ ہو گیا کہ اسے اپنے معیار سے بہت کم درجے کا کام کرنا پڑے گا۔محض گل بوٹے تراشنے سے پتھر میں کوئی بازگشت پیدا نہیں ہوتی،کوئی پیچیدہ خطوط کا اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا۔مگر اسے دنیا کی نگاہوں سے بچنا تھا۔پھر اس نے خوب سوچ کر فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ پتھر کی سلوں پر گل تراشی کرے گا۔چند دن بعد اس نے موہن داس کے ذریعے سے اپنا یہ مسئلہ چرن جی لعل تک پہنچا دیا۔

وہاں پر بہت سے ہنر مند پتھروں کو تراشنے میں مصروف تھے۔جس سے اچھا خاصا شور ہو رہا تھا۔کوئی سنگ تراش درخت کے تلے بیٹھا ہوا اور کوئی بڑے سے شامیانے تلے بیٹھا ہوا اپنے کام میں مگن تھا۔کوئی پتھر کاٹ رہا تھا،کوئی تراش رہا تھا اور کوئی گھڑ رہا تھا۔ان میں بے شمار لوگ تھے۔وہ انہیں غور سے دیکھتا ہوا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔یہاں تک کہ وہ ایک موٹے سے ٹھگنے قد والے شخص کے سامنے جا پہنچا۔

’میں رام داس ہوں،اچاریہ ہوں۔!مجھے بلدیو داس جی سے ملنا ہے۔‘‘

’’آؤ۔!آ جاؤ،میں ہی بلدیو داس ہوں۔بیٹھو۔‘‘اس نے ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔بلدیو داس بھی ایک گل تراش تھا اور ملتان سے آیا تھا۔اس نے بڑی عزت سے رام داس کو بٹھایا اور کہا۔’’ہم دونوں ہی کا کام ایک جیسا ہے،مجسمہ سازی۔‘‘

’’ہاں۔!مگر یہاں پر ایسا کوئی کام نہیں ہے۔‘‘رام داس نے تلخی سے کہا۔

’’مگر یہاں پر اپنی ہنر مندی دکھانے کے لیے اور بہت کچھ ہے۔‘‘بلدیو داس نے کہا اور پھر چند لمحے سوچ کر بولا’’ اچھا تم یہ بتاؤ،کیا تم خاکہ سمجھتے ہو۔‘‘

’’بالکل۔!میں اس کی پیمائش بھی جانتا ہوں۔‘‘

’’چلو یہ تو بہت اچھا ہوا۔‘‘بلدیو داس نے کہا اور قریب پڑے صندوق میں سے ایک کاغذ نکالا۔پھر اسے رام داس کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔’’یہ جالی کا نمونہ ہے اور اس کا خاکہ۔یہ جالی مرقد کے اردگرد لگائی جائے گی۔دیکھو۔!اسے غور سے دیکھو۔‘‘

رام داس نے وہ کاغذ پکڑ لیا اور غور سے دیکھنے لگا۔وہ اس کی تفصیلات میں جذب ہو کر رہ گیا۔اس کے اندر کا فنکار جاگ اٹھا تھا۔اس خاکے سے ابھرنے والی پیمائشوں سے اس کے دماغ میں تصویریں بننے لگیں تھیں اور اس کے ساتھ ہی اس

کی مضبوط انگلیوں میں اینٹھن ہونے لگی۔

''شاندار۔! بہت خوب، لیکن...... یہ بہت زیادہ وقت لے گی، بہت زیادہ۔''

''اس سے ابھرنے والے نقش ونگار......؟''

''بہت سادہ ہیں، ان کی پیمائش بھی اتنی پیچیدہ نہیں۔''

''ہاں۔! مسلمان سادگی ہی کو پسند کرتے ہیں۔ یہ خاکہ ایک مسلمان طغرانویس ہی کا بنایا ہوا ہے شہنشاہ کو یہ پسند آیا ہے۔ کیا تم اسے بہت اچھے طریقے سے بنا سکتے ہو؟''

''ہاں۔! بہت آسانی سے......'' اس نے یوں کہا جیسے وہ پتھروں کو اپنی مرضی سے ڈھال سکتا ہے۔

''ٹھیک ہے اگر تم یہ کام کرو تو تمہیں چار روپے روزانہ کے حساب سے مزدوری ملے گی۔ یہ اس سے الگ ہوگی جو تمہیں درگا دیوی کے مجسمے کے لیے رقم دی گئی ہے۔'' بلدیو داس نے سرگوشی میں کہا۔

''چار روپے روزانہ۔! مگر یہ دے گا کون؟''

''اس کی تم فکر نہ کرو، میں آج ہی تمہارا نام بخشی کو دے دوں گا اور میری صوابدید وہ تمہارے نام رقم جاری کر دے گا۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر سرگوشی میں بولا ''مندر بنانے کے لیے بھی رقم چاہیے۔ تم کام کرنے والے ہو۔ یہاں بہت رقم ہے۔ شہنشاہ اس روضے کے لیے بہت رقم خرچ کر رہا ہے۔ ہم نے مندر بھی اسی پیسے سے تعمیر کرنا ہے۔ تم ان چند لوگوں میں سے ایک ہو جو مندر بنانے والے ہیں۔ اس لیے خاموش رہو اور جو کہا جا رہا ہے وہی کرتے رہو۔'' بلدیو داس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو رام داس نے خوف اور بے چینی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہاں میں سر ہلا دیا۔ پھر چند لمحے وہ اس کے پاس بیٹھا رہا اور نمستے کہہ کر اٹھ آیا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ کوئی اور پریشان کن بات کہہ دے۔

......☆......

''جہاں پناہ۔! بنیادوں کا کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔'' عبدالکریم کے جھکتے ہوئے ادب سے کہا تو شاہ جہاں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر یوں تاثر دیا کہ کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ اس پر عبدالکریم نے کہا ''اگرچہ اینٹیں بنانے کا کام جاری ہے تاہم روضہ میں استعمال ہونے والی اینٹوں کی حتمی منظوری آپ سے لینا ہے؟''

شاہ جہاں اس وقت حمام میں موجود تھا جو بڑی نفاست اور خوبصورتی سے بنایا ہوا تھا۔ وہ حرم سے ملحق تھا اور سفید سنگ

مرمر سے تعمیر کیا ہوا تھا۔شاہ جہاں غسل سے فارغ ہو چکا تھا۔اور خدام اسے پوشاک پہنا رہے تھے۔اس وقت خصوصی وزراء اس کے پاس ہوتے تھے اور دن بھر میں حل کرنے والے مسائل بیان کرتے تھے۔اس نے سب سے پہلے عبدالکریم خان کو اشارہ کیا تھا کہ وہ اپنی بات کہے۔شاہ جہاں چونکہ خود تعمیراتی راز جانتا تھا اس لیے وہ تاج محل میں استعمال ہونے والے سامان کے بارے میں خود بتاتا تھا۔

''بولو۔!'' شاہ جہاں نے کہا تو مکرمت خاں نے خدام کو اشارہ کیا۔ایک نقرئی طشتری میں چند اینٹیں رکھ کر پیش کر گئی۔

''جہاں پناہ۔! یہ مختلف حجم کی اینٹیں ہیں۔لیکن ان میں سے ایک خصوصی طور پر روضہ ممتاز محل کے لیے بنائی گئی ہے۔'' مکرمت خان نے کہا

اس وقت اینٹوں کے حجم کا کوئی مستقل پیمانہ نہیں تھا۔قلعہ آگرہ میں موجود اکبر کے محل میں ۸×۲/ ۱ ۷×۲/ ۱ مکعب انچ کی اینٹ، جہانگیر کے محل کی ۲/ ۱ ۷×۵×۴/ ۱ مکعب انچ حجم کی اینٹ، موتی مسجد کی اینٹ کا حجم ۷×۴/ ۳ ۴×۱ وغیرہ تھا۔اس کے علاوہ عام طور پر تین قسم کی اینٹ استعمال ہوتی تھی۔کچی، ادھ جلی اور پکی اینٹیں۔ پکی اینٹوں کی بھی دو قسمیں ہوتی تھیں لاکھوری (لاہوری) اینٹ اور کاکائی اینٹ۔تاج محل کے معمار نے جو خصوصی اینٹ تیار کروائی تھی اس کا حجم بہت کم رکھا تھا۔یعنی ۷×۲/ ۱ ۴×۱ مکعب انچ یہ سب سے اعلیٰ قسم کی کاکائی اینٹ تھی۔اس اینٹ کو ''پن روک'' (Water Resistant) بنانے کے لیے چربی اور ادویات کے مرکب میں بھگویا گیا تھا۔یوں ایک اینٹ اس دور کی مہنگی ترین اینٹ ثابت ہوئی تھی۔

''یہ کاکائی اینٹ ہی لگائی جائے۔'' شاہی جہاں نے حکم دیا۔

میر بخشی آگے بڑھ کر جھکا اور نہایت ادب سے بولا

''اس بار مون سون کی بارشوں نے بہت تباہی مچائی ہے۔فصلیں بہت کم ہوئی ہیں، کاروبار میں مندے کا رجحان ہے، سلطنت کی آمدنی بہت کم ہے۔اس کے علاوہ دکن کا مسئلہ ہنوز ویسے ہی ہے۔اطلاعات ہیں کہ وہاں بغاوت کی منصوبہ بندی کی جارہی ہے۔مغل فوج اس سے نپٹنے کے لیے تیار ہے اور کسی بھی وقت کوچ کر سکتی ہے۔''

''گھبراؤ مت میر بخشی خزانہ بھرا ہوا ہے۔کسی بھی مہم کے لیے سرمایہ کم نہیں ہوگا۔جہاں بھی خرچ کی ضرورت ہے دل

کھول کر خرچ کرو۔ میں حکم دیتا ہوں کہ روضہ ممتاز محل کی لاگت میں کہیں کمی نہ ہو اور اس کے مصارف کے لیے اکبر آباد، نگر چند اور اس کے ملحقہ مواضعات کی آمدنی وقف کر دی جائے۔'' شاہ جہاں نے کہا تو وہاں پر ایک دم خاموشی چھا گئی۔

پھر چند دن بعد شاہی فرمان کے مطابق اکبر آباد اور نگر چند کے یہ مواضعات تاج محل کے مصارف کے لیے وقف کر دیئے گئے۔ دھنولی، اوہالی، ککتھلا، دھمری، دگروتہ، بودھانہ، سامو، اونچا، کرمنہ، دیتوره، اتوس، اوسرا، سدہرین، بچیری، بسہی، پتھولی، تھیری، اتوار، ملہہ پور، مراونده، جوینی، چار واخرو، مدینہ، دھاند پور، شیخ پور، ست ہندی، نور پورہ، رائے پور اور نگر چند۔

......☆......

رام داس پتھر کی ایک سل کے پاس بیٹھا بڑے پیار سے اس پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ بلدیو داس نے یہ سلیں اس کی جھونپڑی تک بھجوا دیں تھیں تا کہ وہ وہیں رہ کر اپنا کام کرتا رہے۔ جالی کے لیے مخصوص پتھر کی سلیں بہت اعلیٰ تھیں۔ رام داس پتھروں کو سمجھتا تھا۔ یہ اس پتھر سے زیادہ قیمتی تھی جو درگا دیوی کے مجسمے کے لیے اس کی جھونپڑی میں پڑا تھا۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی اس قدر تھی کہ وہ ان سلوں کو اس سل سے تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ پیار سے پتھر کی سل پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ وہ خود میں وہی مراقباتی کیفیت محسوس کر رہا تھا جب وہ کسی مجسمے کو تراشنے سے پہلے خود میں پاتا تھا۔ اسے یہ پوری طرح احساس تھا کہ یہ کوئی مجسمہ نہیں محض ایک جالی ہوگی جو مرقد کے اردگرد لگائی جانے والی ہے لیکن اس کے اندر کی کیفیت اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ خاکہ تھا جو اس نے اس پتھر کی سل پر تراشنا تھا۔ یہ ہندسیاتی، غیر تخلیقی سا خاکہ اس کے لیے اگرچہ خوشگواریت نہیں رکھتا تھا لیکن جہاں اس پتھر نے نصب ہونا تھا وہ بہت اہم جگہ تھی۔ اسے اس خاکے میں کوئی حسن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ محض چند قطاریں جو لمبائی اور چوڑائی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود پتھر پر ہاتھ پھیرتے ہی اس کے اندر جو خوبصورت احساس ابھرنے لگے تھے وہ ان پر حیران تھا۔

رام داس کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ خواب میں ہو۔ وہی مراقباتی کیفیت جو پوجا کے وقت ہوتی ہے۔ اس کا بیٹا گوپال بھی اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کھیل سے زیادہ اپنے باپ کی مدد کو ترجیح دینے لگا تھا کہ وہ فن سیکھ پائے جو اس کی پشتوں سے چلا آرہا تھا۔ کتنا ہی وقت یونہی گذر گیا۔ تب اچانک رام داس اٹھا اور گوپال کو وہ جگہ صاف کرنے کے لیے کہا جہاں اس نے کام کرنا تھا۔ گوپال نے فوراً ہی وہ جگہ صاف کر دی۔ رام داس نے گوپال کی مدد سے وہ سل وہاں پر رکھی۔ پھر

نہادھوکر صاف کپڑے پہنے اور آرتی کا تھال لے کر اس پتھر کی سل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں نجانے کیا پڑھتا چلا جا رہا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور آرتی کا تھال گول گول دائرے میں گھماتا چلا جا رہا تھا۔ تھال میں موجود دیا جل رہا تھا اور اس کی لو تھرتھرا رہی تھی۔ سل کی آرتی اتارنے کے بعد اس نے ناریل پھوڑا اور سل کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے خاکے والا کاغذ اٹھا کر اسے غور سے دیکھا اور پھر چاک مٹی کے ساتھ سل پر نقش و نگار ابھارنے لگا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے کام کر رہے تھے۔ دو گھڑی کام کے بعد وہ نقش و نگار ابھار چکا تھا۔ اب اسے تراشنا تھا جس میں نجانے کتنا وقت صرف ہونا تھا۔

......☆......

بارش کے بعد موسم بہت خوشگوار ہو چکا تھا۔ دریائے جمنا کی طرف سے آنے والی ہوائیں بھیگی ہوئیں تھیں۔ سہ پہر ہونے کو تھی اور شاہ جہاں دیوان خاص میں انتہائی غمزدہ حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی خدمت پرست رضا خاں موجود تھا۔ ان کے درمیان کافی دیر سے خاموشی تھی۔

''حضور۔! اگر حکم ہو تو دل بہلانے کا انتظام کیا جائے۔'' رضا کا اشارہ رقص و موسیقی کی محفل کی طرف تھا۔ جب سے ممتاز محل کا انتقال ہوا تھا شاہ جہاں نے ایسی ساری محفلیں یکسر موقوف کر دیں تھیں۔ ہفتوں تک اس نے سلطنت کے امور دیکھے تک نہیں تھے۔ پھر دھیرے دھیرے امور سلطنت میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ مگر تمام مسرت انگیز باتیں چھوڑ دی تھیں۔ نہ رقص و سرور کی محفلیں، نہ زیورات، یہاں تک کہ لذیذ کھانے بھی۔ وہ اکثر ممتاز محل کے کمرے میں جا کر رونے لگ جاتا تھا۔

''رضا۔! میں یہ بات مانتا ہوں کہ میں بہت ضدی، ہٹ دھرم اور مہم جو قسم کا ہوں۔ میں ایسا ہوں تو مجھے آوارہ وطنی پر مجبور ہونا پڑا تھا لیکن۔! ارجمند کا ساتھ اس قدر غنیمت تھا کہ مجھے ہی نہیں وہ میرے الجھے ہوئے ذہن کو بھی قابو میں رکھتی تھی۔ سب کچھ بدل گیا ہے رضا، سب کچھ......!''

شاہ جہاں نے افسردگی ملے لہجے میں مایوسی سے کہا۔

شہنشاہ شاہ جہاں۔! رات کے آخری پہر میں بیدار ہو جایا کرتا تھا۔ وضو کر کے سیدھے مسجد چلا جاتا، نماز صبح تک وہ نوافل پڑھتا، فجر کے بعد وظائف و ادوار میں مشغول ہو جاتا۔ مسجد ہی سے اٹھ کر وہ جھروکہ درشن میں آ جاتا۔ ایسے وقت میں وہ بہت ساری درخواستیں وصول کرتا جو رعایا کی طرف سے دی جاتی تھیں۔ یہ اس کی انصاف پروری تھی کہ رعایا بلا جھجک اس

تک رسائی حاصل کر لیتی تھی۔ درشن کے بعد وہ فوجی دستوں کا معائنہ کرتا، کبھی کبھار ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا، پھر وہیں سے دیوان عام میں آ جاتا۔ مملکت کے مسائل، رعایا کی درخواستوں، منصب داروں کے معروضوں کو دیکھتا، تجویزیں کرتا، علماء، فضلاء امراء کو شرف باریابی بخشتا۔ پھر غسل سے فارغ ہو کر میر بخشی اور میر سامان کے علاوہ وزراء کے کاغذات پر منظوریاں دیتا۔ پھر دیوان عام میں حکومت کے سیاسی وانتظامی مسائل طے ہوتے۔ یہاں سے وہ شاہ برج چلا جاتا۔ یہ وہ اہم مقام تھا جہاں راز کی کاروائیاں اور نازک ترین مسائل زیر بحث آتے۔ ظہر وہ حرم سرا میں پڑھتا اور پھر خاصہ ملاحظہ کرتا۔ یہیں سہ پہر تک قیلولہ ہوتا اور اس دوران ملکہ ممتاز محل کی مصاحب خاص ستی النساء فقراء، مساکین، غربا و مستحقین کی درخواستوں کی فہرست مرتب کرتی۔ بادشاہ کے بیدار ہونے پر وہ پیش کر دی جاتیں۔ بادشاہ حسب استحقاق سب کو نوازتا۔ ممتاز محل غریب لڑکیوں کی شادی میں حد درجہ دلچسپی لیتی تھی، جہیز کا سامان اور کبھی کبھی تو دولہا دولہن کی رخصتی محل میں سے ہوتی، نماز عصر تک یونہی چلتا۔ پھر بادشاہ تفریحات سے دل بہلاتا، کبھی ہرنوں کی لڑائی دیکھتا، کبھی رقص و سرور کی محفل جمتی۔ پھر مغرب وعشاء کے بعد وہ حرم سرا میں چلا جاتا لیکن اس دن کے تمام تصفیہ طلب مسائل نمٹا کر۔ رات کا خاصہ لینے کے بعد رقص و سرور کی محفل جمتی۔ خاتون گائیکوں کے نغمات سے لطف اندوز ہوتا اور پھر خواب گاہ میں چلا جاتا۔ پردے چھوڑ دیئے جاتے۔ خواب گاہ کے باہر مختلف علوم وفنون کے ماہرین حاضر رہتے۔ رات کے پہلے پہر تک وہ علمی مذاکرے، تاریخی واقعات، بزرگوں کی سیرت، بادشاہوں کی سوانح عمریاں اور فلفسیانہ مباحث پر گفتگو ہوتی۔ بادشاہ خواب گاہ میں ہی اسے سنتا رہتا۔ اس کے بعد کامل تخلیہ ہو جاتا اور وہ سو جاتا۔ ممتاز محل کے بعد سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔

''جہاں پناہ۔! امور مملکت تو چلانا ہیں، آخر کب تک............'' رضا نے کہا تو شاہ جہاں نے ایک سرد آہ بھر لی اور نہایت دکھ سے کہا

''زندگی بہر دیدن یار است...... یار چوں نیست زندگی عار است۔''

''حضور۔! میں نہایت ادب سے پھر کہوں گا، آخر کب تک......؟''

''جب تک یہ زندگی ہے۔'' شاہ جہاں نے کھڑے ہو کر کہا۔ وہ دھیرے دھیرے اس جھروکے کی طرف بڑھ گیا وہاں سے دریائے جمنا کے پار وہ جگہ دکھائی دیتی تھی جہاں روضہ ممتاز محل تعمیر ہونے کو تھا۔ اس نے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا ''میر بخشی دکن کے معاملات کے بارے بہت جلدی میں ہے، میرا خیال ہے کہ ابھی اس پر مزید غور کرنا چاہیے تمہارا کیا خیال

ہے؟"

"جہاں پناہ۔! ہمیں اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔اورنگ زیب کو حکم پہنچا دو کہ وہ فوج لے کر دکن جائے۔اس کی تمام تر تفصیلات دیکھو اور فوج کے ساتھ رابطہ کی ذمہ داری نبھاؤ۔"

"جیسے حکم جہاں پناہ۔!" رضا نے جھکتے ہوئے کہا اور واپس مڑ کر چلا گیا۔تبھی شہنشاہ شاہ جہاں دھیرے دھیرے بڑھتا ہوا اس جھروکے کے پاس پہنچ گیا اور وہاں سے دیکھنے لگا۔دریا کے پار لوگوں کی ایک فوج کام میں مصروف تھی۔مرد، عورتیں، ہاتھی، بیل......ایک دائمی یادگار کی تخلیق کے لیے انہیں خبر نہیں تھی کہ وہ کس قدر اہم عمارت کی تعمیر میں حصہ لے رہے ہیں۔شہنشاہ کتنی دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔یہاں تک کہ غمزدہ نگاہوں کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

رات خاصی ڈھل چکی تھی۔رام داس کی جھونپڑی میں سکوت تھا۔اس کی بیوی مالتی اور بچے سو رہے تھے۔جبکہ وہ آنکھیں بند کر کے مراقبے کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔موٹے موٹے نین نقش کے ساتھ گہرا سانولا رنگ اور اس پر خشخشی داڑھی عجیب سی لگ رہی تھی۔دِیے کی روشنی میں وہ پوری طرح واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔وہ درگا دیوی کا وہ تصور حاصل کرنا چاہتا تھا جسے وہ مجسمے کی صورت میں ڈھال سکے۔بہت عرصہ گذر چکا تھا لیکن اپنی منتشر خیالی کے باعث وہ تصور حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔اسے یکسوئی حاصل ہی نہیں ہو پائی تھی۔اس دوران چرن جی لعل اور دوسرے لوگ باری باری اس کے پاس آ چکے تھے۔وہ نہ صرف اسے یاد دہانی کروانے آتے تھے بلکہ اسے مندر کی تعمیر بارے صورت حال بھی بتاتے تھے۔ممتاز آباد سے باہر مندر کے لیے زمین حاصل کر لی گئی تھی اور وہیں پر گھنے درختوں کے جھنڈ میں پنڈت کو جھونپڑی ڈال کر دی جا چکی تھی۔وہ وہاں پر خصوصی جاپ کر رہا تھا کہ مندر بنانے کے لیے آسانیاں پیدا ہو جائیں۔وہیں پر اینٹ اینٹ کر کے تھوڑا بہت ساز و سامان بھی اکٹھا کیا جا رہا تھا۔کچھ دنوں سے وہاں پر پروہت بھی آ گئے تھے۔خیال یہی تھا کہ اب بادشاہ تک جلد ہی رسائی کر لی جائے گی۔موہن لعل کے ساتھ رام بھوج بھی شامل ہو گیا تھا۔وہ دونوں ہی تاج

محل کے لیئے تعمیراتی سامان مہیا کر رہے تھے۔ وہ دونوں تاجر تھے۔ تاہم رام بھوج پتھروں کا کاروبار کرتا تھا اور وہاں سے کثیر رقم کما رہا تھا۔ مندر بنانے کے لیے وہ سب سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ ان سب کی خواہش تھی کہ جلد از جلد شاہ جہاں تک رسائی حاصل کریں اور مندر کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے۔ انہی تذبذب کے دنوں میں انہیں امید کی کرن دکھائی دی۔ کسی نے انہیں بتایا کہ شاہ جہاں کی بجائے داراشکوہ سے رابطہ کریں۔ وہ ہندوؤں کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف انہیں اجازت دلوا دے گا بلکہ مندر کی تعمیر کے لیے مدد بھی فراہم کرے گا۔ سو وہ اسی کوشش میں لگ گئے تھے۔ سب کی یہی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد مجسمہ بنا لے۔ پہلے ہی اتنا وقت لگ گیا اور مجسمہ تراشنے میں نجانے اسے کتنا وقت درکار تھا۔ اس شام اس نے سنگ مرمر کی وہ سل اپنے سامنے رکھی، اس کی آرتی اتاری اور مراقبے میں بیٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس شام اسے تصور ضرور حاصل ہو جائے گا۔ اسی حالت میں نجانے اسے کب نیند آ گئی اور وہ سو گیا۔

شاید اس کی آنکھ شاہی نقارہ بجنے ہی سے کھلی تھی۔ کیونکہ جب وہ اچانک بیدار ہوا تھا تو اس وقت بادشاہ کے جھروکہ درشن میں آنے کے اعلان کے طور پر شاہی نقارہ بج رہا تھا۔ اس نے زیادہ توجہ نہیں دی بلکہ وہ مسرور تھا۔ اس نے خواب میں تصور حاصل کر لیا تھا۔ درگا دیوی کھڑی ہوئی، مسکراتی ہوئی، کینہ پرور، جس کے آٹھ ہاتھ ناگہانی افتاد کی مانند تباہی پھیلانے کو تیار تھے۔ اس نے پہلے بھی درگا دیوی کا مجسمہ تراشا تھا لیکن اس مجسمے کے لیے یہ بالکل مختلف تصور تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور جھونپڑی کے ایک کونے میں دھرے ہوئے لکشمی دیوی کے مجسمے کے سامنے ہاتھ جوڑے اور اشنان کرنے کے لیے نکل گیا۔

اس دن اس نے مجسمہ تراشنے کی شروعات کر دی۔ اس نے سب سے پہلے اپنی بیوی مالتی کی مدد سے سنگ مرمر کی اس سل کو دھویا جسے اس نے تراشنا تھا۔ پھر آرتی اتاری، اس پر پھول پھینکے، ناریل توڑا اور اس سل پر کالا رنگ کر دیا۔ اس نے جالی بنانے کے لیئے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ مجسمہ تراشنے میں بھی اتنی ہی احتیاط کی ضرورت تھی جتنی جالی تراشنے میں۔ پہلے پہل اس نے جالی کے خاکے کو محض سادہ اور آسان سمجھا تھا لیکن جب اس نے تراشنا شروع کیا تو معلوم ہوا یہ کس قدر مشکل ہے۔ ایک خط، لکیر یا بسولے کی ہلکی سی غلط ٹھوکر اس کے سارے حسن کو تباہ کر سکتی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اسے تراش رہا تھا اور ابھی تک جالی مکمل نہیں کر پایا تھا حالانکہ مکمل جالی کا وہ محض ایک تختہ تھا۔ اسے مختلف لوگ تراش رہے تھے۔ اس میں کافی سارے تختے لگنے تھے جو ایک دن ملکہ ممتاز محل کے مرقد کے اطراف میں نصب کر دیئے جانے تھے۔ اسے یہ ڈر تھا کہ اتنا طویل کام شاید اس کی زندگی میں مکمل نہ ہو پائے۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے کی یہ فن منتقل کرنے میں بھی تیزی دکھا رہا تھا۔ اب جا

کر اسے احساس ہوا تھا کہ دیوی دیوتاؤں کی کیا مرضی تھی کہ اس نے اتنا لمبا سفر کیا تھا۔

رام داس سنگ مرمر کی سل کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے اوزار ایک ترتیب کے ساتھ پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بسولی اٹھائی، ہتھوڑا پکڑا اور انتہائی ادب سے جھک کر کہا

''مہاوشنو۔! میرے ہاتھوں کو قوت دے، میری راہنمائی کر کہ میں درگا دیوی تراشنے لگا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے سنگ مرمر کی سل پر بسولی رکھی اور ہتھوڑے سے ٹھوکر لگا دی۔ مجسمہ کی ابتداء ہو گئی۔

......☆......

رنگین شامیانوں میں تعمیراتی فنکاروں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ محکمہ بیوتات کے علاوہ خاص تاج محل کے لیے بنائے گئے محکمہ کے لوگ بھی موجود تھے۔ اس محفل میں بہت ساری باتیں طے ہو چکی تھی۔ اگر چہ شاہ جہاں کو سنگ مرمر سے عشق تھا اور تاج محل کے لیے ملک کے مختلف علاقوں سے سنگ مرمر ابھی آ رہا تھا۔ تاہم راجھستان، اودھے پور، وسطی ہند، کانگڑہ، چار کوہ اور مکرانہ سے آئے سنگ مرمر میں سے سب سے بہترین سنگ مرمر کا انتخاب کیا گیا تھا۔ تعمیراتی فنکاروں نے ان سب سنگ مرمر کو دیکھا اور اس کا مشاہدہ کر لیا تھا۔ ان میں صرف مکرانہ سے آنے والا سنگ مرمر ہی ایسا تھا جس میں دیگر خوبصورتی کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ اپنا رنگ بھی بدلتا تھا، طلوع سحر کے وقت خوابیدہ نارنجی، دوپہر کے وقت آنکھیں چندھیا دینے والا سفید، سر شام مسحور کن زرد اور چاندنی میں اس کا حسن ماورائی ہو جاتا تھا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ ممتاز محل کے مقبرہ میں یہی سنگ مرمر استعمال کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ گچ کی تیاری شروع کروا دی گئی تھی۔ اس کے بنانے کا مخصوص طریقہ تھا، باریک کنکر اور آبی چونے کو ملایا جاتا پھر اس میں گڑ، رومی مصطلگی، ارہر کی دال، گوند، بیسن اور پٹ سن کو مختلف تناسب سے ملایا جاتا، پھر کیمیاوی پانی سے اس کو تیار کیا جاتا تھا، ایسے گچ کو انتہائی لیس دار اور کس دار ہونے کے لیے وقت چاہیے ہوتا تھا۔ اس لیے اس کی تیاری شروع کروا دی گئی تھی۔

اس دن کی کاروائی مکمل کر لینے کے بعد وہ یونہی باتیں کر رہے تھے۔ تعمیراتی فنکاروں میں مختلف مذاہب کے لوگ تھے۔ اس کے علاوہ اپنے طور پر وہ علمی لوگ بھی تھے۔ انہی باتوں میں مقبرہ کی تاریخی حیثیت پر باتیں شروع ہو گئیں تھیں۔

''مقبروں کی شروعات مصریوں نے اہرام بنا کر کی تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ میت زندہ ہو جاتی ہے اور اسے پھر ضروریات زندگی کی ضرورت پڑتی ہے، اس لیے مصریوں نے اہرام، اپنے شاہی محلوں سے بھی زیادہ خوبصورت بنائے اور

ان میں زیادہ پائیداری تھی۔'' اسماعیل آفندی نے کہا۔

''ایسا عقیدہ تو عراق والوں کا بھی تھا، اسی طرز عقیدہ کے ساتھ انہوں نے مقام اُر (UR) پر مقبرے بنائے ہیں۔''

ایک اور فنکار نے کہا

''مقبرے کا دوسرا دور ایران سے شروع ہوتا ہے۔ سائرس اعظم کو، پھر سائرس دوئم جس کا انتقال پرسی لولیس میں ہوا تھا، اس کو پہلے سے بنائے گئے مقبرے میں دفن کیا گیا تھا۔ پھر شاہی خاندان کے افراد اسی مقبرے میں دفن کئے گئے تھے۔''

''یونانی بھی اس سے پیچھے نہیں ہیں۔ انہوں نے بھی مدفن پر مقبرے تعمیر کئے ہیں۔ ماوسولس کو دفن کیا گیا تو اس پر مقبرہ بنایا گیا۔''

''ہندوستان میں بھی پہلے دفن کا طریقہ رائج تھا۔ وادی سندھ میں دفن کرنے کے تین طریقے رائج تھے، میت کے جسم کو دفن کرنا، میت کو جلانے کے بعد محض راکھ کو دفن کرنا یا جسم کا گوشت ختم ہو جائے پر صرف ہڈیوں کو دفن کرنا۔ ہندوستانی اسٹوپا دراصل گوتم بدھ سے پہلے کے مقبرے ہیں۔ ان اسٹوپا میں یا تو شاہی خاندان کے افراد دفن کئے جاتے تھے یا پھر رشی منی وغیرہ۔ اسے رواج تو بدھ مت کے ماننے والوں نے دیا ہے کیونکہ گوتم جی کی وصیت تھی کہ اس کے جسم کو ایسے اسٹوپا میں دفن کیا جائے جس کے چاروں طرف راستے ہوں۔''

''اسی طرح تاتاری شہزادوں کے مقبرے انہی بارہ دریوں میں بنائے جاتے ہیں جہاں ان کی تفریح گاہیں ہوتی تھیں۔''

''اسلام میں مقبرے تعمیر کرنے کی کوئی ترغیب نہیں ملتی۔ تاہم پہلا مقبرہ عباسی خلیفہ المنتصر کا بنایا گیا تھا، اس مقبرے کو اس کی ماں نے تعمیر کروایا تھا جو یونانی نژاد تھی۔''

''ان سب مقبروں میں دہرے گیند کی مثال کہاں کہاں ملتی ہے؟''

''ہندوستان میں تو گپتا عہد کا صرف ایک مندر ملا ہے۔ اتر پردیش اور مدھیہ پردیش میں دو ایک اور ملے ہیں۔ اس کے علاوہ بیت المقدس کا گنبد دہرا ہے جسے ''قبۃ الصخرا'' کہتے ہیں۔ اب یہ معلوم نہیں کہ ان میں پہلا کون سا ہو سکتا ہے؟''

''دہرا گنبد بنانے کا اصل میں مقصد کیا ہوتا ہے؟''

''تا کہ اندرونی گنبد کی تزئین کو موسمی تغیرات سے بچایا جا سکے۔ اس میں وزن کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ دراصل

بیرونی گنبد کی نسبت سے اندرونی گنبد کا ابعاد، کروی یا نیم کروی پھیلاؤ کو دیکھا جاتا ہے۔اسی تناسب سے بلندی دی جاتی ہے کہ عمارت کا حسن بگڑے نہیں۔ پھر تزئین کاری جس میں خطاطی، پچیکاری، مرصع کاری، رنگ سازی وغیرہ تبھی فائدہ مند ہوتی ہے اگر اس کا حسن برقرار رہے۔ یہ صرف دہرے گنبد کی وجہ سے ممکن ہو پاتی ہے۔''

''شہنشاہ کو دہرے گنبد کا خیال کیونکر آ سکتا ہے اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے۔''

''ہاں۔! سکندر لودھی اور ہمایوں کے مقبرے دوہرے گنبد والے ہیں۔''

''بہر حال۔! بنیادوں کا کام جونہی مکمل ہوتا ہے تو ہم شہنشاہ کے حضور اپنی ساری باتیں جو طے ہو چکی ہیں رکھیں گے۔ان سے مشورہ کریں گے۔ میں اسی نشست میں تاج محل کی پیمائش کے بارے میں آگاہ کروں گا اور اس میں کتنا وقت درکار ہوگا۔اس کا بھی اندازہ لگا لیا جائے گا۔'' استاد احمد نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''تو پھر آج کی محفل برخواست کی جائے۔'' مکرمت خان نے کہا تو سبھی ایک ایک کر کے اٹھتے چلے گئے۔

شہنشاہ شاہ جہاں محل کے اس گوشے میں بیٹھا تھا جو ممتاز محل کو انتہائی پسند تھا۔وہ اکثر وہاں بیٹھا کرتی تھی۔یہیں پر ان دونوں کے درمیان محبت کی ڈھیروں باتیں ہوئیں تھیں۔اس کمرے کا فرش گہرے اور پیچیدہ نقش و نگار والا تھا۔جس پر دھوپ پڑتی تو وہ اور زیادہ چمک جاتا تھا۔سہ پہر کی دھوپ جب جالی میں سے چھن کر آتی تو سفید جالی کا رنگ طلائی ہو جاتا۔ یہ مکرانہ کے سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی جس کا رنگ بدلتا رہتا تھا۔وہ ممتاز محل کے مقبرے پر بھی یہی سنگ مرمر لگانا چاہتا تھا۔ ممتاز محل اور تاج محل کے بارے میں سوچتے ہوئے اچانک اس نے آہ بھری۔

''جہاں پناہ۔! کیا سوچ رہے آپ؟'' رضا نے انتہائی ادب سے پوچھا

''رضا۔! میں سوچ رہا ہوں کہ ساری دنیا تاج محل کو دیکھے گی لیکن وہی اسے نہیں دیکھ پائے گی جس کے لیے یہ بنایا جا رہا ہے۔کاش، میں اس کی زندگی میں ہی اسے تعمیر کرواتا، وہ دیکھ تو سکتی۔''

''وقت...... جہاں پناہ......وقت، کل کیا ہوگا، کس نے جانا۔''

''ہاں۔! پتہ نہیں میں بھی تاج محل کے تعمیر ہو جانے تک زندہ رہوں گا بھی یا نہیں۔''

''خدا آپ کا سایہ ہم پر سلامت رکھے آپ ضرور ایسا دیکھ پائیں گے۔''

''خدا جانے۔'' شہنشاہ نے مایوسی سے کہا اور اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ یونہی خاموش بیٹھا رہا یہاں تک کہ چند آنسو لڑھک کر اس کی گالوں تک آ گئے۔

''بادشاہ سلامت، میر بخشی، باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔'' خادم کے یوں کہنے پر وہ چونکا اور اشارے سے باریابی کی اجازت دے دی۔

میر بخشی باریاب ہوا۔ اس نے تعظیم دی۔ اس نے شاہ جہاں آنکھ میں چمکتے ہوئے آنسو کی جھلک دیکھ لی تھی۔ تاہم اسے نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولا

''بادشاہ سلامت۔! دکن پر فوج کشی کے لیے ہمیں تیزی سے عمل کرنا چاہیے۔''

''فوج کی کمان کون کر رہا ہے؟''

''شہزادہ اورنگ زیب۔!'' میر بخشی نے ادب سے مگر جھجکتے ہوئے کہا

''اگر وہ تیار ہے تو فوج کی روانگی کا بندوبست کر دیا جائے۔'' شہنشاہ نے تیزی سے کہا

''بادشاہ سلامت۔! شہزادہ اورنگ زیب ابھی نو عمر، نا تجربہ کار اور نو آزمودہ ہے۔ دکن کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ وہ بغاوتوں، شورشوں اور سازشوں کا گڑھ رہا ہے۔ کیا آپ مطمئن ہیں کہ اسے ہی روانہ کر دیا جائے۔''

''ہاں۔! میں اس سے متعلق بہتر جانتا ہوں۔''

''کیا شہزادہ دارا شکوہ کو اس معاملے میں اپنا حق استعمال نہیں کرنا چاہیے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ دارا کا حق زیادہ ہے، وہ ولی عہد سلطنت بھی ہو گا۔ لیکن وہ یہیں رہے گا اور فوج کی کمان اورنگ زیب کرے گا، اسے ہی دکن جانا ہو گا۔''

میر بخشی خاموش ہو گیا اور قدرے مایوس بھی۔ اسے یہ گمان ہو رہا تھا کہ ممتاز محل کی جدائی کا صدمہ اور تاج محل کی تعمیر کے باعث شہنشاہ شاہ جہاں اور سلطنت کی طرف بہت کم توجہ دے پا رہا تھا۔ اس کی بے توجہی کے باعث شہزادہ دارا شکوہ امور سلطنت میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ شہنشاہ کا زیادہ وقت تنہائی میں گذر رہا تھا اور مملکت کے لیے بہت کم وقت ہوتا تھا اس کے

پاس۔ یوں امور سلطنت بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ وزراء اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اب یہی دکن کی طرف فوج کی روانگی ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ایک ماہ سے زائد ہو گیا تھا لیکن فوج روانہ نہیں ہو پائی تھی۔ شہنشاہ کی خاموشی طویل ہو گئی تھی۔ میر بخشی کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی شہنشاہ، اورنگ زیب ہی کو بھجوانے پر کیوں اصرار کر رہا ہے۔ دارا۔! جس کا زیادہ وقت عیش و عشرت، علمی و ادبی مباحث اور محفلوں میں گذرتا تھا۔ اس میں میدان جنگ میں جانے کے اچھے جوہر تھے لیکن چونکہ وہ شاہ جہاں کا پسندیدہ اور لاڈلا بیٹا تھا اس لیے دارا کے بارے میں وہ نرم گوشہ رکھتا تھا۔ میر بخشی نے کندھے اچکائے اور واپسی کے لیے اجازت چاہی۔

''رضا۔! کبھی کبھی وقت کس قدر نامہربان ہو جاتا ہے۔ زندگی صحرا لگنے لگتی ہے۔ میں ایک سلطنت کا حکمران ہوں۔ ہر شے میسر ہے مگر میں پھر بھی ناخوش اور تنہا ہوں؟''

''جہاں پناہ۔! یہ معاملات محبت ہیں، اور محبت۔! بس محسوس کی جا سکتی ہے۔''

''ہاں۔! کسی شے کی اہمیت کا اس وقت اندازہ ہوتا ہے جب وہ چھن جائے۔'' شہنشاہ نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ تبھی خادم نے آ کر کہا۔

''جہاں پناہ۔! امانت خاں شیرازی باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔''

''ہاں۔! اسے بلاؤ، میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔'' شاہ جہاں نے کہا اور پھر قریب پڑے ہوئے کاغذوں کے مسودے سے چند کاغذ نکال لیے اور انہیں پڑھنے لگا۔ چند لمحوں بعد امانت خاں شیرازی حاضر ہو گیا اس نے جھک کر تعظیم دی۔

امانت خاں شیرازی، اپنے وقت کا عماد تھا۔ ماہر خطاط جسے خصوصی طور پر قندھار سے بلوایا گیا تھا۔ نقشہ کی قطعیت اور چوبی نمونہ بن جانے کے بعد کسی تاخیر کے بغیر کام شروع ہو گیا تھا۔ سنگ مرمر پر گل کاری و تزئین کاری کا کام وقت اور محنت چاہتا تھا۔ اسے اپنا کام آرائش و تزئین کے خاکے کے مطابق بہت پہلے شروع کرنا پڑا تھا۔ اپنے اپنے فن کے مختلف ماہرین کام میں مصروف ہو گئے تھے۔

شہنشاہ شاہ جہاں نے نہ صرف تعمیراتی امور کو بہترین انداز میں سمجھتا تھا بلکہ وہ بہت اچھا خوش نویس بھی تھا۔ جہاں اس نے تاج محل کی خوبصورتی کے ہر پہلو کو مدنظر رکھا، وہاں خطاطی سے بھی اسے مزین کرنا تھا۔

''امانت خاں، ہم نے قرآن پاک سے یہ سورتیں اور آیات منتخب کی ہیں انہیں دیکھو!'' شاہ جہاں نے وہ کاغذ بڑھایا۔ رضا نے وہ کاغذ پکڑ کر امانت خاں کو دے دیا۔ وہ کچھ دیر تک اسے پڑھتا رہا اور پھر تصدیق طلب انداز میں پڑھنے لگا۔

''سورہ یسین، سورہ تبارک الذی، انا فتحنا اور الدہر......سورہ التکویر، انفطار، الانشقاق، البینہ اور حم سجدہ، مومن، حشر اور آل عمران کی آیتیں......''

''ہاں۔! ممتاز محل اہل تشیع عقیدہ رکھتی تھیں، میں نے اسی مناسبت سے انتخاب کیا ہے؟'' شاہ جہاں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ پھر جلدی سے بولا، ''ان سورتوں اور آیات کو کہاں کہاں لگایا جائے گا، یہ آپ طے کر کے مجھے بتاؤ گے۔''

''جہاں پناہ۔! کیا آپ میری یہ رہنمائی کریں گے کہ ان آیات کو کس خط میں لکھا جائے؟''

''آپ اسے چند نمونوں میں لکھو۔ تاہم میرے خیال میں خط ثلث میں آپ اگر لکھو گے تو اس میں حروف کی کشش اور ان کا خم دوسرے بیل بوٹوں سے مربوط ہو کر حسن میں اضافے کا باعث ہوگا۔''

''جہاں پناہ۔! قاعدہ یہی ہے کہ میں پہلے کاغذ پر لکھ کر آپ کو دکھاؤں گا۔ پھر اسے سنگ موسیٰ میں سے حروف تراش کر سنگ مرمر میں جڑیں جائیں گے......اس میں وقت صرف ہوگا۔''

''تب تک......تب تک امانت خاں...... جب انہیں نصب کیا جانا ہوگا تو یہ تیار ہوں۔ تم چاہے جتنی مرضی افرادی قوت لگالو، اجازت ہے۔''

''جی جہاں پناہ۔! میں پوری جان سے محنت کروں گا۔'' امانت خاں نے کہا تو شاہ جہاں اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ جس کا مطلب تھا کہ اب امانت خاں کو جانے کی اجازت ہے۔ وہ تعظیم سے جھکا اور پلٹ گیا۔

......☆......

مالتی اپنی جھونپڑی میں بیٹھی ہوئی خیالوں میں گم تھی۔ دِیے کی مدہم اور زرد روشنی سے اس کا چہرہ مزید پژمردہ لگ رہا تھا۔ وہ چند دنوں سے بیمار تھی۔ لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ گھر کے کام کاج نہ کر سکے۔ اس نے ذرا فاصلے پر بیٹھے ہوئے رام داس کو دیکھا، جو درگا دیوی کا مجسمہ بناتے ہیں پوری طرح مگن تھا اسے یہ قطعاً خیال نہیں تھا کہ اس کی بیوی جاگ رہی ہے اور اس کی توجہ کی منتظر ہے۔ مالتی کو چکر آ رہے تھے اور اس کا سر گھوم رہا تھا مگر بسولے اور ہتھوڑے کی ٹھک ٹھک سے وہ سو نہیں پا رہی

تھی۔

اس نے سوچا کہ وہ گاؤں میں کتنی خوش تھی۔ وہاں ان کا اپنا گھر تھا۔ مویشی تھے، اس کے ماں باپ بہن بھائی، جب چاہے وہ ان سے مل لیتی تھی۔ وہ طلوع صبح سے قبل اٹھتی تھی، ملگجے اندھیرے میں پام کے درخت کتنے خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ پھر دھیرے دھیرے باتیں شروع ہوتیں، وہ مویشیوں کا دودھ دھوتی، مکھن نکالتی، بستی کے لوگ ملتے ان سے طرح طرح کی باتیں ہوتیں، رام داس کی یہ ٹھک ٹھک نہیں ہوتی تھی۔ سکون تھا، جیسے اس کے گاؤں کے پاس جھیل پر سکون ہوا کرتی تھی۔ یہاں آ کر اس کی ساری جوانی نچڑ گئی تھی۔ رام داس اگر کام کرتا تو اسے مزدوری نہیں کرنا پڑتی تھی۔ اب جبکہ وہ بیمار ہو گئی ہے تب اگر گھر میں دولت آنا شروع ہوگئی ہے تو اس کا کیا فائدہ۔؟

''رام داس......!''

باہر سے کسی نے آواز دی تو ٹھک ٹھک رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی مالتی کے خیالوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ چند لمحوں بعد اسے پھر سے آواز دی گئی۔ رام داس ہاتھ صاف کرتا ہوا اٹھا اور باہر چلا گیا۔ جھونپڑی کے دروازے کے پاس ہی اسے موہن داس دکھائی دیا۔

''کیا بات ہے موہن داس، خیریت تو ہے؟'' رام داس نے اسے دیکھ کر ہاتھ جوڑے اور نمستے کرتے ہوئے پوچھا۔

''خیریت ہی ہے لیکن ابھی تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا

''کہاں۔!'' رام داس کے لہجے میں خوف ٹپکنے لگا۔

''ارے تم تو ڈر گئے۔'' اس نے کھسیانی ہنستے ہوئے کہا پھر دھیرے سے بولا ''ہم سب وہاں جمع ہیں اور مندر کی تعمیر کے بارے میں بات کرنی ہے۔ کیا تم آ رہے ہو؟'' موہن داس نے کہا تو رام داس نے چند لمحے سوچا اور پھر واپس آنے کا اشارہ کر کے واپسی جھونپڑی میں چلا گیا۔

وہ دونوں اندھیرے میں ممتاز آباد کی گلیوں سے گذرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ خاموش تھے۔ مختلف دو کانوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ وہ اس شراب خانے کے قریب سے گذرے جہاں شرابی مٹی کے پیالوں میں شراب پی رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر رام داس کا دل للچانے لگا مگر اس وقت موہن داس اس کے ساتھ تھا سو اس خواہش کو دل میں دباتے ہوئے دھیرے دھیرے چلتا رہا۔ کافی دور جانے کے بعد درختوں کا وہ جھنڈ دکھائی دیا جہاں مندر بنایا جانے والا تھا۔ پروہت کی جھونپڑی میں دیا جل

رہا تھا۔ وہ دونوں بھی اندر داخل ہو گئے۔ پروہت بڑے جذب سے وہاں بیٹھے لوگوں کو بتا رہا تھا کہ دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی اسی میں ہے کہ یہاں مندر تعمیر ہو جائے۔ اس بات کا اشارا اسے خواب میں مل چکا ہے۔ کافی دیر تک اس کی باتیں جاری رہیں۔ رام داس کے لیے وہاں پر چند چہرے شناسا تھے باقی تین چار آدمی اسے اجنبی معلوم ہوئے۔ ان میں سے ایک جھٹا داری سوامی تھا، پورے بدن پر بھوبھل ملی ہوئی تھی۔ سفید دھوتی کے ساتھ گہرے زرد رنگ کا کپڑا کاندھے پر ڈالا ہوا تھا۔ ماتھے پر وشنو کے ماننے والوں کا قشقشہ لگایا ہوا تھا۔ وہ خاموش تھا جب پروہت باتیں کر چکا تو چرن جی لعل نے پوچھا۔

''سوامی جی۔! مندر بنانے کے معاملے میں کوئی پیش رفت ہوئی؟''

''ہاں۔!'' اس جھٹا داری سوامی نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا ''میری دارا شکوہ سے بات ہو گئی ہے۔ اس کی طرف سے اجازت ہے۔ بس شہنشاہ سے بات کرنا باقی ہے، وہ خود دارا شکوہ کرے گا۔ آپ لوگ تعمیراتی سامان اکٹھا کریں۔ ملکہ کے مقبرے سے پہلے یہاں مندر تعمیر ہو جانا چاہیے۔''

اس نے دھیرے سے کہا تو وہاں پر بیٹھے لوگوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ دریائے جمنا کی جانب سے آنے والی ہوائیں دھیرے دھیرے چل رہی تھیں۔ آسمان صاف تھا اور شام کا گلابی پن ہر طرف پھیل رہا تھا۔ شہنشاہ شاہ جہاں اپنی خواب گاہ کے اس جھروکے میں کھڑا تھا جہاں سے روضہ ممتاز محل دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک ٹک ادھر دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حزن پھیلا ہوا تھا اور چہرے پر غم کی پرچھائیں تھیں۔ وہ ساکت سا روضہ ممتاز محل کی جانب دیکھ رہا تھا جیسے اس کی نگاہیں روضہ پر ہوں اور ذہن میں ممتاز کی یادیں، حسن اور رفاقت کا احساس پھیل گیا ہو۔ انیس سال کی رفاقت میں سفر وحضر کے حسین لمحات اسے مبہوت کر دینے کے لیے کافی تھے۔

روضہ ممتاز محل کی بنیادیں مکمل ہو جانے کے بعد اس کی دیواریں چند فٹ اوپر اٹھ گئیں تھیں جن پر ساتھ ہی ساتھ سنگ مرمر بھی لگایا جا رہا تھا۔ اینٹوں کی چنائی سے دیواریں بہت تیزی سے مکمل ہو رہی تھیں۔ استاد احمد کی نگرانی میں معماروں کی ٹولیاں دیواریں اٹھانے میں جتی ہوئیں تھیں۔ سبھی ٹولیاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے تن دہی سے کام

میں مصروف تھیں۔ یوں سبھی کی رفتار غضب ناک تھی۔ زیادہ اور بہتر کام کرنے والی ٹولی کو انعام سے نوازا جاتا تھا۔ ان دیواروں کے پیش منظر میں دریائے جمنا دکھائی دے رہا تھا۔ جو ایک بہت بڑا ابل کھا کر نئے آباد ہونے والے شہر ممتاز آباد کے قریب سے ہو کر گذرتا تھا۔ پانی کی رفتار معمول کے مطابق تھی۔ جس میں کہیں کہیں کشتیاں تیرتی ہوئی یوں لگ رہی تھیں جیسے طلائی پانی پہ بجرے تیر رہے ہوں۔ معماروں اور تزئین کاروں کے علاوہ مددگاروں کا ایک جم غفیر تھا جو کام کر رہا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ ہاتھی، گھوڑے اور بیل بھی روضہ ممتاز محل کی تعمیر میں پسینہ بہا رہے تھے۔ سنگ مرمر کی سلیں گھسیٹتے ہوئے اور اینٹوں کے چھکڑے لاتے اور لے جاتے ہوئے، ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچا رہے تھے۔ یہ وہ مخصوص مقامات تھے جہاں پلی کی مدد سے رَسے باندھے ہوئے تھے۔ وہ اینٹوں کو باندھ دیتے اور پھر بیلوں کو ہانک دیتے۔ اینٹیں خود بخود اوپر اٹھنا شروع ہو جاتیں اور دیوار کے سرے پر مچان میں کھڑے معماروں تک پہنچ جاتیں۔ جنہیں وہ تیزی سے خالی کر دیتے، یوں پھر نئے سرے سے اینٹیں اوپر اٹھا دی جاتیں۔ سنگ مرمر کی سلیں ہاتھیوں کی مدد سے نصب کرنے والی جگہ تک پہنچائے جا رہے تھے۔ ہر ایک سل پوری مہارت سے لگائی جا رہی تھی۔ شہنشاہ شاہ جہاں ایک ٹک انہیں دیکھتا چلا جا رہا تھا کہ غروب آفتاب کا وقت ہو گیا۔

وہ دیوان پر بیٹھا ہوا تھا اور ملگجے اندھیرے میں دیوان خاص کی دیواریں طلائی رنگ کی دکھائی دے رہی تھیں۔ رقص وسرور کی محفلیں نجانے کب کی ختم ہو گئیں تھیں۔ محل کے باہر ایک موسیقار شام کا راگ گا رہا تھا جس کی آواز کو وہ بہت غور سے سن رہا تھا کہ خادم نے شہزادہ داراشکوہ کی آمد کے بارے میں مطلع کیا۔ شہنشاہ شاہ جہاں نے اشارے سے باریابی کی اجازت دے دی۔ کچھ لمحوں بعد شہزادہ داراشکوہ سامنے آیا۔ اس نے ادب سے تعظیم دی۔ شہنشاہ نے کمال شفقت سے اسے اپنے پاس دیوان پر بیٹھنے کا اشارہ دیا

''آؤ دارا۔! میرے پاس بیٹھو۔''

وہ اپنے باپ کے پاس دیوان پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر حال احوال کی باتوں کے بعد شاہ جہاں نے پوچھا

''دارا۔! بولو کیا چاہتے ہو۔''

''جہاں پناہ۔! ہم آپ کے زیر سایہ امن وسکون سے رہ رہے ہیں۔ آپ کی رعایا آپ کو دعائیں دے رہی ہیں۔ وہ رعایا جس میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی اور بدھ شامل ہیں۔ آپ کی رواداری میں سب چین سے ہیں۔ تاہم روضہ ممتاز محل

کے قریب آباد نئے شہر ممتاز آباد میں کثیر تعداد ہندوؤں کی ہے۔ ظاہر ہے انہیں اپنی عبادت کے لیے ایک عبادت گاہ چاہیے۔ وہ وہاں پر ایک مندر بنانا چاہتے ہیں۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''کیا اس سلسلے میں انہوں نے کوئی عرض داشت پیش کی ہے۔''

''نہیں جہاں پناہ۔! انہوں نے کاغذ پر لکھ کر کوئی عرض داشت پیش نہیں کی، کیونکہ انہیں اس کے ٹھکرائے جانے کا ڈر ہے۔ انہیں خوف ہے کہ کہیں مندر بننے سے پہلے ہی وہ زمین پر سے ختم نہ ہو جائے۔''

''وہ ایسا کیوں سوچ رہے دارا؟'' شاہ جہاں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''اس لیے کہ مسلمانوں کے مذہبی پیشوا ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ وہ پہلے ہی ان کے مندر گرانے اور اس پر مسجدیں تعمیر کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔''

''کیا تم بھی ایسا ہی سوچ رہے ہو دارا۔؟'' شاہ جہاں نے تحمل سے پوچھا

''میرے سوچنے یا نہ سوچنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اصل مطالبہ تو رعایا کا ہے۔ مذہبی رواداری میں ہمیں شہنشاہ اکبر کی مثال کو اپنانا چاہیے۔ اگر ہم مندر گرائیں گے تو ہندو رعایا ہمارے خلاف ہو جائے گی۔ عبادت کا معاملہ ہی ایسا ہے کہ اس کے ادا کرنے والے بہت سخت ہوتے ہیں جیسے برہمن بھی مسلمانوں کی طرح کٹر ہیں۔ وہ بھی یقین کامل رکھتے ہیں۔ انہیں اس معاملے کا بھی یقین ہو جانا چاہیے کہ وہ مغلیہ سلطنت و حکمرانی میں کم از کم اپنی عبادت کے معاملے میں پوری طرح آزادی رکھتے ہیں۔'' دارا نے قدرے جوش سے اپنی گفتگو کا ایک ایک لفظ کہا۔

''دارا۔! عبادت گاہیں محض عبادت کے لیے ہونی چاہئیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔''

''مغل فرمارواؤں کی حیثیت سے آپ کی طرف سے سب کو انصاف برابری کی بنیادوں پر ملنا چاہیے، ان میں چاہے مذہب کے حوالے سے کوئی بھی ہو۔''

''ہاں۔! ایسا ہی ہے۔ میں اس سے اختلاف نہیں کرتا۔ تاہم اس سے بڑھ کر وہاں کوئی معاملات ہوئے تو علماء کو اپنا حق استعمال کرنے کا پورا اختیار ہوگا۔''

شاہ جہاں بھی سمجھتا تھا کہ اس کی طاقت اور قوت ایک حد تک ہے۔ اختیارات کی حدود اس کے لیے بھی محدود ہے۔ اس سے آگے ایک شہنشاہ کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ ملکہ نور جہاں نے اہل تشیع عقیدہ کے پھیلاؤ کے لیے ایران سے بہت

سارے مجتہد منگوائے تھے اور پوری طرح ان کی سرپرستی کی تھی۔ اکبر کے دور میں جو لادینی تصورات مسلمانوں کی تہذیب و تمدن میں سرائیت کر گئے تھے۔ جہانگیر کی عیش پسندانہ طبیعت اور ملکہ نور جہاں پر فریفتہ ہو جانے کے باعث ہنوز ویسے ہی تھے۔ شاہ جہاں نے عقائد ونظریات میں بدعتوں کے خاتمے کے لیے اتنا کچھ کیا کہ اکبر کے لادینی تصورات اور اہل تشیع عقیدہ کے بے محابا پھیلاؤ کی روک تھام ہوگئی۔ جہانگیر اپنی محبت کے سحر میں ملکہ نور جہاں کو نہیں روک سکا تھا، اس نے اپنے عقائد کا پرچار آزادی سے کیا لیکن شاہ جہاں نے ممتاز محل کی محبت میں ایسا نہیں ہونے دیا۔ اگرچہ ممتاز محل عقیدہ میں اہل تشیع تھی لیکن شاہ جہاں کے نام کا جو سکہ پہلے دن جاری ہوا تھا اس پر چاروں خلفائے راشدین کا نام کنندہ تھا۔ تاہم ممتاز نے بھی اپنی چاہت ومحبت میں شاہ جہاں کے عقائد پر اثر اندازی کی کوشش نہیں کی تھی۔

شاہ جہاں نے اپنے بیٹے اور ولی عہد کو ایک نگاہ خاص سے دیکھا اور یہ سوچ کر کہ وہ سازشوں اور بغاوتوں پر قابو پانا جانتا ہے۔ اس لیے کسی بھی نزاعی کیفیت کو پیدا کرنے کی بجائے خوش دلی سے کہا

''ٹھیک ہے دارا۔! میری طرف سے اجازت ہے اور کچھ۔؟''

''جہاں پناہ۔! آپ کا اقبال بلند ہو، مزید کچھ نہیں چاہیے سوائے آپ کی محبت اور شفقت کے۔'' دارا نے انتہائی خوشگوار انداز سے کہا۔'' آپ انصاف پسند حکمران ہیں اور راسخ العقیدہ مسلمان جو غیر مسلموں سے رواداری رکھتے ہیں۔ یہ زمین ہندوؤں کی ہے اور اس پر حکمرانی کے لیے ہمیں ہندوؤں کو پوجا کی اجازت دے دینا چاہیے۔''

اس سے پہلے کہ شاہ جہاں کوئی بات کہتا خادم نے جھک کر اعلان کیا'' شہزادہ معظم اورنگ زیب بہادر باریابی کی اجازت چاہتے ہیں عالم پناہ۔''

''اجازت ہے۔'' شاہ جہاں نے مسرت آمیز لہجے میں کہا

کچھ ہی لمحوں میں شہزادہ اورنگ زیب سامنے آ گیا۔ اس نے جھک کر تعظیم دی تو شہنشاہ شاہ جہاں اٹھ گیا۔ چند قدم آگے بڑھا اور اسے گلے لگاتے ہوتے بولا

''شاباش۔! تم ایسے ہی ہو جیسے میں تھا، میں نے بھی دکن میں سازشوں، شورشوں اور بغاوتوں کو کچلا تھا اور اب تم نے بھی انہیں تابعداری پر مجبور کر دیا۔ مجھے تم پر فخر ہے۔''

''عالم پناہ۔! اب وہاں پر دوبارہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''کیسے۔! جبکہ ہم نے ایک عمر وہاں گذار دی ہے۔''

''کیونکہ عالم پناہ۔! میں اورنگ زیب ہوں۔ میں جسم فتح کرنے پر نہیں، دل فتح کرنے پر یقین رکھتا ہوں۔ چہرے بدلنے پر نہیں، سوچ بدلنا چاہوں گا۔''

''بہت خوب۔!'' شاہ جہاں نے اورنگ زیب پر نگاہ ڈالی جو ایک شاہین کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو فقط فاتحین ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

''ایسا سب کچھ کب تک ہو سکے گا؟'' شاہ جہاں نے سوال کیا۔

''اس وقت تک، جب تک کامیاب نہیں ہو جاتے۔'' اورنگ زیب نے انتہائی ادب سے کہا

''ہاں۔! ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' شاہ جہاں نے کہا اور واپس دیوان پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں جھروکے میں سے روضہ ممتاز محل پر تھیں۔ جبکہ دونوں بیٹے باپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

......☆......

رام داس ان دنوں بہت الجھا ہوا تھا۔ مندر تقریباً مکمل ہونے کو تھا لیکن اس میں ابھی تک مورتی لا کر نہیں رکھی گئی تھی۔ مندر کی تکمیل میں اہم ترین شے مورتی ہی تھی جس کی پوجا کی جاتی لیکن وہ نہیں تھی۔ اس کا حل وہاں کے پنڈتوں نے یہی نکالا تھا کہ ایک تصویر کہیں سے لے آئے تھے اور اسی کی پوجا کی جا رہی تھی۔ مندر کی عمارت کوئی اتنی پیچیدہ نہیں تھی، محض چند کمرے بنائے گئے تھے۔ ایک برآمدہ اور چار ستونوں والا چھتر، یہ سب ایک وسیع میدان کے عین درمیان میں تھا۔ ممتاز آباد میں رہنے والے ہندو وہاں پوجا کے لیے آ رہے تھے۔ پنڈت انہیں زیادہ سے زیادہ دان دیتے رہنے پر ابھار رہا تھا تا کہ لوگ مندر کی تعمیر کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم دیں اور مندر کی شاندار عمارت بن سکے۔ انہیں مورتی کی سخت ضرورت تھی اس لیے موہن لعل دوسرے تیسرے دن رام داس کے گھر کا چکر لگا لیتا تھا، وہ دیکھ رہا تھا کہ مورتی تیار ہو رہی ہے اور وہ دن رات محنت کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ اسے کہنا بھی نہیں تھا لیکن رام داس تو جانتا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے آتا ہے۔ اس لیے وہ دن رات اسی میں مگن تھا کہ جلد سے جلد مورتی تیار ہو جائے۔ انہی دنوں میں جب کہ وہ بے انتہا مصروف تھا مالتی بیمار پڑ گئی تھی۔ بیمار تو وہ پہلے سے ہی تھی لیکن ان دنوں وہ ایسی لاغر ہوئی تھی کہ چل پھر بھی نہیں سکتی تھی۔ گھر کا سارا بوجھ ننھی سی جان ساوتری پر آن پڑا تھا یا پھر گوپی پر کہ جو وقت بچتا وہ ماں کی دیکھ بھال یا دوا وغیرہ کے لیے گذر جاتا۔ مالتی کی یہ امید دم توڑ چکی

تھی کہ ان حالات میں جب وہ لاغر، بیمار اور موت کے نزدیک ہو رہی ہے، اس کا جیون ساتھی ایک جھونپڑی میں رہ کر بھی اس سے دور تھا۔ وہ بس اپنے گذرے ہوئے وقت، گاؤں، والدین، سہیلیوں اور یہاں پر ساتھ میں کام کرنے والی عورتوں کو یاد کرتی رہ جاتی۔ دن میں تھوڑا سا وقت اس کی ہمسائی اس کے پاس آ جاتی تو من بہل جاتا تھا ورنہ وہ مردوں کی طرح جھونپڑی میں ایک طرف پڑی رہتی تھی اور رام داس بیڑی منہ میں دبائے مورتی بنانے میں مصروف رہتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے یا چائے پیتے ہوئے کبھی ہوا تو تھوڑی بات کر لی۔ ورنہ ٹھک ٹھک ہوتی اور وہ۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ بلدیو داس نے کبھی بھی آ کر نہیں پوچھا تھا کہ تاج محل میں لگائے جانے والی جالی تراشی ہے یا نہیں۔ اس کی ادھوری تراشی ہوئی سل یونہی جھونپڑی کے ایک کونے میں پڑی تھی جس پر مٹی کی تہیں چڑھ چکی تھیں۔

......☆......

اس دن موسم صاف تھا۔ ہلکی ہلکی سردی شروع ہو چکی تھی۔ جبکہ ہوا میں اتنی تیزی نہیں تھی۔ ہلکی ہوا چلنے سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ دنوں میں ہوا تیز ہو گی تو سردی بھی بڑھ جائے گی۔ دن کا پہلا پہر تھا اور روضہ ممتاز محل پر کام شروع ہو چکا تھا۔ تاہم رنگین شامیانوں میں خاصی چہل پہل تھی۔ تاج محل کے تعمیراتی فنکار جمع ہو رہے تھے۔ کئی دنوں کی محنت کے بعد استاد احمد نے ابعاد کی مدد سے پوری پیمائش بنا لی تھی۔ یہی بتانے کے لیے اس نے سب کو جمع کیا تھا تاکہ پھر مزید کام کو بڑھایا جا سکے۔ جیسے ہی سب جمع ہو گئے تو محکمہ بیوتات کے سربراہ مکرمت خاں نے کہا۔

''استاد محترم احمد۔! اس سے پہلے کہ ہم مزید پیمائش کے بارے میں باتیں کریں کیوں نا پہلے محترم اسمٰعیل آفندی سے پوچھ لیں کہ وہ گنبد کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے۔''

''ضرور۔!'' استاد احمد نے اسمٰعیل آفندی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''محترم۔! جس تیزی سے دیواریں تعمیر کی جا رہی ہیں، اسی مناسبت سے میں نے بھی اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔ جونہی دیواریں وہاں تک پہنچیں گی میں اسے سنبھال لوں گا۔''

''تو کیا دیواریں آپ کے حساب سے ٹھیک اٹھ رہی ہیں۔'' مکرمت خان نے پوچھا

''جی بالکل۔! میں یہاں پر موجود ہوتا ہوں اور استاد احمد سے پوری طرح استفادہ کرتا ہوں۔''

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ گنبد کا وزن یہ دیواریں برداشت کر لیں گی۔''

''جی بالکل۔! ہم نے اس کے بارے بہت ہی محتاط انداز میں، تمام تر جزئیات کو سامنے رکھ کر وزن کو سمجھ لیا ہے۔ میں تفصیل کے ساتھ بتاتا ہوں کہ روضے کے اطراف کے وزن کا دباؤ ۹۹۷×۳۴۷×۲۸۵ مکعب فٹ ہوگا۔ اس میں گنبد کا وزن تقریباً بارہ ہزار ٹن ہوگا۔ یوں مزار کی دیواریں ۹۷ ٹن فی مربع فٹ بوجھ سہارے گی جو کہ بالکل مناسب ہے۔ عمارت کا بوجھ کہیں بھی ایک مرکز پر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ وزن کی مساوی تقسیم کی گئی ہے۔ عمارت سے باہر دکھائی دینے والے حصوں کو لوہے سے اس قدر مربوط کر دیا گیا ہے کہ ان پر بھی وزن مساوی ہوگا۔ اس طرح وزن سے عمارت پھٹنے کا کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔''

''کہیں اس سے عمارت کے جمالیاتی حسن کو نقصان تو نہیں آئے گا۔'' عبدالکریم خاں نے پوچھا

''نہیں۔! اسمٰعیل آفندی نے حتمی انداز سے کہا تو سب استاد احمد کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے سامنے چند کاغذ پھیلاتے ہوئے کہا۔

''محترم دوستو۔! تاج محل کا چوبی نمونہ آپ کے سامنے ہے۔ تاہم میں تفصیل سے اس کی پیمائش بتا رہا ہوں۔ کچھ پر کام ہو چکا ہے۔ کچھ پر کام ہو رہا ہے اور باقی پر کام ہوگا، لہٰذا میں حتمی طور پر اس کی تفصیل دے رہا ہوں تا کہ بعد میں کوئی الجھن نہ رہے۔'' یہ کہہ کر وہ سیدھا ہوا اور ایک کاغذ اٹھا لیا اور اسے پڑھنے لگا۔

عمارت کا کل رقبہ تقریباً ۱۴۲ ایکڑ

صدر دروازے کے سامنے کا چبوترا۔ ۲۱۱ ۱/۲ × ۸۶ ۱/۲ مربع فٹ۔

صدر دروازے کی بلندی۔ ۸۰ فٹ۔

صدر دروازے کے اندر مثمن کمرے کا قطر ساڑھے اکتالیس فٹ۔

کمرے کی چھت لداؤ ہے۔ چھت پر بھول بھلیاں، ۴ کمرے، ۲۲ برجیاں اور چار چھوٹے گنبد ہوں گے۔ اندرونی دروازے یعنی صدر دروازے کے مقابل کے دروازے کی بلندی ۸۰ فٹ ہے۔ اندرونی دروازے کے دونوں سمت دالان ہیں جن کے طول وعرض...... ۲۹ ۳/۴ × ۳۶۰ ہیں۔ اندرونی باغ مربعی ہے۔ اس کے بیچوں بیچ سنگ سرخ کے چبوترے سے اندرونی صدر دروازے تک ۸۲۵ فٹ لمبی نہر ہے۔ جس کی چوڑائی ۱۶ ۱/۴ فٹ ہے۔ نہر کے درمیان سنگ مرمر کا چبوترہ ہے۔

یہ چبوترہ بھی مربعی ہوگا اور اس کا ضلع ۲/۱۳۴۴ فٹ ہے۔ سنگ سرخ کا چبوترہ۔! اس کا طول ۹۷۰ فٹ اور ۷ انچ ہے جبکہ عرض ۳۶۴ فٹ ۱۰ انچ ہیں۔ باغ کی طرف اس کی بلندی ۴ فٹ اور جمنا کی طرف ۴/۱ ۲۸ فٹ ہے۔ اس پر ایک طرف مسجد تعمیر ہوگی اور دوسری جانب مہمان خانہ۔

سنگ سرخ کے عین درمیان میں سنگ مرمر کا مربعی چبوترہ ہوگا جس کا ضلع ۳۲۸ فٹ ہے۔ اس کی بلندی ۲۰ فٹ۔ سنگ سرخ کے چبوترے سے ۲۱ سیڑھیاں بنائیں جائیں گی۔ یہ سیڑھیاں سنگ مرمر کی ہوں گی۔ فرش پر آتے ہی جوتے اتار دینا ہوں گے۔

سنگ مرمر کے چبوترے کے چاروں گوشوں پر چار خوبصورت مینار ہیں۔ سطح باغ سے ان کے کلس تک کی اونچائی ۲/۱ ۱۶۲ فٹ ہے۔

مقبرہ۔! یہ غیر متقمثمن ہے۔ چھوٹے ضلع کا طول ۳۳ فٹ ۶ انچ، بڑے ضلع کا طول ۱۳۹ فٹ ۶ انچ ہے۔ سطح باغ سے کلس تک کی بلندی ۲/۱۳۴۴۲ فٹ ہے۔ اصل مزار کا کمرہ مثمن ہے جس کا ضلع ۲۴ فٹ ۲ انچ، قطر ۵۸ فٹ، بلندی ۸۰ فٹ ہے۔

ملکہ عالیہ ممتاز محل کے مرقد کا چبوترہ ۳/۲ ۱۰×۳/۲ ۶×۴/۳ ۱ مکعب فٹ اور تعویز کا ابعاد ۱۲/۷ ۶، ۱۲/۷، ۱۲/۲ ۳ فٹ ہوں گے۔"

استاد احمد نے یہ سب پڑھا اور پھر کاغذ سمیٹ لیا۔ تو اس میں آفندی نے سب کی طرف دیکھ کر کاغذ نکالا اس کو دیکھا اور پڑھنے لگا۔

کلس کی بلندی ۲/۱ ۳۰ فٹ، چاند کا قاعدہ ۲/۱ ۸ فٹ، اس پر لٹو کا قطر ۳/۱ ۴ فٹ، لٹو پر کی صراحی ۳/۲ ۵ فٹ، صراحی پر کا لٹو ۴/۳ ۳ فٹ، چاند کا بیرونی دور ۳/۲ ۹ اور قطر ۵ فٹ۔

کلس کا وزن ۳۲ من، کلس کے اوپر کلمہ طیبہ ہوگا۔

کلس کا زیادہ سے زیادہ محیط ۲۷ فٹ ۴ انچ

کنول کی تزئین کے حصے کا عرض ۴۰ فٹ ۶ انچ

گنبد کا قطر بیرونی ۹۱فٹ ۶انچ

گنبد کے نچلے حصے کا محیط ۲۷۴فٹ ۹انچ

بیرونی گنبد کی قوسی بلندی ۶۱فٹ

اندرونی محیط کا عرض ۶۰فٹ ۹انچ

گنبد کے بیرونی خول کا اندرونی محیط ۱۹۰فٹ ۴ء۱۱انچ

گنبد کے بیرونی خول بیرونی محیط ۲۸۷فٹ ۸ء۶۰انچ

اندرونی گنبد کا قطر ۶۰فٹ ۹انچ

اندرونی گنبد کی بلندی ۲۹فٹ ایک انچ

سنگ مرمر کے چبوترے سے عمارت کی پہلی منزل کی بلندی ۳۶فٹ ۸انچ

سنگ مرمر کے چبوترے سے عمارت کی دوسری منزل کی بلندی ۷۱فٹ ۲انچ

اتنا کہہ کر اسمعیل آفندی خاموش ہو گیا۔

اس پر استاد احمد نے کہا۔ ”یہ تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔ اس سے مزید کام جاری رہنے پر، اس بارے میں کوئی سوال ہو یا کوئی بحث طلب معاملہ ہو تو کہا جائے۔“

ان کے خاموش ہونے پر کئی تعمیراتی فنکار اس پیمائش کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ تاکہ اس کو مزید سمجھ لیں۔ یہ معاملہ دوپہر ہو جانے تک چلتا رہا۔

دن رات کی محنت سے مورتی تیار ہو گئی تھی۔ اس دوران رام داس کے ہاتھوں پر نجانے کتنے زخم آ چکے تھے۔ تھکن اس کی ہڈیوں تک میں سرائیت کر گئی تھی۔ مگر ایک انجانی خوشی اس کے چہرے پر ہویداں تھی۔ وہ قریبی تالاب سے نہا کر آیا

تو اس کی بیوی مالتی اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ بھی نہا لے۔ تاہم اس نے منہ ہاتھ دھو کر دھلے ہوئے کپڑے پہن لیے تھے۔ کچھ دیر بعد رام داس، مالتی اور ان کے بچے مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑے پوجا کے انداز میں کھڑے تھے۔ مورتی کے آگے اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ گوپی پھولوں کی مالا لے کر آیا۔ وہ انہوں نے مورتی کے گلے میں ڈال دی تھی، تھوڑے سے پھل اس کی بیٹی ساوتری کے رکھے تھے اور سرخ رنگ کی چنری مالتی نے ڈالی تھی۔ رام داس نے موہن لعل کو بلوایا تھا تاکہ وہ مورتی کو مندر لے جا سکیں۔ دوسری آواز دینے پر رام داس اونچی اونچی آواز میں بھجن گانے لگا تاکہ موہن لعل سن لے۔ ایسا ہی ہوا اور موہن لعل اندر آ گیا۔ وہ مورتی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کیونکہ رام داس کے ہاتھوں سے تراشی ہوئی مورتی بہت خوبصورت تھی۔ سنگ مرمر کی اس چپٹی سل میں ریشمی احساس اتر آیا تھا۔

پوجا سے فارغ ہونے کے بعد موہن لعل چھکڑا لینے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آ گیا اس کے ساتھ بیل گاڑی تھی جو اس نے جھونپڑی کے باہر کھڑی کر دی۔ رام داس نے درگا دیوی کی مورتی اٹھائی تو ایک لمحے کو وہ لرز گیا۔ اب اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ مورتی اٹھا سکے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے مورتی کو لے کر باہر آ گیا۔ جھونپڑی کے باہر چند ہندو جمع ہو چکے تھے۔ انہوں نے جھٹ ہاتھ باندھ لیے۔ رام داس نے بڑی احتیاط سے مورتی کو چھکڑے پر رکھا۔ اس کے انداز میں انتہا درجے کی عقیدت تھی۔ آخر کو وہ درگا دیوی کی مورتی تھی جو دہشت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ موہن لعل نے چھکڑا بڑھایا تو رام داس نے مورتی کو تھام لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مندر تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ ٹوٹ جائے اور اس کی سالوں کی محنت ضائع ہو جائے۔

مندر اس کے گھر سے خاصا دور تھا۔ چھکڑا دھیرے دھیرے چلتا چلا جا رہا تھا اور راستے میں آنے والے لوگ مورتی کو دیکھتے، ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہوئے پرنام کرتے۔ تب رام داس کا دل خوش ہو جاتا۔ وہ اس کے ہاتھوں سے تراشی ہوئی مورتی تھی۔ وہ اس احساس سے اور بھی خوش ہو جاتا کہ آئندہ آنے والے دنوں میں نجانے کتنے لوگ اس مورتی کی پوجا کریں گے۔ بہت سارے لوگ اس چھکڑے کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ جب وہ مندر تک پہنچے تو ان کے ساتھ ایک اچھا خاصا جلوس تھا۔ پنڈت کو معلوم ہو گیا کہ وہ مورتی لا رہے ہیں۔ اس لیے وہ جلدی سے اپنے کمرے میں سے نکلا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑھا۔ اس کے پیچھے چرنجی لعل بھی آ گیا۔

مندر میں مورتی رکھنے کے لیے جو جگہ بنائی گئی تھی۔ وہ کافی اونچی تھی۔ بہت سارے لوگوں نے مل کر چھکڑے سے

مورتی اتاری جو دھوپ میں چمک رہی تھی۔ سب نے مل کر مورتی کو اس استھان پر رکھا جو ایک لمبے برآمدے میں تھی۔ مورتی رکھتے ہی پنڈت نے پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں۔ ایک بڑی سی پیلے پھولوں والی مالا پہنائی۔ اس کے بعد پھل، شہد، دہی، دودھ، گھی، ناریل، چاول اور پھول لے کر کئی آدمی بڑھے۔ ناریل توڑنے کے ساتھ ہی پوجا شروع ہوگئی۔

پنڈت ایک ادھیڑ عمر اور کالے رنگ کا تھا جو خصوصی طور پر وارانا سی سے آیا تھا۔ وہ اوپری بدن سے ننگا تھا اور اس نے جنیو پہن رکھی تھی۔ وہ پوری شدت اور جذب کے ساتھ بھجن گا رہا تھا اور دوسرے لوگ ساز بجاتے ہوئے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ جبکہ چرنجی لعل اس مورتی کو دیکھ رہا تھا۔ درگا دیوی کے ہاتھ شاخوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ رام داس نے اس کا تاج سنہرے رنگ کا بنایا تھا۔ ساڑھی میں نیلے اور اُودے رنگ بھرے تھے۔ وہ کسی سنگھاسن کی مانند شیر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پوجا ختم ہوئی تو مندر کے میدان میں آتے ہوئے چرن جی لعل نے کہا

''رام داس۔! تم نے مورتی خوب بنائی ہے، بہت پسند آئی۔''

''یہ میرا دھرم بھی تو ہے اور میں اچاریہ ہوں۔''

''آؤ۔! میں تمہیں تمہاری بقیہ رقم دوں۔'' چرنجی لعل نے کہا اور رام داس اس کے ساتھ بڑھ گیا۔

پنڈت کے کمرے میں اس نے رام داس کو اشرفیوں کی ایک تھیلی دی۔ یہ اس کی حیثیت سے بڑھ کر معاوضہ تھا۔

''رام داس۔! تمہارا کام ابھی ختم نہیں ہوا، ابھی ہمیں ہندو دھرم کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ آج شام، ہمیں بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔ تب تک پنڈت بھی مورتی رکھنے کی رسموں سے فراغت حاصل کر لے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں آجاؤں گا۔'' رام داس نے کہا اور اشرفیوں کی تھیلی اپنے کپڑوں میں چھپا کر وہاں سے آ گیا۔

وہ اپنی جھونپڑی میں واپس آکر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی الجھن اور بڑھ گئی تھی۔ اسی جھونپڑی کے ایک کونے میں اس کی بیمار بیوی مالتی پڑی ہوئی تھی جو بے حد لاغر ہو چکی تھی اور دوسرے کونے میں ادھوری تراشی ہوئی سل جو جالی کے لیے بنائی جا رہی تھی۔ اس سل پر مٹی اور دھول کی تہیں جم چکی تھی اور وہ کچی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔

شام ڈھلے وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اسے اتنی دولت مل چکی تھی کہ وہ سکون سے اپنا بڑھاپا گذار سکتا تھا۔ اسے گاؤں واپس چلے جانا چاہیے یا پھر ہمیشہ ممتاز آباد میں رہے۔ یہ شہر اس کی آنکھوں کے سامنے بسا تھا اور اس کی ہر شے، ہر گلی اور آدمی سے نہ صرف واقفیت رکھتا تھا بلکہ اسے انسیت بھی ہو چلی تھی۔ وہ بلدیو داس سے کہہ سکتا تھا

کہ اب وہ جالی نہیں تراش سکتا۔ اسے واپس گاؤں جانا ہے۔ وہ اسے منع نہیں کر پائے گا۔ کیا وہ واقع ہی واپس گاؤں جانا چاہتا ہے؟ اسے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔

مغربی افق سنگترے کی قاش جیسا نارنجی ہو چکا تھا۔ اس پس منظر میں تاج محل کا گنبد اسے گلابی دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے وقت میں جب اس کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ اتنا خوش کن منظر، ایسا منظر تو وہ اپنے گاؤں میں نہیں دیکھ پائے گا۔ کیا خواب بھی حقیقت میں تبدیل ہو سکتے ہیں؟ وہ منظر خواب کے جیسا ہی تھا۔ وہ جس نے ساری عمر پتھروں کو تراشنے میں گذار دی تھی۔ تاج محل کے گنبد کی خوبصورتی سے متاثر ہو گیا تھا۔ کیا اس عمارت کی خوبصورتی میں میرا کوئی حصہ نہیں ہوگا؟ اگر میں واپس چلا گیا تو جالی کیسے تراشی جائے گی۔ اگرچہ اور دوسرے فنکار بھی اسے تراش رہے ہیں اور میں ......! نہیں مجھے یہیں رہنا ہے اور میں اس عمارت کی آرائش میں ضرور حصہ دار بنوں گا۔ وہ واپس پلٹ آیا۔

رات کے اندھیرے میں وہ اپنی جھونپڑی میں بیٹھا اس خوبصورت منظر کو یاد کر رہا تھا۔ اس نے بیش بہا مندر دیکھے تھے اور دیگر عمارتیں بھی لیکن اس عمارت کی سادگی نے اسے جس طرح کے حسن کا تاثر دیا تھا وہ بالکل منفرد تھا۔ ایسا اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ صبح سورج طلوع ہوتے ہی وہ جالی تراشنے کا کام شروع کر دے گا۔ اسے یہ یاد ہی نہیں رہا کہ مندر بھی جانا ہے۔

اس وقت مشرقی افق لیموں کے چھلکے جیسا رنگ لیے ہوئے تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور اس نے جالی کو اٹھا کر سیدھے کر کے رکھ دیا۔ اب اسے دھونے کے لیے پانی چاہیے تھا۔ وہ پانی لینے کے لیے نکل گیا۔ واپس آیا تو سورج کی کرنیں پھیل چکی تھیں اور اس کا بیٹا گوپی جھونپڑی کے باہر پریشان حال کھڑا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے، تم پریشان کیوں ہو؟''

''پتا جی۔ ماتا جی پرلوک سدھار گئیں ہیں۔'' گوپی نے انتہائی دل گرفتہ انداز میں کہا تو رام داس نے ساتھ لایا ہوا پانی وہیں رکھ دیا۔ وہ مالتی کے پاس پہنچا۔ وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ جامد، پیلا اور بے جان تھا۔

وہ پانی جو رام داس سل دھونے کے لیے لایا تھا۔ مالتی کی ارتھی تیار کرنے میں صرف ہو گیا۔ اور جب اس نے ارتھی کو آگ لگائی تو اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ نجانے اسے یہ احساس کیوں ہوا کہ وہ مالتی کی موت کا ذمہ دار ہے۔

......☆......

روضۂ ممتاز محل تیار ہو چکا تھا مگر اس کی تزئین و آرائش اور سنگ مرمر کے چبوترے پر مینار تعمیر کیے جانا باقی تھے۔ روضے کے اردگرد مسجد، مہمان خانہ اور باغ کا کام شروع ہو چکا تھا اور تعمیراتی فنکار دن رات اس پر محنت کر رہے تھے۔ مقبرے کے اردگرد ابھی تک اینٹوں کے ٹکڑے، سنگ مرمر کے تراشے ہوئے ٹکڑے، شہتیر، دھول، مٹی وغیرہ پڑی ہوئی تھی۔ دریائے جمنا کے کنارے سنگ مرمر کا ایک ستون کھڑا ہو گیا تھا جو آسمان سے باتیں کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ انہی دنوں شاہی فرمان آ گیا کہ ممتاز محل کو اس روضہ میں دفن کیا جائے گا کہ یہی اس کا مستقل مدفون ہے۔

چند دنوں بعد جب شاہی قافلہ وہاں آ کر رکا تو مقبرے کے اردگرد صفائی ہو چکی تھی۔ آسمان صاف تھا اور دھوپ چمک رہی تھی۔ اس قافلے کے ساتھ علماء کی ایک جماعت تھی اور بڑی تعداد میں حفاظ اکرام تھے۔ وہ سب قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگے۔ شاہ جہاں آگے بڑھا، اس کے ہاتھ میں موتیوں کی تسبیح تھی اور زیرلب پڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں اس کے چاروں بیٹے موجود تھے۔ داراشکوہ، شاہ شجاع، اورنگ زیب اور مراد بخش، عارضی مدفن کی کھدائی ہو چکی تھی۔ شہنشاہ کے چاروں بیٹے آگے بڑھے اور انہوں نے اپنی ماں ملکہ ممتاز محل کے تابوت کو اٹھایا۔ یہ عارضی مدفن مغرب کی سمت تھا۔ جب تابوت اٹھایا گیا تو وہاں پر موجود شاہی محافظوں اور احادیوں کے جلو میں حرم سرا کی بیگمات اور کنیزیں بھی موجود تھیں۔ تابوت دھیرے دھیرے مقبرے کی طرف لایا جا رہا تھا۔ اس دوران پھول کی پتیاں نچھاور کی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ تابوت مقبرہ کے اندر مجوزہ مرقد میں رکھ دیا گیا پھر اسے سنگ مرمر کی بھاری سلوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ اس وقت سارا خاندان موجود تھا۔ شہنشاہ شاہ جہاں نے فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اٹھائے تو سبھی ہاتھ اس کے ساتھ اٹھ گئے۔ فاتحہ خوانی کے بعد محتاجوں، مسکینوں اور ناداروں کے لیے کھانا کھول دیا گیا۔ دوپہر سے لے کر شام تک آگرہ اور ممتاز آباد میں خیرات تقسیم ہوتی رہی۔

شہنشاہ شاہ جہاں مرقد کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ روضۂ ممتاز محل کو دیکھ چکا تھا۔ اس کی آرائش نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔ وہ نسوانی حسن جو وہ تاج محل میں چاہتا تھا اسے دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے مصارف کی پروانہیں کی تھی بلکہ اس کی توجہ ایک شاہکار بنانے پر تھی جو اس کی محبت کے شایان شان ہو۔ شاہ جہاں کو اس میں وہ عکس دکھائی دے رہا تھا۔ دروازوں میں چاندی استعمال کی گئی تھی۔ قیمتی پتھر اور جواہرات نصب کئے گئے تھے۔ جن میں عقیق، فیروزہ، لاجورد، مونگا، لعل یمنی، خارا، بلور، یاقوت، نیلم، ہیرا، مروارید، سیپ پکھراج، وغیرہ یہ سب یونہی نہیں لگا دیئے گئے تھے بلکہ ان کو لگانے میں ہندسیاتی

تقسیم کے مطابق فن استعمال کیا گیا تھا۔ یہ کمال فن تھا۔

غروب آفتاب تک شہنشاہ ہند اپنی ملکہ کے مرقد پر رہا اور پھر وہاں سے اٹھ کر لعل قلعے کی طرف روانہ ہو گیا

......☆......

رام داس دکھ کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ مالتی کے بغیر ادھورا ہے۔ اس غم نے اسے ادھورا کر کے رکھ دیا کہ وہی اس کی موت کا ذمہ دار ہے۔ وہ جالی تراش نہیں سکا تھا بلکہ وہ یونہی دھول مٹی میں اٹی پڑی رہی۔ وہ سارا سارا دن مالتی کی یاد میں بیٹھا رہتا۔ اسے گاؤں میں گذارے ہوئے دن یاد آتے۔ جوانی کے وہ دن جب انہیں کوئی الجھن یا دکھ نہیں تھا۔ ان کے درمیان خوشیاں تھیں۔ لیکن اب جبکہ وہ نہیں رہی تھی تو اس کے آس پاس غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

ایسے ہی ایک شام موہن لعل اس کے پاس آیا۔ اسے یوں غم زدہ دیکھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''رام داس۔! کب تک یونہی سوگ مناتے رہو گے۔ مالتی تو چلی گئی لیکن اب تمہارے بچے ہیں، تمہیں ان کی دیکھ بھال کرنا ہوگی۔''

''ہاں موہن لعل۔! مجھے انہی کی فکر ہے۔ لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ واپس گاؤں چلا جاؤں۔ یہاں میں نے اپنی جوانی کے کئی سال ضائع کر دیئے ہیں اور میں جس مقصد کے لیے آیا تھا وہ نہیں کر سکا۔''

''کون سا مقصد۔!''

''یہی کہ ملکہ ممتاز محل کے مقبرے میں کوئی ایسا فن پارہ تخلیق کروں کہ میرا نام باقی رہ جائے مگر......''

''مگر کیا......!''

''میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔ بلدیو داس نے ایک کام دیا تھا وہ بھی پورا نہیں کر پایا۔ پھر اگر میں یہ جالی مکمل بھی کر لیتا تو کون سا میرا نام آنا تھا۔ بلدیو داس نے یہ کام میرے فن کو مانتے ہوئے نہیں دیا تھا بلکہ اس کی وجہ تو درگا دیوی کی مورتی تھی۔ میں اگر اچھا کام کر بھی دیتا تو وہ بلدیو داس ہی کے لیے تھا، اسی کا نام آنا تھا۔ نجانے کتنے مزدور، کتنے فنکار اپنا پسینہ بہا چکے ہیں اور ان کا نام تک نہیں۔ یہاں تک کہ مالتی بھی جس کی جوانی کے دن یہاں خرچ ہو گئے۔'' رام داس جیسے پھٹ پڑا تھا۔

''یہ اس کا دھرم تھا رام داس۔! جب تم کوئی کام نہیں کر سکے تو وہ اپنے بچوں کو بھوکا تو نہیں مار سکتی تھی۔ اور تم یہ نہیں

کہہ سکتے کہ تاج محل کی تعمیر میں جن مزدوروں اور فنکاروں نے اپنا پسینہ بہایا ہے، ان سے محض بیگار لی گئی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ شاہ جہاں نے ان کی مزدوری سے بڑھ کر انہیں دیا ہے۔ یہ ان لوگوں کی قدر افزائی ہی تو تھی کہ اتنی جلدی یہاں لوگ جمع ہو گئے۔ ایک شہر آباد ہو گیا۔ تم ایک مثال بھی نہیں دے سکتے کہ کسی کو زبردستی کام پر آمادہ کیا ہو۔ ہاں۔! یہ الگ بات ہے شاہ جہاں کو کسی کا کام پسند آیا اور کسی کا نہیں۔ دونوں صورتوں میں اس نے معاوضہ خوب دیا ہے۔ میں نے خود یہاں سے بہت کمایا ہے اتنا کہ میری آئندہ نسل بھی آرام سے کھائے گی۔''

''مگر مجھے تو درگا دیوی کا مجسمہ تراشنے ہی کا معاوضہ ملا ہے۔''

''یہی بھگوان کی مرضی تھی۔ اور میرے خیال میں بھگوان یہی چاہتے ہیں کہ تم یہاں رہو اور مندر کی خدمت کرو۔ یہاں آ کر تمہاری مرضی نہیں چلی لیکن بھگوان نے تم سے کام لے لیا۔ اسی مقصد کے لیے تم یہاں موجود ہو۔ سوچو۔!''

''ہاں موہن۔! کبھی کبھی تو مجھے یہی لگتا ہے کہ میں اگر اپنے گاؤں سے یہاں تک آیا ہوں تو شاید اسی مقصد کے لیے کہ میں یہاں مندر ہی کے لیے کچھ کر سکوں۔''

''تو پھر۔! کیوں نہیں تم یہی کام کرتے۔'' موہن لعل نے دھیرے سے کہا اور پھر سرگوشی میں بولا ''سنا ہے دارا شکوہ بالکل اپنے دادا اکبر کی طرح بننا چاہتا ہے۔ وہ ہندوؤں کے بہت قریب ہے۔ وارانا سی سے یہ خبر آ چکی ہے کہ اس لیے ایک ایسی لڑکی بھی تلاش کر لی گئی ہے جو، جودھا بائی کی طرح ہو۔ دارا شکوہ ولی عہد سلطنت ہے، شاہ جہاں کے بعد وہی اس سلطنت کا وارث ہو گا۔ تب پھر ہندوؤں کو کوئی خطرہ نہیں۔ ہندو اسی لیے اسے پسند کرتے ہیں کہ وہ ان پر بہت مہربان ہے۔''

''یہ سب ان مغلوں کی حکمرانی کرنے کے ڈھونگ ہیں۔''

''لیکن یہ ہماری سرزمین پر حکومت کر رہے ہیں یہ ایک حقیقت ہے، انہیں طاقت سے نہیں عقل سے ہی مارا جا سکتا ہے، ان میں وہ سوچ ہی ختم کر دی جائے جس کے بل بوتے پر وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔''

''کیا ایسا ممکن ہے؟''

''ممکن ہے، پہلے اکبر اور اب دارا کی صورت میں یہ حقیقت موجود ہے۔''

موہن لعل نے کہا تو رام داس کی آنکھوں میں ایک نئی طرح کی امید جھانکنے لگی۔ اس نے پوچھا

''کیا ہم داراشکوہ تک رسائی رکھتے ہیں؟''

''ہم آج اگر نہیں تو کل ضرور رسائی رکھیں گے۔ ہمارے گرومہاراج نے ان کو گرویدہ کر رکھا ہے۔'' موہن لعل نے کہا تو رام داس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

......☆......

سرِشام بارش برسی تھی۔ ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔ بادل جھوم کے برسے تھے اور پھر رات کے دوسرے پہر تک تیز ہواؤں کے باعث آسمان صاف ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ستارے اور چاند سرمئی آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ ٹمٹماتے ہوئے تاروں کے جلو میں روشن چاند، اور پھر زمین پر بکھری ہوئی چاندنی ایک الوہی منظر پیش کر رہی تھی۔ یہ منظر حواس کو مختل کر دینے والا تھا۔ اس وقت قلعہ میں مکمل خاموشی تھی۔ شہنشاہ شاہ جہاں اپنی خواب گاہ میں تنہا تھا۔ ایسے میں اسے ممتاز محل کی یاد نے بے خود کر دیا تھا۔ اسے ہمیشہ سے چاندنی بہت اچھی لگا کرتی تھی۔ وہ دونوں چاندنی راتوں میں بہت دیر تک کھلے آسمان تلے رہا کرتے تھے۔ یہ آسمان پر چمکتا ہوا چاند ان کی بے پایاں محبتوں کا گواہ تھا۔ اس نے نجانے کتنی بار انہیں محبت سے سرشار لمحوں میں جذبات سے بھیگتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ساکت سا اپنے بستر پر پڑا تھا اور باہر چاندنی میں اس کی محبت کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ جدائی کے لمحوں میں یوں بھی کوئی اپنا احساس دیا کرتا ہے۔ یوں جیسے وہ اس کے کہیں قریب ہو۔ ہاں یہ احساس تبھی پیدا ہوتا ہے جب من و تو کا احساس مٹ جایا کرتا ہے۔ وہ اس کے خیالوں میں پوری رعنائیوں سے آباد تھی۔ پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔ اس کے آنسو پھیل کر اس کی گردن تک آ گئے تھے۔ وہ دل گرفتہ سا پڑا تھا۔ جب ممتاز محل اس سے جدا ہوئی تھی، تب اس کی داڑھی میں محض سات بال سفید تھے۔ لیکن ان ایام میں اس قدر تیزی سے سفید بال آئے کہ داڑھی سفید ہو کر رہ گئی۔ غم نے اس سے جوانی کی ترنگ چھین لی تھی۔ اس کے چہرے پر دکھ روشن تھا اور اس کے نقوش پکار پکار کر اس کے من کا حال بیان کر رہے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے آنسوؤں کو پونچھا اور اس جھروکے میں آ کھڑا ہوا جہاں سے مقبرہ ممتاز محل دکھائی دیتا تھا۔

تاج محل پر پہلی نگاہ پڑتے ہی وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کی محبت کی نشانی اس کے خواب سے بھی ماورا تھی۔ دریائے جمنا کے کنارے ایستادہ وہ محبت کی نشانی صرف محسوس کی جا سکتی تھی۔ اسے دیکھ کر لفظ گنگ ہو گئے تھے۔ پورے چاند کی رات میں وہ نور کا پیکر دکھائی دے رہا تھا جو آسمانوں سے اتر کر دریائے جمنا کے کنارے آن رکا ہو۔ اس کا عکس پانی میں جگمگا رہا تھا

۔نور ہی نور۔! جسے دیکھ کر آنکھیں تک جھپکنا بھول جائیں، اگر نگاہ ہٹی تو نجانے یہ پھر کہیں آسمان کی پنہائیوں میں گم نہ ہو جائے اور دوبارہ اسے دیکھنے کا موقع نہ ملے۔

''ارجمند۔!'' شاہ جہاں کے منہ سے سسکتے ہوئے نکلا۔''تم...... وہاں......'' وہ کچھ بھی تو نہیں کہہ سکا، اسے خود احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ بس جدائی کا احساس تھا جو گہرے سے گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سرمئی آسمان کے پس منظر کے ساتھ وہ چمکتا ہوا نورانی پیکر اسے ممتاز محل کا وجود دکھائی دیا۔ اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''ار............جو............مند............''

یہ ایک چیخ تھی جس میں صدیوں کی جدائی کا نوحہ تھا۔ اور وہ چیخ خاموش قلعوں کی غلام گردشوں میں پھیل کر وقت کی پنہائیوں میں گم ہو گئی۔

موسم سرد ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ہواؤں نے دہلی شہر کی فضاؤں میں خنکی بھر دی تھی۔ شہنشاہ شاہ جہاں اپنی خواب گاہ میں موجود تھا اور رات کا دوسرا پہر ختم ہو چکا تھا۔ وہ چند لمحے پہلے بیدار ہو گیا تھا حالانکہ اسے سوئے ہوئے دو گھڑی سے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ ان لمحوں میں وہ ریشمی احساسات میں لپٹا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کے خواب میں ارجمند موجود تھی۔ اگرچہ وہ ممتاز محل کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوا تھا تاہم یوں کبھی اتنی دل آویزی سے وہ اس کے خواب میں نہیں آئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ بارہ دریوں والے ایک حسین باغ میں موجود ہے جو بہشت منظر تھا۔ سرسبز و شاداب درخت، خوشنما رنگوں والے ان گنت پھول، خوش الحان پرندوں کی آوازیں، فواروں کی پھوار، دبیز ہوا، سبزے سے مزین زمین۔ وہ سنگ مرمر کی بارہ دری میں کھڑا ہے۔ دور تک ایک راستہ بنا ہوا ہے جس کے دو رویہ پر خوشنما پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ سنہری دھوپ میں ہر ایک رنگ نکھرا ہوا ہے۔ تبھی اچانک سامنے سے ممتاز محل کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ اسے یوں سامنے پا کر شاہ جہاں حیران رہ گیا۔ اس کا دل مسرتوں سے لبریز ہو گیا کہ اس کی ارجمند بانو واپس آ گئی ہے۔ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہی ہے وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھنے کی خاطر قدم اٹھانا چاہتا ہے کہ ممتاز محل دھیرے دھیرے قدموں سے اس کی جانب چل پڑتی ہے۔ وہ

نازنیں، وہ دل ربا، وہ مہہ جبیں، وہ جان جاں وہ اس کی جانب بڑھی تو ماحول ساکت ہو گیا، یوں جیسے نظام کائنات تھم گیا ہو۔ ہر شے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور صرف اگر موجود تھی تو قدم بڑھاتی ہوئی ارجمند بانو بیگم۔

وہی آنکھوں میں خمار، وہی ہونٹوں پہ دلنشیں مسکاں، مرصع تاج، ریشمی بال، سفید براق لباس جس پر موتیوں اور جواہرات سے مرصع کاری کی گئی تھی اور وہ دھوپ میں یوں چمک رہے تھے جیسے ستارے اس کے دامن میں آگرے ہوں۔ وہ سرخ قالین پر نازک اندام، خراماں خراماں چلتی چلی آرہی تھی۔ شاہ جہاں نے بے تابی سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ وہ اس پر نگاہیں رکھے چلتی چلی آرہی تھی۔ شاہ جہاں چند قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ بارہ دری کے سائے میں دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آن ٹھہرے، کتنی ہی دیر تک وہ ایک دوسرے کی نگاہوں میں نگاہ ڈالے کھڑے رہے۔ ممتاز محل کی آنکھوں میں محبت کی قندیل کے ساتھ جدائی کا دیا بھی روشن تھا جبکہ شاہ جہاں کی آنکھوں میں تڑپ کی بجلیاں کوندرہی تھی۔ کتنا ہی وقت یونہی گذر گیا۔ پھر جب شاہ جہاں نے بے تابی عشق کے ساتھ اسے تھامنا چاہا وہ پیچھے ہٹ گئی۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھا تو ممتاز پلٹ گئی اور پھر تیز قدموں سے چل دی۔ چند قدم پلٹنے کے بعد وہ لمحوں میں تحلیل ہو گئی یوں جیسے دھواں فضا میں گم ہو جاتا ہے۔ شاہ جہاں کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ارجمند۔!

وہ خود ہی اپنی آواز سے بیدار ہو گیا تھا۔ وہ کتنی دیر تک اسی آواز کے سحر میں جکڑا رہا۔ وہ اس سے نکلنا ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ ایک خواب دیکھ رہا تھا تو بے چین ہو گیا۔ یوں اچانک، اتنے عرصے بعد وہ اس کے خواب میں کیسے آگئی شاہ جہاں اس خیال میں ڈوب گیا۔ وہاں ارجمند بانو کے حسن نوخیز نے اسے ان یادوں کی اس وادی میں لے جا پھینکا، جب پہلی بار وہ اس سے ملا تھا۔ اسے شاہی مینا بازار کی رات اور اس کا ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا۔ خواب میں آنے والی ارجمند کا حسن ویسا ہی تھا جیسا اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

ارجمند۔! جو آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے ایستادہ اس کی محبت کی نشانی تاج محل میں ابدی نیند سو رہی تھی۔ اچانک شاہ جہاں کا دل مچل اٹھا۔ ایسے لگا جیسے وہ خواب میں اسے اپنے پاس بلانے آئی ہے۔ شاید ارجمند اس کی دوری برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آگرہ جائے گا۔ صبح ہوتے ہی اس نے میر منزل کو حکم دیا کہ آگرہ کی طرف روانگی کے لیے تیاری کی جائے۔

''جہاں پناہ۔! یوں اچانک......'' ایک وزیر نے انتہائی ادب سے پوچھا

''ہاں، ہمیں وہاں جانا ہے۔''

''عالم پناہ۔! آپ کے حکم سے قلعہ کے اندر سنگ مرمر سے تعمیر ہونے والی جامع مسجد بھی تیار ہو چکی ہے، وہ بھی ملاحظہ کیجئے گا۔''

''ہاں۔! ہمیں اسے دیکھنے کی بھی بے تابی ہے۔'' شاہ جہاں نے کہا اور پھر سے خیالوں میں کھو گیا۔ وہ جلد از جلد آگرہ پہنچ جانا چاہتا تھا۔

۱۶ محرم ۱۰۶۴ھ، (۷ دسمبر ۱۶۵۳ء) کو شاہ جہاں آگرہ پہنچ گیا۔ وہ صبح کا وقت تھا۔ آرام کرنے کے بعد عصر کے وقت وہ جامع مسجد دیکھنے چلا گیا اور مغرب تک وہیں رہا۔ اسی شام حکم دے دیا کہ وہ صبح مرقد ارجمند، روضہ ممتاز محل دیکھنے ممتاز آباد جائے گا۔

اس صبح دھوپ چمک رہی تھی۔ سردیوں کی خنک ہوا دھیرے دھیرے پچھّم سے چل رہی تھی جب شاہی سواری دریائے جمنا پار کر کے ممتاز آباد پہنچی۔ روضۂ ممتاز محل کا متولی آگاہ خاں اور دیگر عمائدین سلطنت استقبال کے لیے موجود تھے۔ شاہ جہاں نے ان سب کو وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا اور تنہا آگے بڑھا۔ اس کی نگاہیں روضہ ممتاز محل کے گنبد پر تھیں جو چمکتی ہوئی دھوپ میں چمک رہا تھا۔

مقبرہ کی تعمیر کے دس سال بعد بھی ہنوز کام جاری تھا۔ اصل روضہ کے طول عرض اور ارتفاع کی مناسبت سے استاد احمد نے مغربی سمت مسجد اور مشرقی سمت میں مہمان خانہ تعمیر کیا تھا جس سے حسن میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ تاج محل کے چاروں کونوں پر ایستادہ میناریوں تو تنہا دکھائی دے رہے تھے لیکن یہ چاروں میناریوں چوکھٹا بنا رہے تھے کہ جن میں مقبرہ محفوظ دکھائی دے رہا تھا۔ شاہ جہاں نے تعمیراتی حسن کی مناسبت سے دیکھا تو اسے لگا کہ یہ چاروں مینار اس قدر وزنی عمارت کو بے ہنگم اور غیر متوازن ہونے سے بچائے ہوئے ہیں صدر دروازے سے داخل ہوتے ہوئے اسے یہ چاروں مینار دکھائی نہیں دیئے تھے، تب اسے مقبرہ نامکمل سا دکھائی دیا تھا۔ تبھی اسکے دل میں ہوک سی اٹھی تھی کہ یہ کیا۔؟ لیکن اگلے ہی لمحے جب وہ مینار دکھائی دیئے تو اس کے مکمل ہونے کا احساس ہو گیا، اس کا دل سرشار ہو گیا۔ تبھی اسے معمار تاج محل کی ہنر مندی کمال پر دکھائی دی۔ وہ رک گیا اور استاد احمد کو طلب کیا۔ چند لمحوں بعد وہ وہاں پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ خدمت پرست خاں رضا بہادر بھی تھا۔ اس نے قریب آ کر تعظیم دی اور خاموش کھڑا ہو گیا۔

''استاد احمد۔! تم نے یہ مینار خوب بنائے۔''

''عالم پناہ۔! بہت شکریہ۔ میں نے اس عمارت کی جہاں مضبوطی کا خیال رکھا، وہاں اس کو نسوانی پیکر دینے کے ساتھ ساتھ حسن کا بھی انتہائی درجے کا خیال رکھا ہے۔آپ ملاحظہ فرمائیں۔''

شاہ جہاں اس وقت صدر دروازے کے پاس کھڑا تھا۔اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا صدر دروازے اور مقبرہ کے درمیان نہر ہے جس کے کناروں پر سرو کے پودے کھڑے ہیں۔اس باغ کو حسن سادہ دیا گیا تھا تا کہ دیکھنے والے کی نگاہ روضے پر ٹکی رہے۔تب اسے احساس ہوا کہ تاج محل کے باغبان رام لعل نے مقبرہ کو یوں مرکزی حیثیت دی تھی کہ مختلف رخوں کو سادہ رہنے دیا گیا تا کہ دیکھنے والے کی نگاہ نہ بھٹکے اور مجموعی تاثر مجروح نہ ہو۔باغبان نے پودوں اور درختوں کو اس ترتیب سے لگایا کہ مقبرہ کے قریب پھول ہی پھول تھے۔کیاریوں، روشوں اور دوب کی چوڑی پٹیوں کو مختلف رنگوں کے پھولوں سے آراستہ کر کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کی گئی تھی۔نہر کنارے ایستادہ سرو یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے غلام مودب کھڑے ہیں اور پھول یوں جیسے ممتاز محل کی آمد پر فرش راہ ہوں۔باغ کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ان میں شمال سے جنوب کی طرف راہیں بنائیں گئیں تھیں اور اسی طرح مغرب سے مشرق کی جانب گذرگاہیں۔ان کے اتصال پر کنول کے پھول جیسے فوارے نصب کئے گئے تھے۔یہ سبھی راستے نہر پر آکر ختم ہوتے تھے۔یہ فوارے پانی کی پھوار برساتے ہوئے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے موتی نچھاور کر رہے ہوں۔اطراف میں اگرچہ درختوں کی بہتات تھی لیکن ان میں بھی ترتیب کا خیال رکھا گیا تھا۔میوہ دار اور غیر میوہ دار درختوں میں امتیاز کے ساتھ ترتیب دی گئی تھی۔آم، کنو، لیموں، امردو، اناس، انار، سیب کے علاوہ نیم، پیپل، شیشم، برگد وغیرہ کے درخت لگائے گئے تھے۔ان پودوں اور درختوں کو سیراب کرنے کے لیے زیر زمین نالیاں، ذخیرہ آب کے لیے ٹینکی اور چھوٹی چھوٹی نالیاں بنائیں گئیں تھیں یہ سب ان گذرگاہوں کے نیچے سے تھیں۔فواروں کو پانی ایک جیسا ملتا تھا۔اس لیے ان کا فوارا ایک جتنا تھا۔ان فواروں کا پانی پھیل نہیں رہا تھا بلکہ سیدھا بہہ کر نہر میں جا رہا تھا۔فواروں، پودوں، درختوں اور نہر کے لیے پانی دریائے جمنا سے آتا تھا جسے ذخیرہ کر کے آگے بھیجا جاتا تھا۔ یہ بھی ہندسی آرٹ کا شاہکار تھا۔

شاہ جہاں نے سنگ مرمر کے احاطے کے پاس جا کر جوتے اتارے تو اس کی تقلید میں استاد احمد اور رضا خاں نے بھی جوتے اتار دیئے۔وہ وہاں سے ننگے پاؤں مسجد کی طرف روانہ ہوا۔تاج محل کے مغربی سمت میں بنائی مسجد میں شاہ

جہاں داخل ہوا۔اس نے غور سے اسے دیکھا وہ بھی مغلیہ فن تعمیر کا عکس لیے ہوئے تھی۔

''استاد احمد۔! بہت خوب۔''

مسجد کا چبوترہ ۱۸۹×۱۵ ۳/۴ مربع فٹ، چبوترے سے منبر تک کا فاصلہ ۸۹ فٹ، طول ۱۸۶ افٹ، منبر کا حجم ۵ ۱/۴×۴ ۱/۴×۳ ۲/۳ مکعب فٹ ہے۔محراب میں سورہ الشّمس کندہ ہے۔محراب کے عین وسط میں سنگ مرمر لگایا گیا ہے جس میں تاج محل کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ یہ پتھر انتہائی چمک دار تھا۔اس مسجد میں ۵۳۹ مصلے ہیں، مسجد میں سورہ اخلاص کا طغرا اس قدر عمدگی سے بنایا گیا ہے لفظ''اللہ'' درمیان میں ہے اور انتہائی پرکشش دکھائی دیتا ہے۔

مسجد کے ملاحظے کے بعد شاہ جہاں مقبرہ کی جانب آ گیا۔استاد احمد اور رضا بہادر سنگ مرمر کے احاطے کے پاس رک گئے۔مزار پر عورتوں اور خواجہ سراؤں کا پہرہ تھا، چلمن گری ہوئی تھی۔وہاں پر مردوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔اس کی نگاہ مغربی دروازے کے اوپر سورہ یاسین پر پڑی جسے خط ثلث میں لکھا گیا تھا اور اسے سنگ موسیٰ میں تراشوا کر سنگ مرمر میں نصب کیا گیا تھا۔شاہ جہاں اسے پڑھتا گیا اور یہاں تک کہ وہ مشرقی دروازے پر آ کر ختم ہو گئی۔صدر دروازے کے پیش طاق پر سورہ التکویر، مغربی دروازے کے پیش طاق پر سورہ انفطار، شمالی دروازے کے پیش طاق پر سورہ الانشقاق اور جنوبی دروازے کے پیش طاق پر سورہ البینہ کی آیات تحریر تھیں۔

شاہ جہاں عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔اس کی پہلی نگاہ ارجمند کے مرقد پر پڑی۔مزار والے کمرے میں اوپر کی طرف دو حلقے ہیں جن میں سورہ الملک تحریر ہے جو مشرق سے ہوتی ہوئی نچلے حصے میں آ کر ختم ہو جاتی ہے اور یہیں سے سورہ فتح شروع ہو کر چوتھے دروازے پر ختم ہو جاتی ہے۔اس کے بعد سورہ الدھر صدر دروازے پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔سورہ زمر کی دو آیتوں کے بعد امانت خاں شیرازی نے اپنا نام لکھا تھا۔مزار ارجمند کی لوح سنگ مرمر کی ہے اس پر سنگ موسیٰ سے خط نسخ میں حم سجدہ کی آیت نمبر ۳۰، سورہ مومن کی دو آیتیں سورہ بقرہ کی آخری آیت درج ہیں۔

''مرقد منور ارجمند بانو بیگم مخاطب بہ ممتاز محل فی ۱۰۴۰ھ، ۱۶۳۰ء

شاہ جہاں انہیں دیکھتا رہا اور پھر اس کی توجہ اس تزئین کاری کی طرف ہوئی جس کا کام بنیادیں رکھنے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔تزئین میں سب سے اہم کام نازک پھول پتیوں اور خوبصورت پودوں کی پچیکاری اور منبت کاری کا تھا۔ یہ کام سنگ سرخ سے بھی ہوا تھا۔تاج محل میں جو بیل بوٹے اور پھول پتے دکھائی دیتے تھے وہ جہانگیر نامہ کے ایک مخطوطے میں

نظر آئے تھے ہوسکتا ہے یہ نمونہ وہیں سے لیا گیا ہو۔ جنت ارضی کے خیال سے مقبرہ کو پھول بوٹوں سے سجایا گیا۔ یہ پھول اور پتیاں یوں سنگ مرمر پر ابھاریں گئی ہیں کہ ان کا جھکاؤ مزار کی طرف ہے جیسے وہ سب مزار ارجمند پر نچھاور ہونے کے لیے بے تاب ہوں۔

سنگ مرمر میں کہیں بھی جوڑ اور ان میں کہیں بے ربطگی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مقبرے کے اندر ایرانی قالینوں کو بچھایا گیا تھا۔ خوبصورت طلائی قندیل دان، جھاڑ اور فانوس سے منور اور آراستہ کیا گیا تھا۔ مزار پر موتیوں سے بنی ہوئی وہ چادر پڑی تھی جسے شاہ جہاں نے خود بنوایا تھا۔

شاہ جہاں مزار کے اردگرد نصب جالی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہاں پر سونے کا کٹہرہ تھا جو شاہ جہاں کے حکم سے بے بدل خاں داروغہ زرگر شاہی نے اپنی نگرانی میں چھ لاکھ روپے کا تیار کیا تھا۔ ۴۰ ہزار تولے سے تیار کردہ یہ کٹہرہ قیمتی جواہرات اور پتھروں سے مزین تھا۔ لیکن اسے ۱۰۵۲ھ میں ہٹا دیا گیا اور وہاں پر سنگ مرمر کی جالی لگا دی گئی تھی جو اپنی صفت میں یکتا تھی۔ یہ جالی بھی مثمنی ہے جس کا ضلع ۱۲ فٹ ۲ انچ ہے۔ ہر ضلع میں تین جالیاں، ہر ایک کا طول اور عرض ۱۲/۵ ۴ اور ۳/ ۳۱ فٹ ہے۔ سرہانے کی طرف سے جالی بند ہے پائینتی کی طرف کھلی ہے۔ اس کھلے ہوئے حصے میں یشب کا دروازہ تھا جس کی قیمت دس ہزار روپے تھی۔ سنگ مرمر کی یہ جالی غیر معمولی ہے پھول پتیوں اور صراحی کو بڑی نزاکت سے ابھارا گیا ہے، یہ گل بوٹے جالی کے وار پار ہیں جو نہایت صبر آزما اور دیدہ ریزی کا کام تھا۔

شاہ جہاں جالی کے اندر جا کر مرقد ارجمند کے دائیں طرف بیٹھ گیا۔ اس نے اشارہ کیا اور تخلیہ ہو گیا۔ وہ دوپہر تک وہیں بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں یوں جیسے عالم تصور میں اپنی ممتاز محل سے محو گفتگو ہو۔ جب وہاں سے واپس آنے لگا تو اس کی نگاہ مرقد ارجمند کے پہلو میں پڑی جو خالی تھا۔ اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور وہاں سے پلٹ آیا۔

......☆......

مغل حکمران سال میں دو بار جشن تلادان منایا کرتے تھے۔ ایک بار عیسوی سال کی سالگرہ پر اور دوسری بار قمری سال کے حساب سے آنے والی سالگرہ پر۔ جشن تلادان میں شہنشاہ کو سونے، چاندی اور دوسری اشیاء کے ساتھ تولا جاتا تھا۔ جن اشیاء سے شہنشاہ کو تولا جاتا وہ یا ان کی قیمت مسکینوں محتاجوں اور غرباء میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ یہ ایک ہندوانہ رسم تھی جسے شہنشاہ ہمایوں نے تقریباً ایک سو سال پہلے شروع کی تھی۔ اس کے بعد آنے والے مغل حکمران اس رسم کو نبھاتے رہے۔

وہ شہنشاہ شاہ جہاں کی قمری سالگرہ تھی۔اس جشن تلادان کو شاہانہ انداز میں منایا جارہا تھا۔ یہ شاہ جہاں کی ۶۵ ویں سالگرہ تھی۔قمری تلادان کا جشن حرم سرا میں منایا جاتا تھا جبکہ شمسی تلاوان عام عوام میں۔قمری سالگرہ ہونے کے سبب ترازو محل کے حرم سرا میں لگا ہوا تھا۔محل کی بیگمات، کنیزیں اور نوکرانیاں ایک ہجوم کی صورت میں وہاں موجود تھیں۔ترازو طلائی تھا اور شاہ جہاں اس پر بیٹھ چکا تھا۔دوسری طرف طلائی اشرفیاں اور چاندی کے روپے رکھے جارہے تھے۔اشرفیوں اور روپے کے تھیلے لائے جاچکے تھے اور ان میں سے ترازو کے پلڑے پر منتقل ہورہے تھے۔سب کی نگاہیں ترازو پر تھیں۔ یہاں تک کہ شاہ جہاں کی طرف والا پلڑا جو جھکا ہوا تھا اوپر کو اٹھ گیا۔وہاں پر بیگمات نے شور مچادیا اور تالیاں بجنے لگیں۔جس سے حرم سرا گونج اٹھا۔شاہ جہاں ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ترازو کے پلڑے پر سے اتر آیا اور اس مسند کی طرف بڑھا جو اس کے لیے مخصوص تھی۔اس کے ساتھ ہی ایک طلائی کرسی بھی دھری ہوئی تھی۔شہنشاہ مسند پر بیٹھا چکا تو مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہوگئیں اور سکون چھا گیا۔تبھی شاہ جہاں نے کہا۔

”میں اس مبارک موقع پر ایک اہم اعلان کرنا چاہوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے داراشکوہ کی طرف دیکھا اور اسے قریب آنے کے لیے اشارہ کیا۔دارا آگے بڑھا اور ذرا فاصلے پر آ کر رک گیا۔پھر تعظیم دے کر کھڑا ہوگیا۔شہنشاہ نے کنیز کو اشارہ دیا۔وہ تھال لے کر بڑھی۔کپڑا ہٹایا گیا اس میں خلعت خاصہ دھری ہوئی تھی جس پر زرنگار اطلس کے ہیروں کا مرصع نادری، مرصع سر بند اور اس کے علاوہ تین لاکھ روپے، ان سب کی مالیت تقریباً سات لاکھ سے زیادہ تھی۔اس سے پہلے شمسی جشن تلادان پر ایک لاکھ روپے کے جواہرات اور چالیس ہزار نچھاور کے لیے روپے۔دارا پر شاہ جہاں کی عنایات اور نوازشات پہلی دفعہ نہیں تھیں۔وہ اپنے اس بیٹے کو بہت چاہتا تھا، اس سے بہت پیار کرتا تھا، بہت محبت تھی اس کے ساتھ۔شاہ جہاں نے پیار بھری نگاہوں سے دارا کی جانب دیکھا اور وہ اشیاء اسے عنایت کردیں اس کے ساتھ ہی کہا ”میں اس موقع پر شہزادہ داراشکوہ کو اپنا ولی عہد مقرر کرتا ہوں۔“ ابھی اس کی بات پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ مبارک سلامت کا شور پھر سے اٹھ گیا۔کافی دیر تک یوں رہا اور پھر خاموشی چھا گئی تب اس نے کہا ”اس کے ساتھ میں شہزادے کے لیے بلند اقبال کا خطاب بھی عطا کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر شاہ جہاں نے شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ پڑی طلائی کرسی پر بٹھا دیا۔کسی بھی شہزادے کے لیے یہ سب سے بڑا اعزاز ہوتا تھا کہ وہ بادشاہ کے برابر بیٹھ سکے۔شہزادہ داراشکوہ کو یہ اعزاز حاصل ہوگیا تھا۔ایک بار پھر مبارک سلامت کا شور اٹھ گیا۔اس شور میں کئی طرح کے جذبات بھی پوشیدہ تھے۔اس وقت سے ہی یہ خبر دہلی کی فضاؤں سے نکل

پڑی اور سلطنت ہندوستان میں پھیلنے کے لیے چل پڑی۔ یہ خبر جہاں بھی گئی۔ اپنے اندر تبدیلی کے اثرات کے باعث موضوعِ گفتگو بنتی چلی گئیں۔

......☆......

''آپ کا پوتا اور شہزادہ اورنگ زیب کا بیٹا سلمان محمد اکبر کی ولادت مبارک ہو عالم پناہ۔'' رضا خان بہادر نے خوشی سے لبریز لہجے میں کہا تو شاہ جہاں کے چہرے پر مسرت کی بجائے پریشانی چھا گئی۔ پھر چند لمحوں بعد کہا

''رضا۔! تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ان بچوں میں کس قدر محبت رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اب نہیں لگتا کہ ممتاز محل کا خواب پورا ہوگا۔''

''عالم پناہ۔! آپ کی علالت کے باعث ماحول اور فضا خاصی مکدر ہو چکی ہے۔ یہ چند دن جو آپ نے جھروکہ سے درشن نہیں دیا، اس سے سلطنت میں بہت ساری ایسی خبریں اور افواہیں گردش کرنے لگی ہیں۔ جن میں محل کے لوگوں کی سرگوشیاں پوری طرح ہمک رہی ہیں۔ وہ صبح جب آپ دن چڑھے تک سوتے رہے تھے۔ جھروکہ درشن تلے ہزاروں لوگ یہی گمان کر رہے ہیں تھے کہ خدانخواستہ............''

''مجھے احساس ہے۔''

''لیکن عالم پناہ۔! ولی عہد سلطنت سے کچھ ایسے معاملات سرزد ہو رہے ہیں، جس سے ملکی نظم و نسق ابتر ہو جانے کا پوری طرح امکان ہے۔''

''وہ کیا معاملات ہیں۔''

''آپ نے ولی عہد سلطنت کو جو نصیحتیں کی ہیں، انہوں نے اس کا مطلق احساس نہیں کیا، آپ چاہتے ہیں کہ ان چاروں بھائیوں کے درمیان معاونت رہے لیکن شہزادہ دارا شکوہ نے ڈاک کی ترسیل بند کر کے دوسرے شہزادوں کے وکیلوں کو قید کر دیا ہے۔ یہ سراسر ان شہزادوں پر عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ ایسے میں ان کے غضب کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ایسے میں وہ لوگ جو مغلیہ سلطنت کی شان شوکت نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس موقع سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔''

''ایسے کیسے ممکن ہو گیا، میں ابھی زندہ ہوں۔''

''مگر عالم پناہ۔! دارا شکوہ نے آپ تک پہنچنے کے سارے راستے بند کر کے، خود کاروبار سلطنت سنبھال کر یہ تاثر

دے دیا ہے کہ خدانخواستہ آپ اس جہاں میں نہیں۔''

''کیا دارا ایسا کرسکتا ہے؟''

''ایسا ہو چکا ہے عالم پناہ، انہیں اس کے اردگرد مشیروں نے مشورہ دیا کہ وہ امور سلطنت سنبھال لیں۔ اس کا نتیجہ بہت غلط سامنے آ رہا ہے۔''

''مثلاً۔؟''

''شہزادہ مراد نے سرکارشاہی کے دیوان میر علی نقی کو قتل کر کے گجرات میں اپنے نام کا سکہ رائج کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا خطبہ بھی پڑھا جا رہا ہے۔ ادھر بنگال میں شہزادہ شجاع نے بغاوت کر کے بادشاہی خالصے پر قابض ہو کر جنگ کے لیے تیار ہو چکا ہے۔''

''ان کی یہ جرات۔! میرے ہوتے ہوئے ولی عہد سلطنت سے جنگ پر آمادہ ہیں۔'' اور ولی عہد............؟

''عالم پناہ۔! یہ وقت جنگ کا نہیں، بہت صبر و استقلال کا ہے۔''

''اور اس کے لیے مجھے فوراً آگرہ کے لیے کوچ کرنا ہوگا، میر منزل سے کہو ہمارے کوچ کی تیاری کرے۔''

اگلے ہی دن کوچ ہوا۔ شاہ جہاں دہلی سے آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔

شہنشاہ شاہ جہاں نے آگرہ میں آ کر چاہا کہ حالات کو سنبھال لے مگر دارا شکوہ امن کو اس طرح ہاتھ سے نکال بیٹھا جیسے بند مٹھی سے ریت۔ سلطان سلیمان شکوہ کو شہزادہ شاہ شجاع کے مقابلے پر روانہ کر دیا۔ راجا جے سنگھ کو اس کا اتالیق مقرر کیا۔ اس کے علاوہ بہادر خاں، راجہ انرودھ سنگھ اعتماد خاں جیسے سالاروں کو مامور کیا۔ شجاع بنارس میں خیمہ زن تھا۔ اچانک حملے سے وہ تاب نہ لا سکا اور شکست کھا کر پٹنہ کی طرف فرار ہو گیا۔ اس فتح نے دارا شکوہ کے حوصلے بلند کر دیئے۔ دارا سے ایک غلط فیصلہ یہ ہوا کہ اس نے شاہ جہاں کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ شہزادہ مراد سرکش ہو چکا ہے، اس کی گوشمالی کی جائے، صوبہ گجرات کی صوبیداری سے معزول کر کے علاقہ برار کی جاگیر پر چلا جائے تو بہتر ہے۔ اورنگ زیب بھی خفیہ طور پر شجاع کی شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اور مزاج پرسی کے بہانے اپنی ذاتی فوج کے ساتھ دارالخلافہ آ کر قابض ہو جانا چاہتا ہے۔ وہ بھی سرکش ہے لہٰذا اسے بیجاپور سے واپس بلا لیا جائے یا پھر لشکر شاہی کو واپس آنے کا حکم دیا جائے۔

بڑھاپا، بیماری اور بیٹوں کے درمیان چھڑنے والی جنگ کا خطرہ۔! اس سب نے مل کر شاہ جہاں کو بے حال کر دیا۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے اطلاعات ہی ایسی موصول ہو رہی تھیں کہ کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے وہ ڈگمگا جاتا تھا۔ ایسے میں داراشکوہ کا اصرار اسے فرمان جاری کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ پھر حالات شاہ جہاں کے ہاتھ سے بھی نکل گئے۔ وقت اجنبی ہو گیا۔ یہاں تک کہ داراشکوہ اور اورنگ زیب تخت یا تختہ کے فیصلے کے لیے دریائے چنبل کے کنارے سموگڈھ میں اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ آن موجود ہوئے۔

وہ اندھیری رات تھی۔ چاند کہیں رات کے آخری پہر نکلنا تھا۔لیکن ممتاز آباد کی گلیوں میں سرگوشیاں پہلے پہر ہی سے گردش کر رہی تھیں۔ داراشکوہ اور شہزادہ اورنگ زیب سموگڈھ میں آمنے سامنے تھے۔ رعایا بھی اسی تناسب سے تقسیم ہو چکی تھی۔کوئی اورنگ زیب کے حامی تھے اور کوئی داراشکوہ کے چاہنے والے تھے۔اس اندھیری رات میں ممتاز آباد کی گلیوں میں چند لوگ مندر کی طرف رواں دواں تھے۔ان میں رام داس بھی تھا جو اپنے بیمار اور لاغر جسم کے ساتھ تقریباً گھسٹتا ہوا جا رہا تھا۔وہ بڑی مشکل سے مندر کے اس کمرے تک پہنچا جہاں پنڈت کے ساتھ چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔وہ بھی ان میں جا کر بیٹھ گیا۔

”بھائیوں۔! ہم لوگ یہاں پر اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ شہزادہ داراشکوہ کے لیے پوجا کی جائے۔تا کہ دیوی دیوتا اس کی رکھشا کے لیے اپنی خاص طاقتیں اس کے ساتھ کر دیں۔“

”پنڈت جی۔! وہ تو مسلمان ہے،اس کے لیے پوجا کیوں؟“

”یہ ٹھیک ہے کہ وہ مسلمان ہے لیکن وہ دل سے ایسا نہیں ہے۔ ہندو دھرم کے لیے اس کا وجود اور اس کی حکمرانی دیوتاؤں کا پرشاد ہے۔ہمیں اس کی رکھشا کے لیے پوجا کرنا ہوگی۔ بنارس سے وارانا سی تک اس کے لیے ایسا ہی پوجا کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔“

”وہ کیوں پنڈت جی۔!“

”میں تم لوگوں کو ٹھیک سے سمجھا تا ہوں۔مغل شہزادوں میں صرف ایک داراشکوہ ہی ایسا شہزادہ ہے جو مذہب سے

انتہائی لگاؤ رکھتا ہے۔ وہ تصوف و روحانیت کا قائل ہے۔ جو مسلمانوں میں بڑی عزت و قدر سے دیکھا جاتا ہے۔ دارا شکوہ لاہور میں مقیم ایک بزرگ حضرت میاں میرؒ کا انتہائی معتقد ہے۔ اب وہ حضرت اس دنیا سے پردہ فرما گئے ہیں۔ ان کا وصال ۱۰۴۵ھ بمطابق ۱۶۳۵ء میں ہوا ہے۔ اس کے ٹھیک چار سال بعد دارا شکوہ کی قلمی کاوش ''سکینۃ الاولیاء'' منصۂ شہود پر آئی۔ اس میں قرآن حکیم، احادیث اور مختلف تفاسیر سے استفادہ کر کے، مریدین میرؒ سے مشورہ کر کے، بزرگان دین مسلم کے اقوال جمع کر کے ایک کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ لیکن یہ صورت حال ہم ہندوؤں کے لیے خطرناک تھی۔ ایک پختہ کار مسلمان، مغل شہزادہ اگر تخت پر آتا ہے تو ہندو دھرم اس کے اپنے وطن میں ہی خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ ہمارے بڑوں نے اس آنے والے خطرے کو محسوس کیا اور پنڈتوں، پروہتوں جگت گسائیوں اور سنیاسیوں کی مدد سے دارا شکوہ کے خیالات بدلنے کی کوشش کی۔ بنارس کے ہندو یوگی اور ہندو دانشور اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ میرا یہاں آنا بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ دارا شکوہ سے تبادلہ خیالات ہوا تو وہ ہندو دھرم کی خوبیوں سے متعارف ہوا۔ کشادہ دلی اور وسعت ظرف کے باعث ۱۰۶۵ھ میں اس نے ''مجمع البحرین'' لکھ دی۔ اس کا موضوع اپنے نام ہی سے ظاہر ہے کہ دو سمندروں کا ملاپ، اسلام اور ہندو دھرم ایک وحدت ہیں، دارا شکوہ نے اس کتاب میں یہی ثابت کیا ہے۔ بنارس سے واراناسی تک خوشیوں کے شادیانے بجائے گئے۔ جس طرح کے خیالات دارا شکوہ نے اس کتاب میں دیئے ہیں اس سے اکبر کا دین الٰہی کہیں کم حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت تو مجدد الف ثانی تھا جو اکبر کے مقابلے میں ڈٹ گیا لیکن اب پورے ہندوستان میں ایسا کوئی نہیں ہے۔ اب کچھ عرصہ پہلے اس کی ایک اور کتاب ''سر اکبر'' کے نام سے سامنے آئی ہے۔ یہ گویا مہر ہے کہ یہاں سے مسلم فکر ختم ہو سکتی ہے اگر دارا شکوہ تخت پر متمکن ہو گیا۔ اس کتاب میں اسلام اور ہندو دھرم کو ایک درخت کی دو شاخیں ثابت کیا گیا ہے۔ اس میں ''کتاب مکنون'' کو لوح محفوظ نہیں بلکہ ہندوؤں کے اپشند ثابت کیا گیا ہے۔ یعنی قرآن کوئی الہامی کتاب نہیں محض اپشندوں کا خلاصہ ہے۔ ایسے میں ہم دارا شکوہ کو کیوں نہ چاہیں جس کے خیالات ہی نہیں اعمال بھی ہندو نواز ہیں۔ اگر ایک ''جودھائی بائی'' اس کے لیے مخصوص کر دی جائے تو ہم مسجدوں میں بھی دیوتاؤں کی مورتیاں رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اگر مسلمانوں کی سوچ ختم ہو گئی تو یہ ان ملیچھوں سے پاک ہو سکتا ہے۔ اب انہیں ہمارے رنگ میں رنگنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ پورے ہندوستان میں دارا شکوہ کے لیے پوجا ہو رہی ہے۔ یہ مندر بھی اس کی عنایت سے بنا ہے تو کیوں نہ ہم اس کے لیے پوجا کریں تاکہ دیوتاؤں کی آشیرواد اس کے ساتھ ہو۔'' پنڈت نے انتہائی جذباتی انداز میں اپنی بات مکمل کی تو وہاں پر

موجود ہر شخص جذباتی ہو گیا۔

''کل صبح ہم اپنے اپنے اور ممتاز آباد کے ہر ہندو کو اس کے پریوار کے ساتھ یہاں لائیں گے اور پوجا کریں گے۔ ہمارا بادشاہ صرف دارا شکوہ ہی ہوگا۔'' موہن لعل کی آواز کے ساتھ سب نے ہاں میں ہاں ملائی اور اگلے دن کی پوجا کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

......☆......

اس اندھیری رات میں شاہ جہاں شاہی بجرے میں دریائے جمنا پار کر کے مقبرہ ارجمند کے پاس اترا۔ اس کے ساتھ چند محافظ اور رضا خاں بہادر تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے سنگ مرمر کے چبوترے کے پاس آن رکے۔ شاہی محافظ اور رضا بہادر وہیں رک گئے اور شاہ جہاں روضے کی طرف بڑھ گیا۔ خاتون پہرداروں نے شاہ جہاں کو دیکھ کر تعظیم دی اور اس کے لیے مقبرے کا صدر دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوا اور دھیرے دھیرے تہہ خانے میں اتر گیا جہاں ارجمند کی قبر تھی۔ اس کے دائیں طرف جا کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کے آنسو رواں تھے۔ کتنے ہی لمحے یونہی گذر گئے۔ پھر آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز میں بولا

''ارجمند۔! میں تم سے شرمندہ ہوں ...... میں تمہاری اس خواہش کو پورا نہیں کر پایا کہ تمہارے بچوں کے درمیان الفت اور یگانگت رہے۔ وہ آج ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہیں ...... تمہیں شاید معلوم نہیں کہ شاہ شجاع کے تعاقب میں سلیمان شکوہ لگا ہوا ہے۔ سموگڈھ میں اورنگ زیب کے ساتھ مراد بھی دارا شکوہ سے برسرِ پیکار ہونے کو ہے...... بوبو۔! ارجمند۔! میں کیا کروں ...... وہ میری بات نہیں مان رہے، میرے فرمان کو ہواؤں میں اڑا رہے ہیں...... میں دارا شکوہ کے بغیر نہیں رہ سکتا...... اگر اسے کچھ ہو گیا تو خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا......''

شاہ جہاں دیر تک سرہانے مرقد کے سرگوشیاں کرتا رہا۔

''مجھے نہیں یقین کہ فاتح ...... مفتوح کو زندہ سلامت چھوڑ دے گا...... حکمرانی میں رشتہ داری نہیں چلتی۔ ...... اور ...... اور ...... تخت ...... یا تختہ ...... کون فاتح ...... کس کو تخت ملے گا ...... اور کون مفتوح ...... تختہ ...... ختم ہو جائے گا ...... سب کچھ ختم ہو جائے گا......''

طلوعِ صبح کے آثار دکھائی دینے لگے اور شاہ جہاں وہاں سے اٹھ گیا۔

......☆......

دارا شکوہ شکست کھا گیا اور میدان جنگ سے فرر ہو کر لاہور کی طرف چل دیا تھا۔

شہزادہ اورنگ زیب جاہ و جلال کا پرچم لہراتے ہوئے آگرہ میں آن موجود ہوا۔ اور پھر ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب بہادر بادشاہ غازی کے لقب سے تخت پر متمکن ہوا۔

شہنشاہ شاہ جہاں کو قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں نواب قدسیہ جہاں آراء بیگم ان کے ساتھ تھی۔

''دارا کو بچا لو جہاں آراء۔! اورنگ زیب تمہاری سنتا ہے۔تم سے پیار کرتا ہے تمہیں یاد ہے جب تم جل گئی تھی تو وہ دکن کی مہمات چھوڑ کر تمہاری مزاج پرسی کو آن موجود ہوا تھا۔ وہ تمہاری عزت کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ دارا کو معاف کر دے گا۔سلطنت میں امن و استحکام ہو جائے۔ ہزاروں جانیں تلف ہونے سے بچ جائیں۔ وہ حکمرانی کرتا رہے لیکن میرے بیٹے کو بخش دے......تم کہو اسے...... جہاں آرا تم جاؤ اس کے پاس......وہ تمہاری سنے گا......تم اپنے بھائی دارا کی محبت کے لیے جاؤ......میں شاہ شجاع کو کھو چکا ہوں......نجانے مراد کا کیا حال ہوگا......''

''میں جاؤں گی عالم پناہ! بابا جان میں جاؤں گی۔''

''ہاں۔! جاتے ہوئے یہ عالمگیری تلوار لیتے جانا......اسے دیکھ کر وہ سمجھ جائے گا کہ میں نے اس کی حکمرانی کو تسلیم کر لیا ہے......بس وہ دارا کو بخش دے......''

''میں جاؤں گی''

جہاں آرا نے سوچنے والے انداز میں کہا اور پھر ایک پیام بر کے ذریعے اورنگ زیب کو فرمان بھیجا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔

......☆......

اس وقت وہ نماز ظہر سے فارغ ہوا تھا۔ وہ جائے نماز سے اٹھا تو خادم نے اطلاع دی۔

''حضرت نواب قدسیہ جہاں آراء بیگم باریابی کی اجازت چاہتی ہیں۔''

''انہیں انتہائی عزت و احترام سے لایا جائے۔'' اورنگ زیب نے دھیرے سے کہا

تھوڑی دیر بعد جہاں آراء چند کنیزوں کے جلو میں اس کے سامنے تھی۔

''خوش آمدید۔ ! میں اپنی بہن جہاں آرا کو خوش آمدید کہتا ہوں۔''

''مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کے دل میں میرے لیے ایسا ہی احترام موجود ہے۔''

''آیئے تشریف رکھیے۔'' اورنگ زیب نے مسند خاص کی طرف اشارہ کیا تو جہاں آراء دھیرے دھیرے قدموں سے آگے بڑھی اور اپنی کنیز خاص کو اشارہ کیا۔ وہ عالمگیری تلوار لے کر جہاں آراء تک گئی۔ جہاں آراء نے وہ تلوار پکڑی اور اورنگ زیب کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی

''حضرت شاہ جہاں عالم پناہ نے یہ تحفہ آپ کے حضور بھیجا ہے۔''

''مجھے یہ تحفہ پسند آیا اور میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' اس نے وہ تلوار تھامی اور ایک طرف رکھتے ہوئے انتہائی احترام سے کہا۔ اس پر جہاں آرا نے اپنی کنیزوں کو اشارہ کیا وہ وہاں سے چل دیں۔ مکمل تخلیہ ہونے تک وہ کھڑی رہی اور پھر مسند پر بیٹھ گئی۔ اورنگ زیب بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئی ہوں۔ یہ نہ صرف حضرت عالم پناہ کی شدید خواہش ہے بلکہ میری بھی تمنا ہے اور خاندان مغلیہ کی پاسداری بھی......''

''بولیں......''

''آپ دارا کو معاف کر دیں۔ اس کی جان بخش دیں۔'' جہاں آراء نے کہا تو اورنگ زیب کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گذر گیا۔ سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے جہاں آراء کی طرف دیکھا اور پھر شدتِ جذبات سے بولا

''آپ میری بڑی بہن ہیں، میرے لیے انتہائی احترام رکھتی ہیں اور میں بھی آپ کو دل و جان سے محترم رکھتا ہوں لیکن آپ کی یہ خواہش سراسر ناانصافی پر مبنی ہے۔ دارا کے جرم ہی اتنے طویل ہیں کہ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔''

''ایک طرح سے وہ ٹھیک تھا۔ وہ ولی عہد سلطنت تھا۔ اس سے لڑائی حضرت عالم پناہ کے ساتھ جنگ کے مترادف تھی۔ اس کے فرمانوں سے جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جائیں۔ اب حضرت عالم پناہ نے بھی آپ کی حکمرانی تسلیم کر لی ہے تو دارا کو بخش دیں۔''

''کیسے بخش دوں اسے۔ وہ شخص جو کبھی مرد میدان نہیں رہا۔ جس کی رفاقتیں اور محفلیں ہمیشہ فقیروں، پنڈتوں اور ہندو دانشوروں کے ساتھ رہیں، جو نہ اس قابل ہے کہ میدان جنگ میں لڑ سکے اور نہ اس طرح کی صلاحیت رکھتا ہے کہ حکمرانی

کر سکے۔ آپ گواہ ہو۔ پورا شاہ جہانی دور گواہ ہے کہ میں نے اس کے ساتھ نہ کبھی زیادتی کی اور نہ ہی اس کے فرمان کی خلاف ورزی کی۔ میں نے تمام عمر گھوڑے کی پیٹھ پر گذاری ہے۔ میں نے ہندوستان پر حکمرانی کا سوچا بھی نہیں تھا لیکن یہی دارا اپنے احمقانہ طرزِ عمل سے پوری سلطنت کو تباہ برباد کرنے پر تل گیا تھا۔ میرا ایسا کون سا عمل اس کے خلاف گیا تھا کہ اس نے بیجا پور کی مہم پر مجھے شاہی سرداروں کے سامنے ذلیل کیا۔ انہیں واپس بلا لیا گیا۔ مجھ پر عدم اعتماد کر کے، کیا میں نے کہیں بھی عدم اعتماد کیا تھا؟ اس نے فوری طور پر ڈاک کی ترسیل بند کر دی اور میرے وکیل کو نہ صرف قید کر لیا بلکہ اس کا مال ضبط کر لیا۔ کیا قصور تھا اس کا؟ مجھ پر عدم اعتماد، میں پھر سوال کروں گا ہمشیرہ محترم کہ مجھ سے ایسا کون سا عمل سرزد ہو گیا تھا؟''

''یہ اس کی سیاسی غلطی تھی، جس کی سزا وہ بھگت رہا ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ آخر وہ آپ کا بڑا بھائی ہے۔''

''کیا میں آپ کا بھائی نہیں تھا، آپ کی محبت میرے لیے تو کبھی ایسی نہیں رہی۔ حضرت عالم پناہ نے کبھی بھی مجھے اس محبت اور عنایت سے نہیں نوازا جو ان کے دل میں دارا کے لیے تھی، آپ کے اب تک کے مراسلات میں دارا کی فرمانبرداری پر مجھے مجبور کیا جاتا رہا ہے۔ کبھی میری طرف داری بھی ہوئی۔ مگر مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ یہ آپ لوگوں کی محبتوں کا معاملہ ہے۔ میں نے اب تک جو حضرت عالم پناہ سے مراسلت کی ہے۔ میں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ میں ان کا بیٹا ہوں، مجھے بھی شفقت سے نوازا جائے، مجھ پر اعتماد کیا جائے۔ میری اور ان کی مراسلت گواہ ہے کہ میں نے کبھی بھی ان کی نافرمانی نہیں کی؟ دارا پر نوازشات کی بارش ہوتی رہی۔ میں نے کبھی بھی اس پر انگلی اٹھائی یا اعتراض کیا لیکن اس سے میری ایک جاگیر برداشت نہیں ہو سکی۔ مگر مجھے اس پر بھی افسوس نہ ہوتا اگر وہ کسی مثبت مصلحت کے تحت ایسا کرتے لیکن اس نے اپنی منفی سوچ کے مطابق بھیانک غلطی کی۔ مجھے ذلیل ہی نہیں رسوا کرنے کی کوشش بھی ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ میرے مقابلے پر اتر آیا تو کیا اس نے مجھ سے چھوٹے بھائیوں والا سلوک کیا ہے؟ اس نے حکمرانی کرنے کے لیے مجھے کچلنا چاہا تو میں نے اس کا مقابلہ کیا۔''

''وہ ولی عہد سلطنت تھا، اسے حضرت عالم پناہ نے نامزد کیا تھا، آپ کو اس کا احترام اور اطاعت کرنی چاہیے تھی۔ اس کی بیعت کرنی چاہیے تھی۔''

''میں مانتا ہوں کہ وہ ولی عہد سلطنت تھا۔ لیکن سب سے پہلے احترام کا رشتہ خود اس نے توڑا۔ حضرت عالم پناہ کی

نصیحت کو اس نے پس پشت ڈالا۔ اور پھر میں اس شخص کی بیعت کر لوں جو خود ملحد ہو چکا تھا۔ اسلام میں ایسے شخص کی سزا فقط موت ہے۔ میں شاید ایسے شخص کی حکمرانی قبول لیتا لیکن اس نے اسلام دشمنی کا اظہار کر کے اپنی موت پر مہر ثبت کر دی ہے۔ ایک نیا اکبر برداشت نہیں۔ اس نے کفر اور اسلام کو ایک منبع ظاہر کیا ہے۔'' مجمع البحرین اور سر اکبر'' اس کے گمراہ کن خیالات کا آئینہ تھا۔ اس نے تصوف کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ تصوف وہ نہیں جو دارا کی خام خیالیوں میں موجود ہے۔ وہ توہین اسلام کا مرتکب ہو چکا ہے۔''

''تاریخ کیا کہے گی کہ بھائی نے بھائی کو قتل کر دیا۔''

''مجھے آئندہ تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے مجھ پر جو فرائض عائد ہوئے ہیں میں ان کی تکمیل کروں گا۔ اور میری راہ میں کوئی بھی حائل ہوا تو میں اسے معاف نہیں کروں گا چاہے وہ میرا بھائی بھی ہو۔ آئندہ تاریخ میں مجھے بھائی کا قاتل گردانا جائے گا تو کوئی بات نہیں، شاہ جہاں نے بھی تو خسرو، شہریار اور دانیال کے بیٹوں کو قتل کیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ مغلیہ حکمران ایسا کرتے رہے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ غیر مسلم کبھی بھی میرے حق میں نہیں رہیں گے۔ اور مجھے ان کی خوشنودی بھی نہیں چاہیے۔ آئندہ آنے والی تاریخ میں وہ میرے بارے میں جو بھی سوچتے رہیں، جو لکھتے رہیں مجھے ان سے کوئی غرض نہیں، میرا معاملہ میرے اللہ کے ساتھ ہے۔ مجھے تو اہل تشیع عقیدہ رکھنے والے مسلمان بھی معاف نہیں کریں گے کہ اب ہندوستان پر ایک سنی العقیدہ مسلمان حکمرانی کرے گا۔ میں کل آنے والے کسی تاریخ دان کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ لیکن آج غیر اسلامی افعال پر تلوار اٹھا سکتا ہوں۔''

''حضرت عالم پناہ کا دل دکھ رہا ہے۔ انہیں دارا سے محبت ہے۔ وہ نہیں چاہتے۔''

''میرا دل بھی نہیں چاہتا کہ میں حضرت عالم پناہ کا دل دکھاؤں۔ لیکن جہاں آراء آپ مجھے یہ بتائیں میں تو دارالخلافہ سے ہمیشہ دور رہا ہوں۔ میرے بارے میں عالم پناہ کے دل میں محبت کیوں نہیں ہے۔ چلو مان لیا ہے تو مجھ پر اعتماد کیوں نہیں کیا۔ چلو مان لیا اعتماد ہے تو پھر میرے لیے، میرے خلاف خفیہ مراسلت کیوں؟ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے حضرت کے دل میں میرے خلاف شکوک پیدا کئے آپ بھی ان میں ایک تھیں کیا میری مراسلت کو ملاحظہ نہیں کیا گیا کہ میں بھی اس فتنے کو فرو کرنا چاہتا تھا لیکن میری نیت پر ہمیشہ شک کیا جاتا رہا۔''

''پھر بھی یہ ساری غلطیاں، کوتاہیاں ایک طرف رکھ دیں اور دارا کی جان بخش دیں۔ میرے لیے بھائی، میرے

لیے۔!'' جہاں آرا نے انتہائی دکھ سے کہا تو اورنگ زیب چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا

''میری بہن۔! آپ ایک طرف مجھے لکھتی رہیں کہ میں دارا کی تابعداری کروں لیکن دوسری جانب دارا دریائے چنبل کے کنارے اپنی فوجوں کو جمع کرتا رہا۔ خیر۔! اب بھی اگر اس نے میرے خلاف کوئی اقدام نہ کیا اور اپنے ملحدانہ خیالات سے توبہ نہ کی تو اسے معاف نہیں کروں گا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے یا دارا پر۔ وہ اطاعت کرے اور ملحدانہ خیالات سے اعلانیہ توبہ کر کے اپنی دونوں کتابوں سے منحرف ہو جائے تو میں اس کے خلاف قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ ورنہ میں............''

''ٹھیک ہے، میں حضرت عالم پناہ کے گوش گذار کر دیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر جہاں آراء اٹھ گئی تو اورنگ زیب نے ایک خوبصورت سی جائے نماز اور ٹوپی اٹھائی۔

''یہ میری طرف سے، ایک بیٹے کی طرف سے تحفہ ہے۔''

جہاں آراء نے وہ تحفہ لے لیا اور واپسی کے لیے چل دی۔

......☆......

دارا شکوہ قید ہوا اور قتل کر دیا گیا۔

شاہ شجاع اور مراد بخش بھی انجام کو پہنچے۔

وہ ۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ (۳۱ جنوری ۱۶۶۶ء) اتوار کی شام تھی۔ شاہ جہاں اپنی خواب گاہ کے اس جھروکے میں بیٹھا ہوا تھا جہاں سے تاج محل دکھائی دیتا تھا۔ اس کی نگاہ اسی طرف تھی۔ اس کے قریب جہاں آراء بیگم بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ نہایت دل گرفتہ تھی۔ شام ڈھل رہی تھی۔ شاہ جہاں کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے بے نیاز تھا۔ اس کی نگاہ تاج محل پر تھی جو ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں گلابی ہو رہا تھا۔ تبھی وہ لب کشا ہوا

''جہاں آراء۔! میں نے اپنے تجہیز و تکفین کا سامان کر دیا ہے۔ نجانے کب بلاوا آ جائے۔ آپ ایسے کرنا اپنی سوتیلی بہن پر ہنر بانو کا خیال رکھنا۔ اس کی دلجوئی کرنا۔''

پر ہنر بانو شہزادی گل بدن کی بیٹی تھی اور شاہ جہاں اسے بہت چاہتا تھا۔ وہ دیر تک جہاں آراء سے باتیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ڈھل گئی۔

تین گھڑی رات گذری تھی۔ شاہ جہاں کی نگاہیں مرقد ارجمند تاج محل پر لگی ہوئیں تھیں اور وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا

کہ اجل آ گئی۔شاہ جہاں اس جہاں سے کوچ کر گیا۔

اگلے دن کا پچھلا پہر تھا کہ شاہ برج سے شاہ جہاں کا جنازہ اٹھایا گیا۔ پورے شاہانہ جلال کے ساتھ اس کا جنازہ روضہ ممتاز محل لے جایا گیا۔ وہیں نماز جنازہ ادا کی گئی اور ممتاز محل کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

شاہی مینا بازار سے شروع ہونے والا محبت کا یہ سفر تاج محل میں پہلو بہ پہلو دفن ہو کر ختم ہو گیا۔

زندگی بہر دیدن یار است
یار چوں نیست زندگی عار است

کتابیات

❖ منتخب اللباب
خافی خان

- آثرالاثرالامراء

صمصام الدولہ شاھنواز خاں

- شاہ جہاں نامہ

عمل صالح

- تاج محل

عبداللہ چغتائی

- اللہ لوگ

اختر حسین شیخ